اردو شاعری کے بدلتے رجحانات
آزادی کے بعد

مرتبین

پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے

ڈاکٹر شیخ اصغر اکبر

اردو شاعری کے بدلتے رجحانات
آزادی کے بعد

مرتبین

پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے

☆

ڈاکٹر شیخ اصغر اکبر

پبلیکیشنز

شعبہ اردو، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، چھترپتی سمبھاجی نگر، مہاراشٹر

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ!

Changing trends in Urdu Poetry After Independence

Edited By

Professor. Kitimalini Vithalrao Jawale

Dr. Shaikh Asgar Akbar

Year Of First Edition 2025

ISBN: 978-93-344-4743-9

Price: Rs.500

کتاب کا نام: اردو شاعری کے بدلتے رجحانات آزادی کے بعد

مرتبین: پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے ‘ ڈاکٹر شیخ اصغر اکبر

طبع اول: 2025

صفحات: 201

قیمت: 500

تعداد: 200

کمپوزنگ: ڈاکٹر سید سہیل احمد ہاشمی

مطبع: ڈاکٹر شیخ اصغر اکبر

ناشر: پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے

شعبہ اردو‘ ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھوڑہ یونیورسٹی‘

چھترپتی سمبھاجی نگر (اورنگ آباد) مہاراشٹر‘ 431004

Publishd By

Department Of Urdu

Dr.Babasaheb Ambedkar Marathwada University,

Chhatrapati Sambhajinagar

Mobile: +91-7020847345 , +91-9923954720

Email: kirtimalinijawale@gmail.com

shaikhasgar8@gmail.com

انتساب

شعبہ اردو
ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی
کی ۲۵ رویں سالگرہ (سلور جوبلی) کے نام۔

پیام

یہ بات باعث انبساط ہے کہ شعبہ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، چھترپتی سمبھاجی نگر کے زیر اہتمام ''اردو شاعری کے بدلتے رجحانات آزادی کے بعد'' کے موضوع پر 8/فروری 2025 کو ایک روزہ قومی سیمینار منعقد کیا گیا جو بہت کامیاب رہا۔ اس منعقدہ سیمینار میں اردو کے نامور مقالہ نگاروں اور ریسرچ اسکالروں نے ہندوستان بھر سے اپنے مقالے (ریسرچ پیپر) پڑھے اور اس کامیاب سیمینار میں شرکت کیں۔ سیمینار کا موضوع کو دیکھتے ہوئے ہم اس سیمینار کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت وافادیت کو دیکھتے ہوئے شعبہ اردو کی صدر پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے نے اس سیمینار میں پڑھے گئے تمام مقالوں کو یکجا کر کے اسے کتابی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ جو بڑی خوش آئند بات ہے۔ اور آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب آنے والے اردو کے قارئین اور ریسرچ اسکالرس سے کے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔

میں شعبہ اردو کی صدر پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے اور اس سیمینار کے کوآرڈینیٹر اور شعبہ کے تمام اراکین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر وجے پھلاری
وائس چانسلر
ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی
چھترپتی سمبھاجی نگر، مہاراشٹر

डॉ. बाबासाहेब आंबेडकर मराठवाडा विद्यापीठ,

छत्रपती संभाजीनगर ४३१००४, महाराष्ट्र (भारत)

नॅकद्वारे पुनर्मुल्यांकित 'अ+' श्रेणी प्राप्त

स्वातंत्र्याचा अमृत महोत्सव

Dr. Babasaheb Ambedkar Marathwada University,

Chhatrapati Sambhajinagar-431004, Maharashtra (India)

Re-accredited by NAAC with 'A+' Grade

प्रा.(डॉ.) विजय फुलारी
एम.एससी.पीएच.डी
कुलगुरु

Prof.(Dr.) Vijay Fulari
M.Sc. Ph.D
Vice-Chancellor

☎ : 0240-2403112 ✉ vc@bamu.ac.in 🌐 www.bamu.ac.in

संदेश

डॉ.बाबासाहेब आंबेडकर मराठवाडा विद्यापीठ, छत्रपती संभाजीनगर च्या उर्दू विभागाने दिनांक ८ फेब्रुवारी २०२५ रोजी "स्वातंत्र्यानंतर उर्दू कवितेतील बदलते प्रवाह" या विषयावर एक दिवसीय राष्ट्रीय चर्चासत्र आयोजित केले होते. ही आनंदाची बाब आहे. या चर्चासत्रामध्ये देशातील विविध राज्यांतील कवि,संशोधक अभ्यासक आणि शिक्षकांनी भाग घेतला. त्यांचे शोधनिबंध वाचन केले. चर्चासत्र यशस्वी संपन्न झाल्यानंतर विभाग प्रमुख प्रा.किर्तीमालीनी विठ्ठलराव जावळे यांनी या शोधनिबंधाना संकलित केले आणि ते पुस्तक स्वरुपात समोर आणले. ही खूप आनंदाची बाब आहे. चर्चासत्राच्या विषयाचे महत्व लक्षात घेता, भविष्यातील संशोधक अभ्यासक आणि शिक्षकांसाठी हे पुस्तक महत्वाचे आहे.

उर्दू विभाग प्रमुख, चर्चासत्र समन्वयक आणि सर्व सहकाऱ्यांचे अभिनंदन.

कुलगुरु
डॉ.बाबासाहेब आंबेडकर मराठवाडा विद्यापीठ,
छत्रपती संभाजीनगर

فہرست

مضامین	مضمون نگار	صفحہ نمبر
اپنی بات	پروفیسر کیرتی مالینی جاولے	1
مقدمہ	ڈاکٹر شیخ اصغر	2
آزادی کے بعد اردو شاعری	پروفیسر خواجہ اکرام الدین	4
اردو غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات آزادی کے بعد	پروفیسر سید آصف زکریا	16
غزل: اُردو آہنگ کا مراٹھی پیرایہ	ڈاکٹر قریشی عتیق احمد عبدالقدوس	24
اردو شاعری کے بدلتے رجحانات جے۔ پی سعید کی شاعری کے فن کے حوالے سے	ڈاکٹر محمد انور الدین	26
معاصر حسیت کا شاعر: قاضی سلیم	ڈاکٹر انصاری مسعود اختر جمال احمد	35
منور راناؔ کی شخصیت ایک بلند قامت	ڈاکٹر محمد مجاہد حسین	42
شعری ادب آزادی کے بعد	ڈاکٹر میمونہ بیگم ساردگی	46
جدید شاعری اور نظم آزاد	ڈاکٹر قاضی محمد شکیل الدین	50
اردو غزل میں جدیدیت کے رجحانات	ڈاکٹر صدیقی افروزہ خاتون مجیب الحسین	55
آزادی کے بعد اُردو شاعری میں روایت اور جدیدیت کا تفاعل	ڈاکٹر یاسمین سلطانہ	58
بشیر بدرؔ: جدید اردو غزل کی آبرو	ڈاکٹر صدیقی محمد عرفان سعداللہ غازی الدین	62
عدم گونڈوی کی شاعری میں سیاسی اور سماجی شعور	ڈاکٹر شری سین کمار بھارتی	65
شین۔ کاف نظام کی شاعری میں عصری حسیت	ارون کمار	69
آزادی کے بعد حمدیہ شاعری اور ارشدؔ مینا نگری	حافظ محمد ثاقب ضیاءؔ	71
بشر نواز: شاعری کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر وحیدہ بیگم یوسف خان	76
اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے رجحانات	ڈاکٹر عائشہ عبدالعزیز پٹھان	79
سکندر علی وجدؔ کی نظم نگاری	ڈاکٹر اسود گوہر	84
حمایت علی شاعر: اورنگ آباد کی ادبی زمین کا روشن ستارہ	ڈاکٹر نازنین سلطانہ آصف احمد	89

ابنِ انشا کی شاعری کے بدلتے رجحانات	ڈاکٹر نور جہاں بیگم شیخ عبدالغنی	92
آزادی کے بعد شاعری میں جدید رجحانات شیخ علیم اسرار: شخصیت وفن	فہیم خاتون غلام غوث خان ناندیڑ	95
آزادی کے بعد مراٹھواڑہ میں اُردو غزل	پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال جاوید شیخ ابراہیم	102
پروین شاکر کی شاعری: ایک تنقیدی جائزہ	قاضی واسعہ تقویم قاضی مخدوم	107
اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک	ڈاکٹر نشاط نائرہ شیخ حبیب	110
قمر اقبال کی شاعری کے چند نمایاں گوشے	ڈاکٹر قاضی عرشیہ جبین قاضی مخدوم	113
اُردو شاعری کے بدلتے رُجحانات (آزادی سے پہلے)	سعدیہ پروین نہال احمد	116
مراٹھواڑہ میں اردو غزل ۱۹۶۰ء کے بعد: ایک اجمالی جائزہ	ڈاکٹر سہیم الدین خلیل الدین صدیقی	121
غالبؔ اور شاہ حسین نہری کی غزل گوئی (ایک خاص بحر کے تناظر میں)	ڈاکٹر رعنا کوثر شیخ حسین	130
جدید اردو شاعری کے رجحانات	شازیہ نوشین جلیل احمد	134
مراٹھواڑہ کے نمائندہ شاعر: ڈاکٹر عصمت جاوید	سید اشفاق علی سید مظفر نبی	137
جدیدیت اور اردو شاعری	سیدہ نازیہ فاطمہ سید زین العابدین	140
رئیس احمد قتیلؔ کی شاعری میں جدید سماجی تصوّرات	شیخ سکندر شیخ ستار کھاٹک	143
اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کی عکاسی	شیخ شبانہ بانو محمد الیاس	147
پروین شاکر کی غزلوں کے مختلف پہلو	زیبا پروین	155
اردو شاعری پر ٹیکنالوجی کے اثرات	کوثر فاطمہ محمد نثار احمد مومن	159
اردو نعتیہ شاعری اور امام احمد رضا خان	شیخ عبدالعظیم عبدالرفیق	161
آزادی کے بعد اردو شاعری	سیدہ فوزیہ فاطمہ سید زین العابدین	165
علیم صبا نویدی کی غزل گوئی	ڈاکٹر محمد رفیق محمد حنیف	168
جدید اردو شاعری کے رجحانات	ڈاکٹر پٹیل شبینہ بیگم مجاہد	171
جدید شاعری کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر واسیعہ بیگم شیخ احمد	175
دورِ جدید کی نئی آواز	ڈاکٹر ثریا بیگم محمود خان	179
اردو شاعری میں جدید سماجی تصورات: تجزیاتی وفکری مطالعہ	ڈاکٹر سید سہیل احمد ہاشمی	185
علی سردار جعفری کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات	ڈاکٹر رضوانہ رہبر	193

اپنی بات

تغیر کائنات کا بنیادی اصول ہے؛ ادب زندگی کا پرتو ہوتا ہے۔ سماجی، سیاسی اور فکری تبدیلیوں کے اثرات براہ راست ادب پر مرتب ہوتے ہیں۔ اردو شاعری جو کبھی صرف ''گل و بلبل'' اور حُسن و عشق کے افسانوں تک محدود سمجھی جاتی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دامن میں کائنات کے ہر رنگ کو سمیٹا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''اردو شاعری کے بدلتے رجحانات آزادی کے بعد'' دراصل اسی ارتقائی سفر کی ایک بازگشت ہے۔

اردو شاعری کا سفر دکن کے ابتدائی دور سے شروع ہو کر دہلی اور لکھنؤ کے دبستان سے ہوتا ہوا جب بیسوی صدی میں داخل ہوا تو اس کا مزاج یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ کلاسیکی غزل کی ایمایئت اور رمزیت سے لے کر انجمن پنجاب کی موضوعاتی نظموں تک، اور پھر سرسید تحریک سے لے کر اقبالؔ کے فلسفیانہ آہنگ تک اردو شاعری نے ہر دور میں اپنے عہد کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔

اس کتاب میں ایسے مقالات کو شامل کیا گیا ہے جس میں تمام باتوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا نعرہ ہو کہ انقلابی نعرہ ہو، جس نے ادب کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے جوڑا ہے ساتھ ہی حلقہ ارباب ذوق کے جمالیاتی اور داخلی احساس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جدیدیت (Modernism) کے رجحانات نے جس طرح انسان کی تنہائی، بیگانگی اور وجودی کرب کو شاعری کا موضوع بنایا ہے ان تمام مقالات میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

آج اکیسویں صدی میں جب ہم مابعد جدیدیت اور ڈیجیٹل دور میں سانس لے رہے ہیں۔ اردو شاعری کے رجحانات میں ایک بار پھر تبدیلیاں رونما ہو رہی ہے۔ نثری نظم کا فروغ ہو یا غزل میں نئے اشعار کی 'تراش خراش'، یہ سب زندہ زبان کی علامتیں ہیں۔

یہ کتاب محض مقالات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ان فکری لہروں کا تجزیہ ہے جنھوں نے ہمارے شعری ذوق کی آبیاری کی ہے۔ اس کا مقصد قارئین خصوصاً نئی نسل کو یہ باآور کرانا ہے کہ اردو شاعری کس طرح مختلف ادوار میں بدلتے ہوئے تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کرتی رہی ہے۔

میں ان تمام احباب، اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے اس کامیاب سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کو یکجا کرنے کا حوصلہ دیا۔ ہمارے یونیورسٹی کے وائس چانسلر اعلیٰ جناب پروفیسر وجئے جے پھلاری صاحب کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی اور ہر قدم پر ان کے ساتھ نے ہمیں مزید قوت عطا کی۔ اس کتاب کے پیغام کے لئے میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں ساتھ ہی جواہر لال یونیورسٹی (جے این یو) سے تشریف لائے پروفیسر خواجہ اکرام الدین صاحب کی بھی ممنون ہوں کے سیمینار کو کامیاب بنانے کے لئے آپ نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ سیمینار میں آئے ہوئے تمام مہمان اساتذہ کرام، ریسرچ اسکالرس کا بھی شکریہ جنھوں نے نہ صرف اس سیمینار میں شرکت کی بلکہ اپنے گراں قدر مقالے بھی پیش کئے۔ اس کے علاوہ اس سیمینار کے کنوینر اور شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کی محنت اور لگن سے یہ سیمینار اور یہ کتاب مرتب ہو سکی ان کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

شکریہ
ڈاکٹر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے
پروفیسر و صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی
چھترپتی سمبھاجی نگر، مہاراشٹر

مقدمہ

ادب کسی بھی قوم کا وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کی تہذیب اقداراور سماجی شکست وریخت اورنفسیاتی کیفیات صاف دیکھی جاسکتی ہے۔اردوشاعری جو صدیوں سے ہماری جذباتی اورفکری زندگی کی ترجمان رہی ہے 1947ء کےانقلاب عظیم کے بعدایک بالکل نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔آزادی محض ایک سیاسی واقعہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک نئے عہد کا آغاز، نئے خوابوں کی تعبیر اور نئے دکھوں کا پیش خیمہ بھی تھا۔

قیام پاکستان اور تقسیم ہند کے بعد اردوشاعری میں جو پہلا بڑا رجحان سامنے آیا وہ ہجرت کے کرب اور فسادات کے المیے کا تھا۔فسادات کی آگ اور بچھڑنے کے دکھ نے اردونظم وغزل کو ایک نیا لہجہ عطا کیا جہاں ایک طرف آزادی کی خوشی تھی تو وہیں دوسری جانب ''یہ داغ داغ اجالا'' جیسی کیفیت بھی موجود تھیں۔اس موڑ سے اردوشاعری نے روایتی گُل وبُلبُل کے موقعوں سے نکل کر براہ راست زندگی کے پنپتے ہوئے حقائق سے رشتہ جوڑلیا۔

آزادی کے فوری بعد کی شاعری پر''ترقی پسندتحریک'' کا گہرا اثر رہا۔اس دور میں فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی اور مخدوم محی الدین جیسے شعراء نے جہاں آزادی کی ادھوری خوشی کا نوحہ دیکھا وہیں مزدوراور کسان کے دکھوں کو بھی آواز دی۔''یہ داغ داغ اجالا'، یہ شب گزیدہ سحر'' محض ایک مصرعہ نہیں تھا بلکہ اس پوری نسل کا اجتماعی کرب تھا۔

تاہم جیسے جیسے وقت کا پہیہ گھوما1960ء کی دہائی میں اردوشاعری نے ایک کروٹ لی اور جدیدیت (Modernism) کا دورشروع ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب شاعر خارجی ہنگاموں سے کٹ کر اپنی ذات کے اندر جھانکنے لگا۔ناصر کاظمی، منیر نیازی، ظفر اقبال، بشر نواز جیسے نامور شاعروں نے تنہائی، بیگانگی، وجودی کرب، اور شہری زندگی کے بے معنویت کو شاعری کا موضوع بنایا۔غزل جو کبھی صرف محبوب کے حسن و جمال کی اسیر تھی، اب ذات کے ٹکڑے چننے اور وجود کی کرچیوں کو سمیٹنے کا فن بن گئی۔جدیدیت کے بعد ابھرے ''نئی نظم' اور نثری نظم کے تجربات نے اردوشاعری کی ہیت (Form) کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ن۔م۔راشداور میراجی سے شروع ہونے والا یہ سفر آج نثری نظم تک آپہنچا ہے۔جہاں شاعر کسی بھی بحر یا قافیے کی قید کے بغیر اپنے جذبات کی براہ راست ترسیل کررہا ہے۔

جدیدیت کے رجحان نے اردوشاعری کو یکسر بدل دیا۔اب شاعری محض سیاسی نعرہ نہیں رہی بلکہ یہ وجودی کرب، شہری زندگی کی تنہائی، ذات کے بحران اور مشینی عہد میں انسان کی بے بسی کا اظہار بن گئی۔ن۔م راشداور میراجی جو جدیدیت کے پیش رو تھے کے اثرات گہرے ہوئے اور بعدازاں ظفر اقبال، شمس الرحمٰن فاروقی اور افتخار جالب جیسے ناموں نے زبان اور بیان کے نئے تجربات کئے۔

مابعد جدیدیت اور اکیسوی صدی کا اثر بھی اردوشاعری پر پڑا۔آج کی اردوشاعری گلوبلائزیشن، سوشل میڈیا اور نسائی شعور (Feminism) جیسے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔آج کا شاعر اپنی مقامی جڑوں کی تلاش میں بھی ہے اور عالمی مسائل سے نبرد آزماں ہے۔اب اردوشاعری پر کوئی ایک خاص مخصوص رنگ نظر نہیں آتا۔اردوشاعری کسی ایک مخصوص نظریہ کی قید نہیں ہے۔پروین شاکر سے لے کر عصر حاضر کے نوجوان شعراء تک کے موضوعات میں ایک نیاپن نظر آتا ہے۔جو آج کے جدید دور کی عکاسی کرتا ہے۔

یہ کتاب شعبہ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں منعقد کردہ ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان''اردو شاعری کے بدلتے رجحانات (آزادی کے بعد) میں پیش کردہ مقالات کا مجموعہ ہے۔اس کامیاب سیمینار میں ۳۰ مقالات پیش کئے گئے ہیں جس میں مختلف ریاستوں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کرام، ریسرچ اسکالرس نے شرکت فرمائی اور دیئے گئے موضوعات پر اپنے گرانقدر مقالات پیش کئے۔ان مقالوں کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس سیمینار کی چیئرمین صدر شعبہ اردو پروفیسر کیرتی مالینی وٹھل راؤ جاولے صاحبہ نے ان مقالوں کو کتابی شکل دینے کا مصمم ارادہ کیا۔اب قارئین کی خدمت میں یہ کتاب حاضر ہے۔

ISBN: 978-93-344-4743-9

اس کتاب کی ترتیب کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ قارئین اور ادب کے طلبہ یہ دیکھ سکے کہ کس طرح وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ہماری اردو شاعری کے اوزان، اسالیب، علامتوں و استعاروں کو بدلا ہے۔ یہ کتاب محض مقالات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اردو شاعری کے اس سفر کی روداد ہے جو کلاسیکی بنیادوں سے شروع ہو کر مابعد جدیدیت اور اکیسوی صدی کے پیچیدہ موڑ تک پہنچی ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام مقالات ان تمام فکری اور فنی تبدیلیوں کا احاطہ کرتے ہیں جنھوں نے پچھلی سات دہائیوں میں اردو شاعری کے مزاج کو تشکیل دیا ہے۔ اس کتاب کا ایک مقصد یہ بھی دیکھنا ہے کہ اردو شاعری نے کس طرح اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ یہ کتاب اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اردو شاعری کسی جمود کا شکار نہیں ہے بلکہ یہ ایک زندہ اور متحرک صنف ہے۔ جو اپنے عہد کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔

میں امید کرتا ہوں کے ہماری یہ کاوش اردو ادب کے سنجیدہ قارئین اور ریسرچ اسکالر طلباء و طالبات کے لئے فکر کے نئے دریچے کھولے گی۔ اور اس عہد کی شعری بصیرت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ ساتھ ہی یہ کتاب تمام اردو ادب کے قارئین کے لئے ایک روشن دریچے کی حیثیت رکھے گی اور انھیں آزادی کے بعد اردو شاعری کے ادبی منظر نامے کو سمجھنے میں کارآمد ثابت ہوگی۔

شکریہ
(سیمینار کنوینز)
ڈاکٹر شیخ اصغر اکبر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی
چھترپتی سمبھاجی نگر، مہاراشٹر

آزادی کے بعد اردو شاعری

پروفیسر خواجہ اکرام الدین
شعبہ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اکیسویں صدی کے اس عہد میں جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کا بول بالا ہے، جہاں انٹرنیٹ کی دنیا میں معلومات کا انبار ہے۔ اور مجموعی طور پر اس عہد نے انسان کو مادیت کے حصار میں اس طرح گرفتار کر رکھا ہے کہ ہر چیز میں سود و زیان کا پیمانہ ہی ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ ایسے میں یہ سوال بھی اہم ہو جاتا ہے کہ "اس اکیسویں صدی" میں کیا ادب کی کوئی ضرورت۔ ہے بھی یا نہیں؟؟؟

لیکن اس سوال سے پہلے یہ بھی غور کرنا ہے کہ اس عہد میں ادب کی تفہیم کی کیا کیا صورتیں ہیں کیونکہ آج دنیا کو سمجھنے، سمجھانے کا نظریہ بدل گیا ہے، زندگی کو دیکھنے کے زاویے تبدیل ہو چکے ہیں تو لامحالہ ادب کی تفہیم کے زاویے اور نظریات میں بھی لازماً تبدیلیاں آئی ہوں گی۔۔۔۔

دراصل زبان و ادب کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں دبے پاؤں تبدیلیاں آتی ہیں اور جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے بہت کچھ بدل گیا۔

معاصر جدید اردو نظم نگاروں (1970ء تا حال) نے مجموعی طور پر اپنی نظموں میں مظاہر فطرت، معاشی و معاشرتی مسائل، ذات اور کائنات، وقت اور موت کے نفسیاتی انفعال اور ردِ اعمال کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے نفسیاتی انفعال، باطنی دباؤ، گھٹن اور نا آسودگی سے شروع ہو کر کائنات کی وسعتوں کے سامنے انسانی زندگی کی بے حیثیتی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے پھیلنے والی بے یقینی اور لایعنیت کی فضا کی عکاسی کی ہے۔ شعرا نے اپنے ذاتی احساس، واردات، خود شناسی میں ڈوب کر معاشرتی انتشار سے نئی ترتیب اور نظام زندگی تراشنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے کچھ قدیم اساطیری علامتوں کے ذریعے مرد اور عورت کے آپسی رشتے کو اپنی محسوسات کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ متعدد شعرا نے مناظر فطرت کو عورت کے جسمانی اعضا میں مجسم کر کے بیان کیا ہے۔

1970ء کے بعد کی شاعری میں فرد اور معاشرے کے انتشار ہم آمیز دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کا باطنی کھوکھلا پن اور معاشرتی نمائشی زندگی کے خالی پن سے جڑ کر مضمحل انا کا حوالہ بن گیا ہے۔ آزاد نظم کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اس عہد کے شعرا نے اپنی ذات کی بازیافت کے ساتھ ساتھ اجتماعی آشوب اور خلفشاری کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ 1970ء کے بعد کے شعرا کی شاعری کا بنیادی بیچ فرد اور معاشرے کی کشاکش کا داخلی شعور ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی لاشعور کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر شعرا نے علامت نگاری تمثال نگاری کے علاوہ کراہت انگیز مناظر، خود کلامی کی تکنیک اور نفسی حقائق کا اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان شعرا نے کسی تحریک کا واضح حصہ بنے بغیر مختلف ہیئتوں اور تکنیکی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیقی تجربے کی کلیت پر یقین رکھا ہے۔ معاصر اردو نظم نگاروں کے یہاں اپنے عصر کی مخصوص حسیت سے انسلاک کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ اس عہد کی نظمیں جدیدیت کی واضح توسیع لگتی ہیں اور ان پر راشد، میراجی، فیض، مجید امجد اور اختر الایمان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس عہد کی نظمیں عصری، فکری اور اسلوبیاتی سطح پر بھی اظہار کی نو بنو صورتوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ معاصر نظم میں معنی کی تکثریت کے جلوے علمی، ادبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی، جمالیاتی اور علامتی سطوح پر نئے جہان خلق ہوئے ہیں۔

اردو نظم

جدید اُردو نظم دراصل ادبی تحریکوں کا دوسرا نام ہے۔ اس کو فروغ دینے میں انجمن پنجاب، رومانوی تحریک، ترقی پسند اور حلقہ ارباب ذوق جیسی ادبی تحریکوں کو خاص مقام و اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان تحریکوں سے وابستہ ہو کر شعرا نے بہت جلد مقبولیت بھی حاصل کی اور کچھ شعرا ان ادبی تنظیموں سے الگ ہو کر بھی جدید اردو نظم کی تخلیق کرتے رہے۔ ایسے شعرا کی شاعرانہ حیثیت بہت بعد میں قائم ہوئی۔ جدید اردو نظم نگاروں کے اس قبیل کو ترقی پسند اور حلقے کی فہرست سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔ ادبی تحریکوں سے الگ رہ کر نظم تخلیق کرنے والے شعرا کے بارے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"۔۔۔اس دور میں حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ کچھ ایسے شعرا بھی نظمیں لکھ رہے تھے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

جوان میں سے کسی ایک طرف جھکاؤ رکھنے کے باوجود زیادہ تر گروہ بندی سے آزاد تھے۔ان میں مجید امجد کا نام سرفہرست ہے۔دیگر شعرا میں اختر الایمان، سلام مچھلی شہری اور منیب الرحمٰن خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔سلام پچاس ساٹھ پہلے بہت مشہور تھے، اب کم جانے جاتے ہیں۔کم وبیش یہی کیفیت منیب الرحمٰن کی ہے لیکن مجید امجد اور اختر الایمان رفتہ رفتہ اہمیت اور شہرت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔"(۱)

تقسیم سے قبل رومانوی اور تقسیم کے بعد ترقی پسند اور حلقہ کے شعرا خوب جانے پہچانے جاتے تھے، پھر رفتہ رفتہ غیر تحریکی شعرا بھی نئے مسائل اور نئے تقاضوں کے ساتھ سامنے آئے۔یہ شعرا رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک کی درمیانی کڑی ہیں۔ان شعرا میں رومانوی، ترقی پسند اور حلقہ کی تحریکوں کے اثرات ہونے کی وجہ سے تینوں رجحانات کی جھلک نظر آتی ہے۔

ان شعرا نے نئے موضوعات کیا ظہار کے لیے نئی ہیئتوں کو وسیلہ بنایا۔ان شعرا نے جذبات واحساسات اور تمناؤں کے اظہار کے ساتھ ساتھ عقل وشعور سے تلخ سچائیوں اور عہد کے کڑے لمحوں کی عکاسی کرتے ہوئے تہذیبی وتمدنی اقدار کی شکست وریخت کا احساس بھی دلایا ہے۔ان غیر تحریکی شعرا کے یہاں حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند شعرا سے مماثلتیں بھی ہیں اور متفرق موضوعات کے صدرنگ تجربے ملتے ہیں۔ان شعرا نے جدید اردو نظم کو مخصوص موضوعات اور اسالیب کے دائرے سے نکال کر وسعت عطا کی۔

فاخر ہریانوی ایسے فطرت نگار شاعر تھے جن کا جھکاؤ کسی ایک تحریک کی طرف نہیں تھا۔وہ رومانوی اور ترقی پسند تحریک دونوں سے متاثر تھے اگر کہا جائے کہ انھوں نے رومانوی اور ترقی پسند تحریک کے درمیان کڑی کا کام کیا تو بجا ہے۔ان کی نظمیں رومانوی طرز احساس لیے ہوئے ہیں۔سیاسی وسماجی مسائل کی ترجمانی کرتی ہیں۔انھوں نے کسی قسم کی نظریاتی پابندی قبول نہ کی اور ہر طرح کے موضوعات کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔ان کی شاعری میں معاصر رجحانات کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر کسی ادبی گروہ کی چھاپ نہیں ملتی۔ان کا شعری مجموعہ "موجِ صبا" ایک مشترک انسانیت کو منعکس کرتا ہے۔انھوں نے بچپن کی یادوں کو تادم آخر قائم رکھا۔انھوں نے جدید اردو نظم کو فطرت کا قابل قدر سرمایہ عطا کیا، اس ضمن میں ان کی نظم "خدا" دیکھیے:

اسی کے حکم سے بہتی ہے چاندنی آبشاروں میں
حسیں فطرت لیے بیٹھی ہے بربط کوہساروں میں
اسی کے حکم سے دن رات گردش ہے بگولوں میں
چراغاں کر رہے ہیں کرمک شب تاب پھولوں میں

فاخر ہریانوی نے عظمت اللہ خان کے لہجہ اور اسلوب سے اثر قبول کیا، انگریزی شاعری کے زیر اثر بھی انھوں نے نظمیں تخلیق کیں۔نظم "کوئل" اس کی عمدہ مثال ہے۔اس نظم میں فطرت کی خوب صورت مصوری کے ساتھ ساتھ شاعر نے وطن سے محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔۔فاخر نے بھی اقبال کی طرح "ہمالہ" پر نظم لکھی مگر ان کا اسلوب اور لہجہ مختلف ہے:

کیا تھا نصب خیمہ دھوپ نے سیمیں چٹانوں پر
زمیں کا عکس پڑتا تھا سنہری آسمانوں پر
نظر کو خوش نما سب وادیاں معلوم ہوتی تھیں
سنہری دھوپ میں شہزادیاں معلوم ہوتی تھیں

مجید امجد اس دنیا کی محفلوں سے مایوس نظر آتے ہیں، وہ انسان کی موجودہ زندگی کا سامنا نہیں کر سکتے اور نظام میں تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔وہ ایسی تبدیلی چاہتے ہیں جہاں انسان خوشی اور آرام وسکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ان کی شاعری میں تنہائیوں کی پرچھائیاں ہیں ان کا احساس اپنی ذات، محرومیوں، ناکامیوں اور زندگی کی بے حاصلی و بے مصرفی سے پیدا ہوتا ہے:

دل نے ایک دکھ سہا تنہا
انجمن انجمن رہا تنہا

ISBN: 978-93-344-4743-9

ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے

کوئی گزرا بار ہا تنہا

تنہائی اور بے یار و مددگار رہونے کا ذکر اختر الایمان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ان کے شعری مجموعہ "گرداب" میں شامل نظم "لغزش" میں یہ عنصر نمایاں ہے:

اب مرے معصوم زخموں سے لہو بہتا نہیں

میں اکیلا جا رہا ہوں اور زمیں ہے سنگلاخ

اجنبی وادی میں میرا آشنا کوئی نہیں

مجید امجد اور اختر الایمان کی یہ نظمیں اگر چہ ہیئتی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن موضوع ایک جیسا ہے۔اختر کی یہ نظم معرا کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ان دونوں شعرا کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جنھیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاموں اور اداسیوں کے شاعر ہیں۔

عمیق حنفی کی شاعری میں جدید دور کے انسان کی تنہائی کا احساس پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں اس پر ہجوم کائنات میں بھی آج کا انسان اکیلے پن کا شکار ہے۔یہ شعری نمونہ دیکھیے:

اس بھیڑ کے میلے ٹھیلے میں

آدم زادوں کے ریلے میں

کیا حسن ادا، کیا عشق و ہوس

ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا

تنہا تنہا ، تنہا تنہا

بلراج کومل کی شاعری میں عہد جدید کے متنوع تجربات و احساسات موجود ہیں۔صنعتی و مادی زندگی کی مصروفیت، تشدد اور ذہنی کرب ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔وہ گھبرا کر ماضی میں پناہ نہیں لیتے اور نہ ہی مستقبل کے خوابوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں بلکہ لمحہء حال میں رہ کر تعمیری سوچ کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔بلراج کومل تمام تر بحرانوں کے باوجود لمحہء حال میں جینے کے خواہش مند ہیں۔بلراج کومل اور مجید امجد میں اس حوالے سے مماثلت پائی جاتی ہے کیوں کہ مجید امجد بھی لمحہء حال کے شاعر کے طور پر پہچان رکھتے ہیں۔ان کی نظم "جنگ" ملاحظہ کیجیے:

ایک ماں سینہ کوبی سے تھک کر گری

اک بہن اپنی آنکھوں میں آنسو لیے

راہ تکتی رہی

ایک ننھا کھلونے کی امید میں

سر دہلیز پر رکھ کر سوتا رہا

بلراج کومل کی یہ نظم جنگی جنون اور جارحیت کے محرک سے پیدا ہونے والے بھیانک نتائج کو ایک تمثیلی انداز میں پیش کرتی ہے۔ان کی نظمیں اجتماعی تشدد کو بے نقاب کرتی ہیں ان میں "سوگندھی، تشدد، احمد آباد، اک گل تازہ کہیں باقی ہے شاید اور جشنِ ہوس جیسی نظمیں شامل ہیں۔انھوں نے قتل و غارت اور فسادات میں ہونے والے جنسی تشدد کا ذکر کیا ہے۔بلراج کومل کی شاعری نظام زیست اور انسانی رویوں سے مربوط ہے ان کی شاعری میں تمثیلی اور علامتی نظموں کے علاوہ شکستِ ذات اور حصارِ ذات کی حامل نظمیں بھی ملتی ہیں۔

کمار پاشی عہد جدید کے انسان کو ماضی کا تہذیبی سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔انھوں نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ہم اپنی روایات اور تہذیب سے دور ہو گئے ہیں اور ہماری رسائی حسن بے پناہ تک نہیں رہی، جدید دور کا انسان جدت پسندی کے زعم میں مبتلا ہے۔کمار پاشی ماضی کے انفرادی تجربے میں قید ہونے سے نالاں ہیں اور لمحہ

ءحال کے لیے سرگرداں ہیں۔ وہ انفرادی ماضی میں اپنی ذات کو محصور نہیں کرنا چاہتے وہ اس ماضی کی بات کرتے ہیں جو اجتماعی روایت کی پاسدار ہو۔ اجتماعی دکھوں کی بہتی ندی میں انفرادی نوعیت کے دکھ مٹ جاتے ہیں، اس کی مثال "انتم سنسار" دیکھیے :

سوکھ چکی ہے بہتی ندی

آنکھوں میں اب نیر نہیں ہیں

سوچو تو کچھ

کہاں گئے وہ بھگت پجاری

صبح کو اٹھ کر

جو سورج کو جل دیتے ہیں

ایک اور مثال

نہ راستوں کا یقین نہ منزلوں کا پتہ

فلک فلک ہے سیاہی، زمیں زمیں کہرا

نہ رنگ رنگ مناظر نہ موسموں کی خبر

خلا میں گونج رہا ہے ہواؤں کا نوحہ

معاصر شعرا کو رومانوی، ترقی پسند، داخلیت پسندی، امجسٹ نہیں کہہ سکتے۔ 1970ء کے الگ بھگ اپنی شناخت بنانے والے شعرا میں متعدد 1960ء میں اپنے شعری سفر کا آغاز کر چکے تھے۔ 1970ء کے بعد سامنے آنے والے جدید شعرا اپنے ذاتی بحرانوں اور عصری تلخیوں کا اظہار جیسا ہے جہاں ہے کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ انھوں نے نظموں میں کردار نگاری کے بجائے تمثیل اور تصاویر بنانے کی سعی اور ظاہر و باطن کی تفریق مٹا دی۔ گذشتہ پچاس سالوں میں نظم مختلف تکنیکی، اسلوبیاتی اور موضوعاتی نشیب و فراز سے گزری ہے۔ اس دور کے شعرا میں روایت سے چپٹے رہنے کی ضد بھی نظر آتی ہے اور نئی راہوں کی تلاش و بسیار کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ ساتویں دھے کے نظم نگاروں سے متعلق عقیل احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''انکشاف ذات ساتویں دھے کے شاعروں کی عام خصوصیت ہےجس میں چھٹے دہے کے بعض شاعر بھی شامل ہیں ان شاعروں پر ان کے مخصوص رویے کے سبب داخلیت پسند یا انفرادیت پرست ہونے کا الزام لگایا ہے۔ یہ رویہ ذات کی طرف مراجعت ضرور ہے لیکن ایسا نہیں کہ جدید شاعروں نے خارجی کائنات سے اپنا رشتہ ختم کر لیا ہو۔ سماج سے ان کا رشتہ اسی طرح برقرار ہے جس طرح کہ ماضی کے ادیبوں کا۔''(۱)

1970ء کے بعد کے شعرا کی نظموں میں مظاہر فطرت، معاشرہ، ذات، وقت اور موت کے افعال، اعمال اور رد اعمال سمٹے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں عصری حسیت بڑے واضح خدوخال میں نظر آتی ہے، انھوں نے ذاتی واردات، خود شناسی اور احساسات میں ڈوب کر نئے شعری پیکر تراشے ہیں۔ کچھ شعرا نے فطرت کے مناظر کو عورت کے جسمانی اعضا میں مجسم کر کے پیش کیا ہے اور کچھ نے قدیم اساطیری علامتوں کے ذریعے مرد اور عورت کے آپسی رشتے کو تصور کے دائرے میں لانے کی سعی کی ہے۔ اس دور کے شعرا کسی تکنیک کو مقصود بالذات نہیں سمجھتے اور کسی تحریک اور رجحان کا حد سے زیادہ حصہ بھی نہیں بنتے۔ بل کہ اپنے تخلیقی وفور سے مختلف ہیئتیں اور تکنیکیں بروئے کار لاتے ہیں۔ ۰ ۷ ء کے بعد کی نظموں میں فرد اور معاشرے کا انتشار خیال و فکر شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ معاصر نظم نگاروں کی مخصوص حسیت فہم اور متخیلہ خلق کرتے ہیں۔

ستر کی دہائی کی نظم اقبال کے سطحی اثرات، تصدق حسین خالد، میراجی اور ن م راشد کے فکری دھاروں اور اسالیب کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ایک نیا لہجہ اور ایک نیا آہنگ تشکیل دینے میں کام یاب ہوگئی۔ اقبال سے مجید امجد اور اختر الایمان تک کے نظم نگاروں نے جن امکانات کو کھنگالا اس کے اثرات ہمیں ستر کے دہے کے نظم نگاروں پر ملتے ہیں لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ستر کے بعد کے نظم نگاروں نے اندھی تقلید کرنے کے بجائے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ماضی کی بازگشت کے ساتھ ساتھ گذشتہ پچاس سالوں میں پاکستان اور ہندوستان میں آمریت اور جمہوریت کے تسلسل کو بیان کیا ہے۔

ISBN: 978-93-344-4743-9

انیس ناگی کی نظموں میں وجودی کرب، داخلی خلفشار، احساسِ عدم تحفظ اور زندگی کی لایعنیت سے پیدا ہونے والا ایک خاص قسم کا احساس بیگانگی پایا جاتا ہے۔ انفرادی واجتماعی زندگی کی محرومیوں اور پریشانیوں سے ابھرنے والی بے ذائقی نے انیس کی عورت ذات سے وابستہ رشتوں سے متنفر کر دیا ہے ان کو عورت کی محبت بھی مادیت پرست اور بے رنگ محسوس ہوتی ہے، نظم "اجڑتی جارہی ہے" عورت کے مادہ پرست کردار کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے:

احساس کی دنیا اجڑتی جارہی ہے
پھول بھی بے رنگ خوشبو سے تہی
ہر سمت ویرانی
مکاں ٹوٹے اور مکیں بدحال
غصے میں بجڑتی عورتیں
خاوندوں کو گالیاں بکتی گھریلو عورتیں
جو ہمیشہ مال وزر کی منتظر ہیں
اسی طرح کی ابتری میں

محمد علوی کی عصری صورت حال کی عکاسی کرتی ہوئی اہم نظموں میں "آخری دن کی تلاش"، "آئینے میں"، "کیبرے"، "ہال میں"، "مچھلی کی بو" اور "مجھے ان جزیروں میں لے جاؤ" شامل ہیں۔ نظم "ہوا سرد" میں علوی نے اپنی داخلی تنہائی کو اپنا اندرونی کرب سے ہم آہنگ کرکے بیان کیا ہے:

میں دریچے میں تنہا
کھڑا سوچتا ہوں
رات کے پاس میرے لیے کیا ہے
ان جانی خوشیاں ہیں یا
کل کا باسی پرانا
پھپھوندی لگا درد ہے

نظم "نوحہ" میں انا کی بے چارگی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نوحہ ایک ایسے شخص کی علامت بھی بنتا ہے جو جلا وطنی کی زندگی بھی بسر کر رہا ہے، اس کے عزائم مفلوج ہو چکے ہیں:

کس جنم کا ہم آج ایندھن بنے ہیں
جو جلتا نہیں اور بجھتا نہیں
ہاں یہ تابوت اٹھتا نہیں
یہ کیسی ہوا ہے
جو چلتی نہیں اور تھمتی نہیں
جسم پر کتنی لاشیں پڑی ہیں
جنھیں دیکھ کر کوئی روتا اور ہنستا نہیں

بشر نواز نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کی بے رنگینیوں اور نفرتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے آزاد اور معرا دونوں ہیئتوں کا استعمال کیا ہے، ان کی نظموں میں تنہائی کا ذکر بھی ملتا ہے اس حوالے سے ان کی نظمیں "تنہا رات سمندر" اور "کوئی تنہائی سی تنہائی ہے" زیادہ اہم ہیں۔ انھوں نے اپنی نارسائیوں، محرومیوں اور تنہائیوں کا

تجربہ اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ان کی تنہائی اور نارسائی کے موضوع پر لکھی گئی نظمیں رومانوی طرز احساس کی حامل ہیں۔انھوں نے تنہائی کے لمحوں میں اپنی یادوں کی شمع جلائی ہے۔ان کی شاعری میں شام، چراغ اور تاریکی کے الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔مثال کے لیے نظم" کوئی تنہائی سی تنہائی ہے" ملاحظہ کیجیے:

رات تاریک ہے ، خاموشی ہے تنہائی ہے
آج یادوں کی بھی شمعیں نہیں روشن دل میں
شورِ ماتم ہے نہ اب سازِ طرب کی جھنکار
اتنی ویرانی نہ تھی آج تک اس محفل میں
جانے پہچانے سے کچھ چہرے تو مل جاتے تھے
دوگھڑی ہی کو سہی پھول تو کھِل جاتے تھے

اب کی بار ملو جب مجھ سے
پہلی اور بس آخری بار
ہنس کر ملنا
پیار بھری نظروں سے تکنا
ایسے ملنا
جیسے ازل سے
میرے لیے تم سرگرداں تھے
بحرتھا میں تم موج رواں تھے
پہلی اور بس آخری بار
ایسے ملنا
جیسے تم خود مجھ پہ فدا ہو
جیسے مجسم مہر وفا ہو
جیسے بت ہو تم نہ خدا ہو

بشر نواز کی معرکہ نظموں میں "رائیگاں، مسیحا، ہمیں چراغ ہمیں پروانے، آدم وآہن، خواب ٹوٹنے پر اور المیہ، زیادہ اہم ہیں۔ان کے شعری مجموعہ "اجنبی سمندر" کی نظمیں آزاد ہیئت میں خلق ہوئی ہیں۔ ان میں "اجنبی سمندر، پتہ نہیں وہ کون تھا، نارسا، وقت کے کٹہرے میں ،کھوئے گیتوں کا نوحہ، یہیں منظر ٹھہر جائے، زینہ زینہ، اعتراف، اور "وقت زندگی اور میں، زیادہ اہم ہیں۔ان کی نظم میں ان کی ذات اور کائنات کے موضوع ملتے ہیں۔بشر نواز نے اپنی ذات کی محرومیوں، نارسائیوں، خواہشوں اور خوابوں کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔انھوں نے کچھ خواب دیکھے ہیں جو تعبیر نہیں ہوئے، انھوں نے کچھ ادھوری خواہشیں بھی اپنے دل میں چھپا رکھی ہیں۔

ارتکاز افضل

بڑی مدت سے بس اس
زعم میں ہم مبتلا تھے
کہ ہم سورج کے وارث۔۔۔سور یہ ونشی

 ISBN: 978-93-344-4743-9

طلوع صبح کی نوخیز
رونق سے ہمارا کیا تعلق
چہچہوں سے واسطہ کیا
جدھر منہ موڑ لیں گے
سارا زمانہ ساتھ ہوگا
اگر بھولے سے سورج بھی
کبھی دستک جو دروازے پہ دے
چوکھٹ سے لوٹا دیں گے۔۔۔کہہ دیں گے
دیر تک جاگے ہوئے تھے
دیر تک سوئیں گے،ہم
پھر کبھی آنا!

سلیم محی الدین

آئینوں سے دھول مٹانے آتے ہیں
کچھ موسم تو آگ لگانے آتے ہیں
نیند تو گویا ان آنکھوں کی دشمن ہے
مجھ کو پھر بھی خواب سہانے آتے ہیں
ان آنکھوں میں رنگ تمہارے کھلتے ہیں
یہ موسم کب پھول کھلانے آتے ہیں
رونا ہنسنا ہنسنا رونا عادت ہے
ہم کو بھی کچھ درد چھپانے آتے ہیں
شبنم شبنم خواب اترتے ہیں مجھ پر
سو سو سورج دھوپ اگانے آتے ہیں
جسم دکاں ہے ذہن بکاؤ شہروں میں
جنگل تو دو چار دوانے آتے ہیں

شہر یار کی نظموں میں بھی دعائیہ عنصر نمایاں ہے وہ بڑے لطیف اور دھیمے لہجے میں دعا کا تصور بیان کرتے ہیں۔وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے حالات کی بہتری کے لیے پر امید ہیں،نظم "پیشانی کا کرب" ملاحظہ کیجیے:

اے خداوندا!اے رحیم و کریم
میں پشیمان ہوں کہ ہاں میں نے
ایک دن جسم سے بغاوت کی

اب سزا مل چکی ہے مجھ کو بہت

خواب کا عنصر شہر یار کی شاعری کا بنیادی محرک اور استعارہ ہے،ان کی شاعری میں جدید دور کا حساس نوجوان ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ خواب اس نوجوان کی کمزوری اور طاقت کی علامت ہے۔شہر یار نے صدیوں کے دیکھے ہوئے خوابوں کی شکست کا ذکر کرتے ہوئے اپنی یادوں اور آرزوؤں کے قافلے سکوت کے سمندر میں غرق کر دیے ہیں۔ان کی نظموں میں عہد جدید کے انسان کا درد بھی ہے اور خواب بھی،ان کی شاعری میں پائی جانے والی غنائیت معاصر شعرا کی طرح شیلے اور انگریزی رومانوی شعرا سے مماثلت رکھتی ہے۔اس کی اعلا مثال نظم "اجل کی نغمگی" ہے۔شہر یار کی نظموں میں جدت،تازگی اور انفرادیت آمیز ہیاور انھوں نے روایت کی کڑی کو جدت بخوبی ملا دیا ہے۔ان کی شاعری انسانی تجربے اور مشاہدے کی عکاس ہے۔شہر یار کی ابتدائی نظمیں نفسیاتی محرک کی حامل ہیں۔"وقت"،"سائے"،" آرزو"،"پرچھائی"اور "خودفریبی" کے عنوان سے لکھی ہوئی نظموں میں انسانی نفسیات کے اشارے ملتے ہیں۔شہر یار نے عصری زندگی کے سنجیدہ مسائل کو اپنی نظمیہ شاعری کا فکری محور بنایا،انھوں نے معاصر صورت حال کا بڑے تیقن اور باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور گردوپیش کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا۔انھوں نے حیات وکائنات کے ذاتی وانفرادی مسائل کو بھی موضوع بنایا۔شہر یار نے معاصر شعری روایت کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ان کی اہم نظموں میں "نیا امرت"،"ہوا"،"اپنی یاد میں"،"بارش"،"پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا"،"نیا دن نیا عذاب"،" پچھتاوا"،" تنبیہ"،"دانہء گندم سے دوری"،"باقی ماندہ خواب"،"اپنے سے دوری"،"باقی آدھی داستان"،" کمرے میں مقید روشنی"اور "دھندلکا" شامل ہیں۔

بوتل کے اندر کا جن
نکلے تو اس سے پوچھیں
جینے کا کیا ڈھنگ کریں
کن سپنوں سے جنگ کریں

میرے لیے رات نے
آج فراہم کیا
ایک نیا مرحلہ
نیندوں سے خالی کیا
اشکوں سے پھر بھر دیا
کاسہ مری آنکھ کا
اور کہا کان میں
میں نے ہر اک جرم سے
تم کو بری کر دیا
میں نے سدا کے لیے
تم کو رہا کر دیا
جاؤ جدھر چاہو تم
جاگو کہ سو جاؤ تم
خواب کا در بند ہے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

ندا فاضلی کو اپنا عہد، عہد غلامی سے بھی بدتر لگتا ہے کیوں کہ ہر طرف فسادات اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ انسان حیوانات کا روپ دھار لیتا ہے۔ ندا نے اپنی نظموں میں قومی یکجہتی پر زور دیا ہے۔ انھوں نے فرقہ پرستی اور فسادات کے خلاف متعدد نظمیں لکھی ہیں انھوں نے مذہب کے نام پر روا رکھی جانے والی خون ریزی کی مذمت کی ہے، ندا فاضلی کی نظمیں سیاسی رہنماؤں پر طنز کاری کرتی ہیں۔ نظم "ایک قومی رہنما کے نام" دیکھیے :

کرفیو زدہ راہیں
سلگتے کھیل کے میدان
روتی چیختی مائیں
مجھے معلوم ہے
چاروں طرف یہ جو تباہی ہے
حکومت ہے
سیاست کے تماشوں کی گواہی ہے
تمھیں ہندو کی چاہت ہے۔
نہ مسلم سے عداوت ہے۔
تمھارا دھرم صدیوں سے تجارت تھا تجارت ہے

مختار صدیقی اپنا تخلیقی مواد معاشرے سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کا بغور مشاہدہ کر کے اس کی مختلف تہوں کو کھولتے ہیں۔ ان کی شاعری میں معاشرے کے ہاتھوں ستائی ہوئی لٹی ہوئی عورت کا المیہ بھی ہے اور معاشرتی نشیب و فراز سے پیدا ہونے والے بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مختار نے آزاد نظمیں کم لکھی ہیں۔ انھوں نے پابند اور معرا نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ منیر نیازی، موضوعات اور ہیئت دونوں اعتبار سے اپنے معاصرین سے مماثلت رکھتے ہیں۔ انھوں نے آزاد نظموں کے علاوہ گیت نگاری بھی کی ہے، میرا جی سمیت حلقے کے کئی شعرا نے گیت میں طبع آزمائی کی انھوں نے میرا جی کی طرح ہندی کیفیات کو سمو کر اور ہندی طرز احساس کو بیان کیا ہے۔ ان کے ابتدائی گیتوں میں لہجے کا رچاؤ اور لفظیات کا انتخاب میرا جی جیسا ہے:

کس کس سے ہم پریت نبھائیں
کون سی مورت من میں بٹھائیں
سانجھ سویر یکس کو ڈھونڈنے

اسی نوع کا ایک دوسرے گیت کا نمونہ دیکھیے :

بات تو دیکھو پاگل من کی
چاہ کرے اُس کے جوبن کی
جس کا بسیرا، سیج گگن کا
باتیں دیکھو پاگل من کی

محسن نقوی

بچھڑنے سے ذرا پہلے

خالد شریف

ISBN: 978-93-344-4743-9

بچھڑنے سے ذرا پہلے
تمہیں بھی سوچ لینا چاہیے تھا
کہ یوں چاہت کو ٹھکرایا نہیں کرتے
کہ یوں بیتے دنوں کو بھولنا اچھا نہیں ہوتا
کہ یوں انجان بن کر چین سے جینا ہمارے واسطے
ممکن نہیں ہوگا
تمہیں بھی سوچ لینا چاہیے تھا
کہ وہ باتیں جو ہم اک دوسرے سے کر چکے ہیں
پھر کبھی زندہ نہیں ہوں گی
بچھڑنے سے ذرا پہلے

عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دشمن مرے مرنے کی خبر کو ترسے

رہتے تھے پستیوں میں مگر خود پسند تھے
ہم لوگ اس لحاظ سے کتنے بلند تھے

نہ پوچھ شہر میں رونق ہے ان دنوں کتنی
دھواں دھواں کہیں بارود کی نمائش ہے
سجے ہوئے کسی رہ میں ہیں سر بریدہ بدن
کہیں متاعِ دل و جاں کی آزمائش ہے

سچ تو یہ ہے!
سب فسانے ہیں دنیا داری کے
کس نے کس کا سکون لوٹا ہے؟
سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں
میں بھی جھوٹا ہوں تو بھی جھوٹا ہے

ضمیر جعفری
لوگ کیوں ہم پہ مسکراتے ہیں

 ISBN: 978-93-344-4743-9

جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

ہندوستانی سیاست اور سیاست دانوں پر بھی واہی نے بہت سی نظمیں کہیں ہیں۔اس ضمن میں لیڈری کا نسخہ‘ لیڈر‘ لیبر لیڈر‘ لیڈر کا پروگرام‘ میرے چمچواور نیا ہاتھی قابل ذکر ہیں۔نظم ’’لیڈری کا نسخہ‘‘ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ لوگ آج کل جنہیں فکر معاش ہے
آسودگی زیست کی جن کو تلاش ہے
اس کے عوض کہ جائیں کہیں نوکری کریں
واہی کا مشورہ ہے کہ وہ لیڈری کریں

(۲۰۳)

اور اس مشورہ کے بعد واہی بتاتے ہیں کہ ایک لیڈر میں کون کون صفات وخصوصیات ہونا ضروری ہیں۔مثلاً

ٹھوکر سے اپنی فتنہ ٔ محشر جگائے گا
اور ملک پر عذاب خدا بن کے چھائے گا
تخم ہوس سماج کی کھیتی میں بوئے گا
طوفان بن کے قوم کا بیڑا ڈبوئے گا

(۲۰۴)

’’نئے لیڈر کی دعا‘‘ میں بھی زیادہ تر وہی باتیں ہیں۔جو ’’لیڈری کا نسخہ‘‘ میں ہیں چند تمناؤں کے اضافے کے ساتھ:

تحریر میں چستی دے‘ تقریر میں گرمی دے
جنتا کو جو پھسلا دے اور قوم کو بہکا دے
کرسیٔ وزارت پر اک جست میں چڑھ جاؤں
تدبیر کو پھرتی دے تقدیر کو جھٹکا دے
تھوڑی سی جو غیرت ہے وہ بھی نہ رہے باقی
احساس حمیت کو اس دل سے نکلوا دے
القصہ مرے مالک تجھ سے یہ گزارش ہے
مرغی وہ عنایت ہو جو سونے کا انڈہ دے

(۲۰۵)

اسرار جامعی:

ہندوستان کے اسرار جامعی جو شائقین ادب میں ’’ابوالمزاج‘‘ کے نام سے معروف ہیں۔پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ان کے کلام میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی کاٹ بھی نمایاں ہے۔ظریفانہ شاعری کا مجموعہ ’’شاعر اعظم‘‘ کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔زیادہ تر نظم اور قطعے میں طبع آزمائی کی۔روزمرہ زندگی کے سماجی مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ISBN: 978-93-344-4743-9

اسرار پوچھ بیٹھے یہ لیڈر کی موت پر
آنے کو اور باقی کوئی رشتہ دار ہے
بولے کہ لوگ آگئے ارتھی بھی سج گئی
ٹی وی ''رپورٹروں'' کا ذرا انتظار ہے

(۲)

رئیس امروہوی کے نزدیک اہل پاکستان کی سیاسی زندگی صرف تین لفظوں سے کھیلتے اور دل بہلاتے گزری۔ان جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

منحصر ہے تین نعروں پر ہماری زندگی
انقلاب وہ انقلاب وانقلاب
احتجاج واحتجاج واحتجاج واحتجاج
انتخاب وانتخاب وانتخاب وانتخاب

(۱۷۳)

مرزا محمود سرحدی ایک حقیقت نگار مزاح نگار تھے۔روزمرہ کے واقعات؛ جن سے ان کا واسطہ تھا' وہی ان کی شاعری کا موضوع ٹھہرے۔ان واقعات سے ان کی زود اثر طبعیت ایسی بے ساختگی کے ساتھ مضحک پہلو تراش لیتی تھی کہ ان کی ذہانت وطباعی دونوں کا قائل کر دیتی تھی۔ان کے ہاں سماجی شعور کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

غریب فاقہ کشوں پر ستم ہوئے ہیں بہت
خبر ہے مجھ کو مگر صاف صاف کیا لکھوں
ملوں کے مالکوں سے اشتہار ملتے ہیں
یہ سوچتا ہوں کہ ان کے خلاف کیا لکھوں

(۱۵۸)

تیور دکاندار کے شعلے سے کم نہ تھے
لہجے میں گونجتی تھی گرانی غرور کی
گاہک سے کہہ رہا تھا ذرا آئینہ تو دیکھ
کس منہ سے دال مانگ رہا ہے مسور کی

(۱۱۵)

تبصرے ہوں گے مرے عہد پہ کیسے کیسے
ایک مخلوق تھی میراث رواں چھوڑ گئی
پھونکتی رہتی تھی پیٹرول بھی تمباکو بھی
ہائے کیا نسل تھی دنیا میں دھواں چھوڑ گئی

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

اردو غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات آزادی کے بعد

پروفیسر سید آصف زکریا
پرنسپل چشتیہ کالج، خلدآباد اورنگ آباد
ریفری آینڈ گائیڈ سن رائز یونیورسٹی، الور، راجستھان

اردو شاعری میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کو مسلمہ طور پر جدید رجحانات کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض ناقدین کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو ادب میں جدید دور کا آغاز لاہور میں منعقدہ اردو کی پہلی کانفرنس سے ہوتا ہے اور بعض کے خیال میں سر سید کی ''علی گڑھ تحریک'' نے جدید اردو ادب کی داغ بیل ڈالی۔ بعض دانشوروں کے یہاں ''ترقی پسند تحریک'' کے آغاز یعنی 1936ء کے بعد سے ہندوستانی شعراء کا مزاج بدلا اور بعض اہل قلم نے ''حلقہ؟ ارباب ذوق'' سے اس کا رشتہ جوڑا۔ راقم الحروف کا یہ تاثر ہے کہ اردو ادب میں خصوصاً اردو شاعری میں جب سے روایت شکنی کا رجحان پیدا ہوا تب ہی سے جدید دور کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ ان سارے حالات کی روشنی میں ہم جدید اردو ادب کے اولین معماروں اور علمبر داروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ سر سید کی علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ شعراء سامنے آتے ہیں۔

جن کی مساعی نے اردو ادب میں آنے والے نئے ذہنوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصر قد آور ہستیوں کے قدامت پسند اور محدود رجحاناتی پردے اٹھا کر انھیں وسیع اور عریض میدانوں کی سیر کرائی اور کھلی اور تازہ فضاؤں میں سانس لینے کی راہیں ہموار کیں۔ جدید ادب اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ممتاز شاعر قاضی سلیم اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ:

> ''پے در پے سہاروں کی شکست، فریب اور فریب کا عام سطح کے لوگوں میں اکتاہٹ، بیزاری، جھلاہٹ اور ان کے مظاہر، لاقانونیت، فساد، طالب علموں کی توڑ پھوڑ، سادھوؤں کا ننگا جلوس، ادب میں بھوکی پیڑی، یونی۔ دادی، کو یتا پوست راج، ننگا کنچن جنگا اور پھر کلب کریز ڈرگس، ترپ، چاچا چاچا، عظمتوں کے جھروکے سے جھانکتے ہوئے دانشوروں، کھوکھلے فلسفوں سے چمٹے ہوئے لفظوں کے غلام ایسے میں آج کل کے ادیبوں کی ذمہ داری اپنے پیشتر یا کسی بھی زمانے کے ادیبوں، شاعروں سے مختلف ہے۔ یہی ذمہ داری کا مختلف ہونا جدید ادب کا جواز بھی ہے اور بنیاد بھی''۔
> (''جدیدیت''، مضمون مشمولہ، جدیدیت تجزیہ و تفہیم، مرتبہ ڈاکٹر مظفر حنفی، ص 103)

جدیدیت ایک اصطلاح ہے جس کا چلن 1960 کے بعد ہوا۔ عام طور سے جدیدیت کی تعریف تو یہی کی گئی ہے کہ یہ اپنے عہد کے مسائل یا اپنے عہد کی حسیت کو پیش کرنے کا نام ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جدیدیت کے پس منظر میں وجودیت کی فکری تحریک ہے اور سیاسی بنیادوں پر جدیدیت کی تحریک، ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی۔ ہر رجحان ابتداء میں انحراف، بے سمتی اور تجرباتی دور میں ہونے کی وجہ سے خام کارانہ انداز رکھتا ہے۔

روایتی شاعری جس میں رومانیت کو مرکزیت حاصل ہے، آج بھی دلوں کو گرماتی اور خوابیدہ ذہنوں کو بیدار کرتی ہے۔ ہر جدید شاعر کے یہاں اس رنگ میں دو چار نہیں بلکہ بے شمار اشعار مل جاتے ہیں۔ لفظیات کی ترتیب اور اسلوب بیان پر اگر چہ کہ قدرت پائی جاتی ہے لیکن مفہوم کے پردے میں وہی بات نظر آتی ہے، جو قدامت پسند شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پرانے شعری مجسمے کو نیا لباس پہنا کر اور خوب سجا کر نئے روپ اور نئے رخ سے پیش کیا جا رہا ہے جو قاری کو راست بھی اور بالواسطہ بھی متاثر کر رہا ہے۔ موجودہ شعری آہنگ چونکہ غنائیت کو راست پیش کرنا نہیں چاہتا اس لئے جدید استعاروں، کنایوں اور تشبیہات و لفظیات کے ذریعے اپنا مدعا پیش کر رہا ہے جس کو فوری سمجھنے سے عام قاری کا ذہن معذور ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

 ISBN: 978-93-344-4743-9

مرزا غالب

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مولانا محمد علی جوہر

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر تقی میر

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

کلیم عاجز

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

میاں داد خان سیاح

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ابراہیم ذوق

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

علامہ اقبال

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

فراق گورکھپوری

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

مومن خان مومن

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا، کیا کرے

محمد رفیع سودا

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

مادھورام جوہر

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

بہادر شاہ ظفر

کانٹے تو خیر کانٹے ہیں ان سے گلہ ہے کیا
پھولوں کی واردات سے گھبرا کے پی گیا
ساغر وہ کہہ رہے تھے کی پی لیجیئے حضور
ان کی گزارشات سے گھبرا کے پی گیا

ساغر صدیقی

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

علامہ اقبال

دن کٹا، جس طرح کٹا لیکن
رات کٹتی نظر نہیں آتی

سید محمد اثر

تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب
اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا
میرے سنگ مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے، یا استاد

میر تقی میر

آج کا جدید شاعر آگے بڑھنے کا عزم رکھتا ہے پیچھے مڑ کر دیکھنا اس کے مذہب میں کفر ہے۔ ہر نیا ذہن بیداری کا درس لے کر اٹھتا اور آگے بڑھتا ہے۔ وسیع عزائم، بلند حوصلگی اور عصری شعور ان کے یہاں بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود بھی جدید شعراء نے سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم مثلاً انتھراپولوجی اور سوشیالوجی وغیرہ سے خاطر خواہ اکتساب فیض نہیں کیا جتنا کرنا چاہئے تھا ممکن ہے کہ آنے والے وقتوں کے جدید معمار اس کمی کو پورا کریں۔

جدید شعراء کے یہاں روایتی شاعری سے نہیں بلکہ فرسودہ شاعری سے بغاوت کا میلان نظر آتا ہے، جو بے جان اور مہمل ہے اور جو جذبے اور احساس کی بیداری سے عاری ہے۔ روایتی شاعری کے بعض مخصوص لفظیات جیسے عشق، محبت، دیدار، آنسو، وفا، محبوب، زلف، انگڑائی، نزاکت، حسن، گل و بلبل، جنون، قفس، برق و آشیاں، حسرت، شراب، جام، مئے خانہ، ساقی، رند، پژمردگی، شکست، احساس کمتری، ناامیدی، مایوسی، شکوہ، گلہ، آہ، نالے، فغاں، فریاد، تنہائی، چلمن، پردہ، نقاب، کوٹھا، زاہد، طوائف، آئینہ، تصور، خزاں، بہار، خار، عکس، دربار، حرم سرا، جبر حیات، اکتاہٹ، بے بسی ناکامی، محرومی وغیرہ وغیرہ، آج کے جدید دور میں کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں شعراء کے سامنے زندگی کی قدر، کھیت، کھلیاں، کسان، صنعتیں، مزدور، قید، پھانسی، بغاوت، خون، قتل جنگ، سمندر، طوفان، ہل بان، انقلاب، چٹان، آندھی، موسم، برسات، بسنت، سورج، دھوپ، آواز، آگ، سایہ، عمارت، شجر، پتھر، دیوار، شہر، جنگل، ریت، بازار، سناٹا، سائنس،

ٹکنالوجی، سیاست، اولوالعزمی، جواں مردی، ارادہ، قوت، جرم، سزا، دار، چیخ وغیرہ وغیرہ جیسے عنوانات ہیں۔

جس طرح قدیم شاعری میں فرسودہ اور مہمل شاعری کی مخالفت کی گئی اسی طرح آزادی کے بعد جدید شاعری میں بھی مخالفت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جدید ادب میں جدید لفظیات کے استعمال کے علاوہ بعض جدید اصناف کی ہیئتی ترکیبوں پر بھی اعتراض کیا جار ہا ہے۔ دو الگ الگ تحریکیں اوران سے وابستہ شعراء دو زمروں میں منقسم ہو گئے، جس کی مثالیں ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی شکل میں ہمارے سامنے آئیں۔ مجموعی طور پر جدید شاعری کے میلانات کا ہر سمت سے پُر جوش استقبال کیا جانے لگا جو تھکے ہوئے ذہنوں کو بیدار کرنے میں بڑے مدد و معاون ثابت ہوئے۔ نئے شاعر اور اس کے عصری شعور اور حرکیاتی پہلوؤں پر انیس ناگی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے

''نئے شاعر کے لئے آمد اور آورد کے امتیازات ختم ہو چکے ہیں، اس کے یہاں آمد ایک ڈھکوسلا ہے۔ اس کی شاعری، شعور کی پیداوار ہے۔ وہ معاشرے کا ایک ذمہ دار رکن ہے اور اپنے اردگرد سائنسی دنیا میں حیرت انگیز تغیرات محسوس کر رہا ہے۔ اس کا شعور ہم عصر حالات اور واقعات کا احساس رکھتا ہے''۔

(''بغیر معذرت کے''، مشمولہ جدیدیت تجزیہ و تفہیم، مرتبہ ڈاکٹر مظفر حنفی، ص 127)

جدید شاعری میں شاعر نے اپنا انفرادی احساس و اظہار کا ایک الگ معیار مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے اس احساس و اظہار کے لئے نئے نئے لفظیات (Diction) کا تعین کیا گیا اور اس طرح نئے نئے استعارے بھی وضع کئے گئے۔ جدید شعراء میں بعض مخصوص مقامات پر انگریزی الفاظ کے استعمال کا رجحان بھی ہمیں ملتا ہے۔ اسی طرح اینٹی غزل کا رجحان بھی جدید شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ اینٹی غزل اور اس کے تجربے پر پروفیسر محمد عقیل رضوی نے اپنی رائے اس طرح دی ہے

''پرانے الفاظ، علائم، تشبیہات، استعاروں اور لہجے کی سطح مسلسل استعمال سے گھس کر چکنی ہوگئی ہے۔ اس لئے وہ سطح جدید غزل کے لئے کارآمد نہیں۔ جدید غزل کو اپنے تمام سانچوں اور وسیلوں کو بدل کر ایک نیا قالب بنانا ہے اور یہی قالب غزل کا نیا سانچہ اور جدید آہنگ ہوگا۔ اس نئے آہنگ اور سانچے کو صحیح طور پر اپنانے کے لئے پہلے جدید غزل کو مروجہ رنگِ تغزل کی نفی کرنی ہوگی جیسے اینٹی غزل کا تجربہ کیا گیا''

(نئی علامت نگاری ص 111)

اردو غزل میں ہمیشہ ہی نوع نوع موضوعات اور رجحانات دخیل ہوتے رہے ہیں اردو نے انگریزی کا اثر قبول کرتے ہوئے ماڈرن اور پروگریسیو مزاج کو بھی اپنایا اور رومانویت اور تانیثی ادب کو بھی جگہ دی ازادی کے بعد غزل نے کئی کروٹیں لی اور روایت ترقی پسندیت اور جدیدیت کے ساتھ ساتھ مابعد جدیدیت اور تانیثی ادب کو بھی جلا بخشی۔

اتنی ساری تبدیلیوں کے بعد بھی غزل اپنے بیسک فارم میں موجود ہے اج بھی روایت یا غزلیں کہی جاتی ہیں ترقی پسند تحریک تو ختم ہو چکی ہے لیکن اس کے اثرات اب بھی کہیں کہیں کسی نہ کسی شہر میں محسوس ہوتے ہیں۔ جن میں لہو سرخ رنگ افتاب جاں فشانی جاں نثاری جوش وولولہ صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے جو ترقی پسند تحریک کی بنیاد رہے ہیں۔

جدید غزل اپنے استعارہ و علامتوں کے پیرائے میں خوب چمکتی رہی اور اب بھی چمک رہی ہے اس عہد کے اکثر شعرا جدید غزل کا پیرایا اپنا کر اپنے مافی الضمیر کو ادا کر رہے ہیں۔ جدید غزل کے نامور شعراء میں بشیر بدر راحت اندوری، منیر نیازی وحید اختر شاز تمکنت سدرشن فاخر ظفر گورکھپوری امجد الاسلام امجد کیف بھوپالی جاوید اختر افتخار عارف کلیم عاجز شہر یار شاید شکیب جلالی جان ایلیا جیسی بے شمار شخصیات میں شامل ہیں۔

ترقی پسند شعرا میں علی سردار جعفری کیفی اعظمی مخدوم محی الدین احمد ندیم قاسمی حبیب جالب فیض احمد فیض مجاز لکھنوی ن۔م راشد میرا جی جیسے بڑے بڑے شعراء شامل رہے ہیں۔ روایت پسند شعرا میں ازادی کے بعد حفیظ جالندھری فراق گورکھپوری خمار بارہ بنکوی ناصر کاظمی مجروح سلطان پوری قتیل شفائی اور دیگر نے بھر پور انداز میں حسن و عشق کے پیکر تراشے۔

اس کے بعد مابعد جدیدیت کا زمانہ ایا جس میں شدت احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اظہار یہ اور بیان انداز میں شاعری کو اسان بنانے کی کوشش کی گئی راست تاثر پیدا کرنے کے لیے اور جذبات کی ہے جانے کیفیت کو بڑھانے کی بھر پور کوشش کی گئی کہ شاعری میں اضطراب بہت زیادہ ہے۔ جون ایلیا، منور رانا، راحت اندوری، ندا فاضلی، احمد فراز کیسے بہت سے شعراء کے نام شامل ہیں۔

 ISBN: 978-93-344-4743-9

تانیثی ادب میں پروین شاکر حنا تیموری کشور ناہید، زاہدہ زیدی اور فہمیدہ ریاض جیسی بہت سی خواتین شاعرات شامل ہیں۔آزادی کے بعد غزل کا موضوع بدل گیا اور وطن سے ازادی حاصل کرنے کی جدوجہد نے ازادی حاصل کر لینے کے بعد اپنے موضوعات کو تبدیل کرنے میں اپنی سلامتی سمجھی لیکن ترقی پسند ادب میں یکسانیت اور پر جوش والے کے ایک جیسے اشعار کی وجہ سے اس نے اپنی کشش کہیں نہ کہیں کھودی تھی اور سماج میں بڑھتی بے روزگاری بھوک مری غربت نے نئی تحریک کو جنم دیا سن 1956 سے لے کر 60 کے درمیان ایک نئی تحریک کا جنم ہوا جی سے جدید غزل کہتے ہیں یا جدیدیت کہتے ہیں۔

کا دور 1980 سے شروع ہوا۔کہانی سی ادب 1975 کے اس پاس اپنا وجود درج کراتا ہے۔غزل سے روایت کا چولا اتارنے کا اعزاز غالب حالی اور محمد حسین آزاد کو حاصل ہے۔اقبال نے حالی کا ساتھ نبھایا۔حفیظ جالندھری، اکبرالہ آبادی اور نئے شاعروں نے کھل کر نئے رجحانات کو قبول کیا۔آزادی کے بعد رجحانات نے نئی کروٹ لی نئے رجحان میں روایت سے سب سے پہلے ترقی پسندوں نے انحراف کیا یہ 1936 کی بات ہے اور جدید غزل نے 1960 میں ترقی پسندیت سے انحراف کیا اور ادب میں نئے راستے نکالے گئے۔ترقی پسند شاعری کے چند نمونے ملاحظہ کریں:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض احمد فیض

جہاں پھولوں کی خوشبو بک رہی ہو
مجھے ایسے چمن سے دور لے جاؤ
جہاں انساں کو سجدہ روا ہے
مجھے ایسے وطن سے دور لے جاؤ

احمد ندیم قاسمی

ہمیں ہے علم کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیر نہیں اجالا ہے

ظہیر کاشمیری

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

اسرار الحق مجاز

یہ محلو ں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

ساحر لدھیانوی

ISBN: 978-93-344-4743-9

جدید غزل بہت جلد عوام کے دلوں پر راج کرنے لگی اس کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ جدید غزل جھوٹے خواب نہیں دکھاتی تھی بلکہ وہ عوام الناس کے درد کی ہو بہو تصویر بیان کرتی تھی۔اس غزل میں علامتیں تھیں۔جدید اور ٹھوس استعارے اور تشبیہات تھیں۔ان میں احساس کی ہلکی آنچ تو تھی ہی لیکن درد والم کا گہرا احساس بھی تھا۔جذباتوں کی جولانیاں بھی تھیں اور کروٹ کروٹ درد سہنے کا اضطراب بھی۔بہت ہی متنوع انداز میں جدید غزل نے آزادی کے بعد عوامی توقعات کو مجروح نہیں کیا بلکہ بس اسکی تصویر سامنے رکھ دی جس سے متاثرہ سماج کو محسوس ہوا کہ ان کا درد شیئر کیا جا رہا ہے۔

جدید غزل نے برق رفتاری سے مقبولیت حاصل کی اس نے حسن خیال کے ساتھ پیکر تراشی پر تہہ داری پر کام کیا۔لفظیات میں مادیت اور روکھے پن کو جگہ دی گئی یہ لفظ اپنے اندر گہرائی بھی رکھتے تھے اور گیرائی بھی رکھتے تھے۔

غم جاناں اب غم جہاں بن چکا تھا عشق مجازی کی جگہ بھوک اور یتیمی لے چکی تھی۔محاوروں کو طرح طرح سے شاعری میں استعمال کیا جانے لگا تھا غزل زندگی کی فلم بن کر زبان زد ہو رہی تھی تجربات زندگی اشعار میں ڈھل رہے تھے بے بسی بے راہ روی حسیات کا ادھورا پن غزل میں ڈھل رہا تھا سیاست کی ناکامی مذہبی اخلاقیات کے کھوکھلے دعوے اقدار کی پامالی اقتدار کی جنگ میں انسانیت کی مجروحیت جدید غزل کی زینتیں بن چکی تھیں۔

نئی غزل کا جو انداز اور رنگ نمایاں ہوا وہ وقت کے ساتھ روشن تر ہوتا چلا گیا ہے۔آج صورت حال یہ ہے کہ جدید غزل لکھنے والوں میں منیر نیازی، ناصر شہزاد، کرشن ادیب، باقی صدیقی، ریاض مجید، افتخار نسیم، شہر یار، انور شعور، بانی، محمد علوی، آزاد گلاٹی، مظفر حنفی، ہیرانند سوز، صبا اکرم، اکبر حمیدی، شاہد شیدائی، عباس رضوی، اقبال ساجد، حیدر قریشی، اسلم کولری، احمد مشتاق، نصیر احمد ناصر، افتخار عارف، جلیل عالی، انور سدید، حامدی کاشمیری، نسیم سحر، حسنین مجروح، منیر سیفی، غلام جیلانی اصغر، خورشید رضوی، رفیق سندیلوی، اظہار شاہین، مبین مرزا، اظہر نفیس اور اختر ہوشیار پوری کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں مگر ان کے علاوہ بھی ایک خاصی بڑی تعداد ایسے شعراء کی ہے جو معیار کی بلندی اور موضوعات کے تنوع کے حوالے سے کسی طور پر بھی ان سے کم مرتبہ نہیں ہیں۔

تخلیقی صلاحیتوں میں تنوع اور افکار، احساسات و تجربات شامل ہوتی جا رہے تھے جدید غزل انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور رابطوں کے مطلبی پن کو واضح انداز میں بیان کر رہی تھی انسان کے اندرون کے خالی پن اور زندگی کی بھیڑ میں تنہا کھڑے رہنے کے احساس کو نئی آگاہی کے ساتھ بیان کر رہی تھی۔زندگی کے فلسفوں کے بڑے بڑے محل زمین دوز ہو رہے تھے زندگی کے مسائل اور ماحول پر جدید شعراء نے جم کر جوتے برسائے۔

ذہن کے تاریک گوشے سے اٹھی تھی اک صدا
میں نے پوچھا کون ہے اس نے کہا کوئی نہیں
گھر سے چلا تو چاند مرے ساتھ ہو لیا
پھر صبح تک وہ میرے برابر چلا گیا
مجھے پہچان لو اس خاک و خوں میں
میں صدیوں بعد پھر ظاہر ہوا ہوں
شہر میں ہے کون واقف میرے خد وخال سے
کس نے دیکھا میرا چہرہ میری مٹھی کھول کر
ترچھے سورج کی شعاعیں دے گئیں اک ہم سفر
میرا سایہ ہی میرے قد کے برابر ہوگیا
سائے کی طرح ساتھ چلے گی کوئی صدا
سنسان جنگلوں میں اکیلے بھی جا کے دیکھ
مجھ میں جو رہتا ہے اپنی فکر کرے وہ

ISBN: 978-93-344-4743-9

میرا کیا ہے میں تو اک دن مر جاؤں گا
کنار آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی
گماں گزرتا ہے یہ شخص دوسرا ہے کوئی
دل کے ملبے میں دبا جاتا ہوں
زلزلے کیا میرے اندر آئے
مجھ کو اک قطرہ بے فیض سمجھ کر نہ گزر
پھیل جاؤں گا کسی روز سمندر کی طرح
آنگن آنگن سناٹا ہے گلی گلی سنسان
کس آسیب کے سائے سے ہے ہر بستی ویران
سہج سہج انگنائی میں
ننگے پیر ٹہلتی دھوپ
بدن دریدہ میں جب جنگ جیت کر لوٹا
تو مجھ کو دیکھ کے دربند کر لیا اس نے

اس کے بعد مابعد جدید دور آتا ہے اس دور میں غزل کے احساسات کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے اور جذبات کی ترجمانی میں نفسیاتی کرختگی اور شدت کو جگہ دی جاتی ہے اب یہاں غزل احساسات وجذبات کے تموج میں اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں انسان کا خالی پن اسے سائے کی بنا تا ہوا نظر اتا ہے بچے اپنے والدین اور والدین اپنے بچوں سے اعلی نظر اتے ہیں لیکن مابعد جدیدیت مایوسی کی علمبردار نہیں ہے بلکہ وہ پر امید ہے وہ ڈوبتے ہوئے انسان کو سہارا دیتی ہے اس میں علامتوں کا ہلکا پن ہے لیکن معنویت کی گہرائی ہے۔

۱۹۸۰ کے وسط کی دہائی میں اردو شعراء کا ایک نیا قافلہ نظر آیا جو مابعد جدیدیت کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ان کے یہاں اردو شاعری کے شاعرانہ مزاج اور سخن وارانہ رویوں اور اظہار رایک نمایاں تبدیلی بھی آئی۔جس میں بے اطمینانی، بے چینی، لاچاری، تجسس، انحراف۔وجود کی تردید اور ماحولیاتی بیزاری نمایاں ہے۔اور تبدیل ہونے والے ارضی اور فکری خیالات میں ایک انفرادی تشخص اور نئی معاشرتی عملیات کو روشناس کروایا۔مگر مابعد شعرا کے یہاں شناخت کا بحران کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔وہ اپنی فکر اور جمالیاتی تہذیب سے اپنی پہنچاں اور ترجیحات کو سامنے رکھتے ہیں۔اور اس سے ان کے شعری اور جمالیاتی ادراک کی معنویت مختلف نظر آتی ہے۔اردو کے مابعد شعرا کے یہاں اسلوب تبدیل ہوتا بھی نظر آتا ہے اور شعری ہیت اور فکری رسائی کے علاوہ داخلی اور معروضی واردات بھی مختلف اور رنگا رنگ ہے۔اور یہ شاعری حاکمیت اور اقتدار پسندی سے دور نظر آتی ہے۔اردو شاعری میں مابعد جدید اظہار کی خوشبودار پھول دکھائی دیتا ہے تو کہیں یہ مرجھایا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔اور جنہوں نے اپنے منفرد لہجے سے اُردو غزل کو ایک نیا رنگ وآہنگ عطا کیا اور اسے اظہار کے نئے امکانات کی نوید دی۔ان کی شاعری ہنوز اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی ہے۔ظفر اقبالؔ، ساقی فاروقیؔ، شہریارؔ، حامدی کاشمیریؔ، فرحت احساسؔ، شہپر رسولؔ، منور راناؔ، فصیح اکملؔ، ندیم صدیقیؔ، ، رسول ساقی، شجاع خاور نظام، عاصم شہنواز شبلی مختار احسن انصاری، نظام حائف، مہتاب حیدر نقوی، مجاز نوری، عشرت ظفر، زیشان ساحل، انور خالد، نصیر احمد ناصر، جاوید اقبال ستار، شائستہ حبیب، احمد محفوظؔ، ، راشد طراز، شگفتہ طلعت سیما، عرفان صدیقیؔ، اسعد بدایونیؔ وغیرہ وہ قابل ذکر نام ہیں جن کے یہاں زبان وبیان کا سلیقہ تکنیکی اور فنی عناصر کا حسن کارانہ استعمال اور تخلیقی رچاؤ نمایاں ہے۔مثال کے لئے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے

گھر بھی جاکے کرتے ہیں کام، کام اپنے دفتر کے
پتھروں میں رہ رہ کر ہوگئے ہیں پتھر کے
افصل گوہر
نفرتوں کی آگ میں ہر شت فنا ہو جائے گی

 ISBN: 978-93-344-4743-9

بعد اس کے، ہرطرف بس ایک دھواں رہ جائے گا

عالیہ

اس پرندے سے معنی ہجرتوں کا پوچھیے ہیں
کانپتی ٹہنی پی جس نے آشیاں رہنے دیا

آزادگلاٹی

یہ نشانہ بھی خطا ہوجاتا تو بہتر ہوتا
آخری تیر نہ لگتا تو میں پتھر ہوتا

عبداللہ کمال

صدائیں دون تو کسے دوں ہے رائیگاں سب کچھ
غم دروں بھی نہیں خندہ طلب بھی نہیں

کرشن کمارطور

صدیوں کی قیمتوں کب تک چکائیں لمحے
سارا اثاثہ نذر اجداد ہوگیا ہے

عمران عظیم

گرچہ کے نئے دور کا ادمی 21 ویں صدی میں داخل ہو چکا ہے لیکن نیا عہد نئے مسائل لے آیا ہے۔اس زندگی میں غضب کی جدوجہد ہے ہر انسان اپنا وجود منوانے پہ تلا ہے ہر کسی کو اپنی بلندی اپنا نام اپنی پہچان کا تعین کرنا ہے اس غزل نے کوشش کی ہے کہ عام انسان کو خود سے باندھے رکھے بہت سے شعرا نے عشق کے پیرائے میں جدید مسائل کو بیان کیا ہے جبکہ بہت سے شعرا نے لفظیات میں شدت احساس کی تلاش کی ہے نئی شاعری میں خون بہتا ہے رستا ہے اور اس کے رنگ میں شوخ پن بھی ہے نئے زمانے کا کریہہ چہرہ رخسار پہ گہرے زخم ہی نہیں سہتا بلکہ ان زخموں پر دھاردار کانٹوں کی چبھن کو بھی محسوس کرتے ہیں۔گرچہ کے 1947 کے بعد غزل نے کئی چہرے بدلے ہیں لیکن اپنے فارم اور تکنیک کے لحاظ سے غزل اج بھی وہی غزل ہے جس نے میر کو میر اور غالب کو غالب بنایا اپنی اسی تکنیک اور پیرائے کے سبب اس کے کافی اور ردیف اج بھی اپنے قاری کو مسحور کیے ہوئے ہے۔غزل ترقی پسندیت کے کھیتوں میں امید بہار رکھتے ہوئے اپنے خوشہ گندم کے حق تیقن دلاتی ہے اس کے لیے لڑنا سکھاتی ہے جدید غزل اسی کھیت کے بنجر پن اور غیر ابج کو درشاتی ہے۔اس کھیت کا کسان بھوکا بھی ہے اور قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا بھی اس کے گھر میں چراغ نہ ہونے سے تاریکی بچھائی ہوئی ہے اور اس کے بچوں کی بھوک نے اس کو ذہنی ابتلا میں پریشان بھی کر رکھا ہے ماں باپ جدیدیت اس کھیت میں بنجر پن کو محسوس کر کے اس میں کسان کے پیر میں کانٹا چباتی ہے وہ کانٹا کسان کے گلے کا پھندا بھی بن جاتا ہے کسان کے بیٹے بلکتے ہیں گھر کو اگ لگ جاتی ہے مگر کھیت سلامت ہے اور اب بھی امید ہے زرخیزی موجود ہے اور کسان کے بیٹے محنت مزدوری کر کے اس کھیت کو دوبارہ سینچتے ہیں اور اس میں سونے کی فصل لہلاتی ہے۔

غرض کے آزادی کے بعد غزل نے کئی سارے رجحانات میں خود کو زندہ تابندہ رکھا لیکن وہ افکار ونظریات کے گلیاروں میں کھوئی نہیں تباہی اور تنزل سے محفوظ رہی۔اس نے اپنے سننے والے چہروں چہروں پر مسکراہٹیں بکھیری اور ان کے ہاتھوں سے واہ واہی کی دادیں بھی وصول کیں۔ 21 ویں صدی میں غزل اپنے چاہنے والوں کا حلقہ بڑھا رہی ہے اور دن بدن مقبولیت کی نئی اونچائیوں کو چھو رہی ہے۔

☆☆☆

غزل: اُردو آہنگ کا مراٹھی پیرایہ

ڈاکٹر قریشی عتیق احمد عبدالقدوس
اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اُردو
این کے ایس پی ٹی۔آرٹس، سائنس و کامرس کالج
بدنا پور ضلع جالنہ (مہاراشٹر)

اردو ایک خالص ہندستانی زبان ہے شمال سے جنوب تک مشرق سے مغرب تک اردو کا جغرافیائی حصار تنا ہوا ہے۔تاریخی ادوار کے اعتبار سے مسلمانوں کی آمد نے اردو کے مراکز کا تعین کیا تو لسانی حد بندیوں میں اردو وہ واحد زبان مانی جاتی ہیں جس نے ہندستان میں لکھی، بولی،اور سمجھی جانے والی ہر زبان کی مشترکہ ساجھے داری سے اپنی بنیادو کو استوار کیا ہیں۔لسانی اعتبار سے اردو کی بنیادیں جس طرح ہر ہندستانی زبان سے جڑی ہیں اسی طرح اردو ادب بھی ہندستانی ادبیات کے خمیرہ کا ایک حصہ ہے۔اردو زبان اور ادب پر عربی فارسی زبانوں کا بڑا واضح اثر دکھائی دیتا ہے لیکں اردو زبان و ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے آپ کو خالص ہندستانی رنگ میں رنگا ہے۔اردو کا کوئی ادبی فن پارہ خواہ کسی دوسری ادبیاتی جہاں کی دین ہو لیکن جب اس نے اردو ادبیات کے دامن میں آنکھ کھولی تو اس فن پارے نے اردو ادبیات کے حوالے سے ادبیات عالم کو متاثر کیا۔جس کی ایک مثال اردو غزل ہے۔

اردو ادبیات میں غزل ایک ادبی فن پارہ نہیں بلکہ ایک جادو کا نام ہیں جس نے عالم ادبیات میں ہر شعری تخلیق کو متاثر کیا ہے۔یہی اثر ہندستان کے جنوبی خطہ مہاراشٹر میں بولی جانے والی قدیم ترین زبان مراٹھی پر بھی ہوا۔میں اپنے اس موضوع غزل کی نئی بستیاں کے حوالے سے غزل کی اس نئی بستی کا تذکرہ کرنے جا رہا ہو۔

مراٹھی زبان میں کلاسیکی دور سے ہی شاعری کے نقوش ملتے ہیں۔مراٹھی زبان و ادب کے کلاسیکی شعراء میں سنت ایکناتھ،سنت نامدیو،سونا مہاراج اور سنت گیانیشور وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے جن کی مراٹھی زبان میں کہی گئی شعری تخلیقات مراٹھی تہذیب و ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

ہندوستان کے مختلف خطوں اور علاقوں میں زبانوں اور بولیوں کے اختلاف کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ، اصناف ادب اور لوگ گیت بھی الگ الگ نظر آتے ہیں۔اگر گجرات میں ڈانڈی اور پنجاب میں بھانگڑا ہے تو مہاراشٹر میں لاونی اور پواڑہ جیسی روایتی تہذیبی فنون کی مثالیں موجود ہیں۔

مراٹھی زبان و ادب کی اپنی مخصوص علاقائی فنی و ادبی روایات اور خصوصیات ہیں۔مراٹھی زبان کی شعری اصناف میں سنت کاویہ (صوفیانہ شاعری)،بھکتی بودھ کاویہ (مذہبی شعری صنف)،لوک گیت، پوواڑہ (شیواجی کی بہادری کے واقعات پر مشتمل شاعری)،مکت چھند (آزاد نظم) اور گزل (غزل) وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

مراٹھی زبان و ادب کی شعری اصناف ایک مستقل تاریخ و روایت کی حامل ہے۔مراٹھی ادبی روایت میں غزل ایک مختلف النوع قسم کی صنف ہے کیونکہ مراٹھی زبان کی شعری اصناف میں غزل سے قبل کوئی بھی شعری صنف غزل کی مماثلت کرتی نظر نہیں آتی۔مراٹھی ادب میں غزل اکیسویں صدی کے نصف آخر سے داخل ہوتی ہے اور بالخصوص ساتویں دہے میں غزل کے نمایاں نقوش نظر آتے ہیں جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مراٹھی زبان و ادب میں غزل ایک نومولود صنف ہے اور اجمالی طور پر اُردو غزل کی بنیادوں پر استوار ہے۔مراٹھی غزل پر ہیئت و روایت کے اعتبار سے اُردو غزل کا پورا عکس نظر آتا ہے۔

موجودہ زمانے کی مراٹھی غزلوں میں اُردو کے اثرات نمایاں طور پر نظر آجاتے ہیں اُن میں سے چند کا ذکر کیا جا رہا ہے :

۱) مراٹھی زبان میں غزل کا کوئی متبادل لفظ نہیں ہے اس لئے اس صنف کو مراٹھی میں بھی غزل ہی کہا جاتا ہے۔
۲) مراٹھی غزل کی ہیئت و ساخت اُردو غزل کے مثل ہے۔
۳) مراٹھی غزل کے عنوانات اور موضوعات اُردو غزل ہی پر استوار ہیں۔
۴) اُردو غزل کی طرح نغمگی اور ترنم کے لیے مراٹھی غزل میں بھی ردیف، قافیہ اور اوزان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ISBN: 978-93-344-4743-9

۵) اُردوغزل کی طرح مراٹھی غزل میں بھی لفظیات واصطلاحات اورتشبیہ واستعارات کا بھرپوراستعمال کیا جاتا ہے۔
۶) مراٹھی غزل کا ہرشعراُردوغزل ہی کی طرح ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔
۷) مراٹھی غزل میں اُردوغزل کی طرح مطلع،حسن مطلع اور مقطع وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالاخصوصیات کے ساتھ مراٹھی غزل،اُردوغزل گوئی کے نقش قدم پر کہی جارہی ہے،معاصر مراٹھی غزل گوشعراء میں سریش بھٹ،سریش واڈ کر، پانچاڑ، ستیش پاٹل،اقبال منّے،الٰہی جمعداراور جبارپٹیل وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

اس موقع پرمراٹھی غزل کے چنداشعاربطورنمونہ پیش خدمت ہیں :

ایک ارادہ ہنسنیاچا ان وروادھات دنیا ساری
آنی نبھا شی کشا نیا چا اتکیا چھوٹیاں تکراری
(ویبھو جوشی)

ایک کویتا لیہنی میہتو ، شبدا مدھیہ نہ ماوناری
کاڑ جا چا ٹھاو گھیت منا منا لا بھاو ناری
(نامعلوم)

کیہوا تری پہاٹے الٹون رات گے لی
مٹلے چوکون ڈوڑے ہرون رات گے لی
اتا کو شیت ناہی تی چندر کور ماجھی
ہل کیچ کوس ما جھی بدلون رات گے لی
(سریش بھٹ)

خلاصہ کلام یہ کہ مراٹھی زبان جہاں اپنی کلاسیکی شاعری کا بیش بہا سرمایہ رکھنے کے باوجوداُردوغزل کے جادو سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکی،اور یہ شاید نہیں بلکہ یقیناً اُردوغزل کی جاذبیت کا نتیجہ ہے۔آج مراٹھی غزل اپنی ایک الگ شناخت بنا کرفنی وتکنیکی اعتبار سے اردوغزل کے مطابق کہی جارہی ہے،اب تک مراٹھی شعراء اپنا تخلص نہیں رکھا کرتے تھےلیکن اُردوغزل کے زیراثر مراٹھی زبان کے شعراء بھی اپنی غزلوں میں تخلص استعمال کرنے لگے ہیں البتہ قابل ذکرفرق اردواور مراٹھی غزلوں میں یہ دکھائی دے گا کہ اُردوغزل کوکوئی عنوان یا موضوع نہیں دیا جاتا جب کہ معاصر مراٹھی غزلیں بعنوان کہی جارہی ہیں اور مراٹھی غزل کے یہ عنوانات یا تو اسی غزل کے مرکزی خیال سے اخذ کیے جاتے ہیں یا پھر غزل کا کوئی ایسا مصرعہ جوغزل کے نزول کا سبب بنتا ہے اسے ہی مراٹھی شاعراپنی غزل کا عنوان بنالیتا ہے۔

اسی لئے آج مراٹھی زبان میں صنف غزل نہایت تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل کرتی جارہی ہے اور ذرائع ابلاغ کی معرفت اسے عوام وخواص تک پہنچایا جارہاہے۔۔مراٹھی زبان کی ویب سائٹ : مائےمراٹھی ڈاٹ کام www.mymarathi.com سے مراٹھی غزلوں کے بہترین نمونے دیکھنےکومل سکتے ہیں۔

۱) اردوغزل کا تکنیکی،ہیتی وعروضی سفر؛۔ڈاکٹرارشدمحمودناشاد
۲)اردوغزل ؛ ۔ ڈاکٹریوسف حسن خان
۳)'غزل' (بزبان مراٹھی) : ڈاکٹرسریش چندرناڈکرنی
۴)مراٹھی زبان کی ویب سائٹ : مائےمراٹھی.کام www.mymarathi.com

☆☆☆

اردو شاعری کے بدلتے رجحانات
جے۔ پی سعید کی شاعری کے فن کے حوالے سے

ڈاکٹر محمد انورالدین
صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے نسواں
حسینی عالم، حیدرآباد

دکن کا علاقہ ازمنہ قدیم ہی سے شعرا و ادبا کے لیے زرخیز ثابت ہوا ہے؛ یوں بھی اردو شاعری دکن ہی کی مرہونِ منت ہے۔ چناں چہ یہ علاقہ آزادی سے پہلے جتنا وسیع و عریض تھا، آج آزادی کے تقریباً چھہتر برس بعد بھی اتنا ہی سخن نواز و سخن پرور رہا ہے۔ یہاں دکنی حکمرانوں نے شاعروں کی خوب پذیرائی کی اور انھیں اپنے عہد کے ملک الشعرا جیسے خطاب سے سرفراز کرتے رہے۔ ماضی میں اورنگ آباد دکن سے جن شعرائے کرام نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے، ان میں ولی اورنگ آبادی سراج اورنگ آبادی، حمید اورنگ آبادی، داؤد اورنگ آبادی، سکندر علی وجد کے بعد بلا شبہ علامہ جے۔ پی سعید کا نام لیا جا سکتا، ہے۔ جے۔ پی سعید کے ذکر کے بغیر شہر اورنگ آباد کی تاریخ مرتب ہو یہ ممکن نہیں۔ اگر ہم انھیں اورنگ آباد دکن کے شعرا کا امام مان لیں تو یہ ان ادب نواز و سخن پرور ہستی کے حق میں حقیقی خراج تحسین متصور ہوگا۔

جے۔ پی سعید کا نام ایک درخشاں ستارے کی مانند منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل انسان تھے۔ دنیا انھیں ایک عظیم معلم اور کہنہ مشق استاذ شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ آج ہم اردو شاعری کے بدلتے رجحانات کی روشنی میں آزادی کے بعد کی ایک اہم شخصیت، میری مراد ہے۔ پی سعید کی شخصیت اوران کی شاعری سے ہے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے افکار بلیغ کو اپنی تصانیف میں جمع کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ واقعی شاعری خون جگر کی متقاضی ہوتی ہے۔

جے۔ پی سعید کے کلام کے مطالعے کے بعد یہ بات عیاں راچہ بیاں ہو جاتی ہے کہ شاعر اپنے افکار کو اپنے خون جگر سے سینچتا ہے اور جب وہ افکار خامہ و قرطاس کے وسیلے سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں تو فضائے شعر و سخن انگیں ہو کر شش جہت میں مٹھاس گھول دیتی ہے۔ جے۔ پی سعید کی شاعری محض لفظوں کی شاعری نہیں بلکہ جذبات کی شاعری ہے۔ انھوں نے جو محسوس کیا رقم کیا، جو ان پر گزری وہ بیان کیا، جو سوچا تحریر کیا، ان کی شاعری تصنع سے عاری تملق سے ماوری اور ریا سے مبری قرار پاتی ہے، خالص جذبات کے موتی ہیں کہ گردون فکر سے ٹپک پڑتے ہیں، ایک رود مسلسل ہے کہ دل و دماغ کو سیراب کرتی ہے، عشق و سرمستی کی وہ باتیں کہ جو اردو و فارسی شاعری کی اساس کہلاتی ہیں، ان کی شاعری میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ انھیں گفتگو کا قرینہ اور اظہار مافی الضمیر کا سلیقہ خوب آتا ہے۔

شاعری وہی معیاری ہوتی ہے جو دلوں کی ترجمان ہو، قاری خود کو وہاں پائے جہاں خود شاعر ایستادہ ہے، تاہم اس بات سے بھی صرف نظر نہیں کہ موصوف کے کلام میں جذبے کا پراز معانی و نزداز حقائق اظہار ہوتا ہے۔ انھیں اپنی فکر کو نیا اور انوکھا پیرہن دینے کی کوئی تمنا نہیں ہوتی، انھیں کبھی نئی لفظیات پسند آتی ہیں تو وہ کبھی اپنی شاعری میں روش کہن سے اٹوٹ وابستگی دکھاتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کے خیال میں جے۔ پی سعید کا تاثر ان کی کتاب گل گشت کے حوالے سے یوں ملتا ہے:

> ''سعید غزل کے شاعر ہیں اور میں نے ان کی غزلیات کا مسودہ اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ مجھے سعید صاحب کے تغزل کی تازگی اور شگفتگی نے قدم قدم پر متاثر کیا ہے۔'' گل گشت، ص ۹

بہر کیف غزل غزل ہوتی ہے اور جے۔ پی سعید نے غزل کو اپنے مانوس و دل کش تغزل نیز روایت کی پاس داری کے ساتھ برتا ہے۔
پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کیا خوب کہا تھا:

> ''اس دور میں جب کہ جدیدیت کے نام پر اصلاحی جدیدیت یا نام نہاد جدیدیت طرح طرح کے بدرنگ لباس پہن کر ہمارے سامنے آ رہی ہے سعید صاحب روایت اور جدیدیت کا ایک ایسا حسین امتزاج اپنی شاعری میں پیش کر رہے ہیں جو اندھیرے میں چراغ کی طرح جل رہا

ہے۔''

گل گشت ص ۹

کلام ہے ۔ پی سعید کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں میر و غالب سے لے کر جگر و اصغر تک کا تغزل بدرجہ اتم اپنا اثر دکھانے لگتا ہے۔

اس کی شوخی جیسے غالب کی غزل
اس کے تیور جیسے مومن کا کلام

گل گشت، ص ۲۹

مذکورہ شعر کے پہلے مصرعے میں شاعر اپنے معشوق کی شوخی کو مرزا غالب کی غزل سے اور اس کے تیور کو مومن کی شاعری سے تشبیہ دے رہا ہے۔ دونوں صفحۂ اول کے اور ایک ہی عہد کے شاعر ہیں ۔ جے ۔ پی سعید کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

روکھی سوکھی پہ سدا عمر بسر کی ہم نے
اپنی تقدیر میں سونے کا نوالا کب تھا

شاخ گل، ص ۱۸

شعر میں ''سونے کا نوالا'' کہہ کر تونگری مراد لی گئی ہے۔ سونے کا نوالا کے لغوی اور معنوی معنوں میں تشبیہی تعلق پایا جاتا ہے۔ جو استعارے کے لیے از حد ضروری ہے۔

جی ۔ پی سعید کے کلام کا جائزہ لیں تو ہمیں ان کے کلام میں، شعری تجربات کے جمالیاتی اظہار کے لیے مختلف پیکر ملیں گے، جن میں متحرک پیکر، خیالی پیکر، روشنی کے پیکر، آتشیں پیکر، رنگیں پیکر سمعی پیکر، بصری پیکر لمسی پیکر، پیکر شامہ، پیکر ذائقہ وغیرہ ملتے ہیں، جن سے ہے۔ پی سعید کے لاشعور میں نہاں جذبہ حرکت اور رنگ و نور سے ان کی اٹوٹ وابستگی کا پتا چلتا ہے۔

انسانی فطرت ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے اور یہ خواہش انسان کو بام عروج تک پہنچا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شعرا اپنے کلام میں مزید خوب صورتی کے لیے ضائع و بدائع استعمال کرتے ہیں۔ دیگر شعرائے کرام کی طرح ہے۔ پی سعید ۔۔ نے بھی اپنے کلام کو صرف شعری وزن اور دیگر ضروریات شعری سے ہی آراستہ نہیں کیا ہے بلکہ لفظی اور معنوی خوبیوں کے ذریعے شعر میں حسن پیدا کرنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ اشعار میں حسن اور جدت پیدا کرنے کے اس طریقے کو ہم اصلاح میں صنائع و بدائع کا نام دیتے ہیں ۔ جے ۔ پی سعید کے کلام میں صنائع لفظی کی مثالیں اس طرح ملیں گی۔

تجنیس کے لغوی معنی ''ایک جیسا" یا" یکساں'' کے آتے ہیں۔ یہ صنائع لفظی کی ایک قسم ہے جس سے مراد کلام میں ایسے دو الفاظ لانا جو تلفظ میں ایک ہوں مگر معنی میں مختلف تو اسے صنعت تجنیس کہتے ہیں۔

صنعت تجنیس تام:

شعر میں ایسے دو الفاظ لائے جائیں جن کا تلفظ ایک ہو لیکن معنی مختلف ہوں۔ جیسے۔

یہ کسی نے تم سے غلط کہا مجھے کارواں کی تلاش ہے
جہاں میں ہوں تم ہو کوئی نہ ہو مجھے اس جہاں کی تلاش ہے

گل گشت، ص ۴۹

اس شعر میں ''جہاں'' دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پہلی بار اسم اشارہ کے طور پر اور دوسری مرتبہ ''جہاں'' دنیا کے معنی میں مستعمل ہے۔

صنعت تجنیس ناقص

کلام میں دو الفاظ ایسے استعمال کرنا جو لکھنے میں یکساں ہوں لیکن ان کی حرکت یعنی زبر، زیر یا پیش میں فرق ہو جیسے ۔ جے ۔ پی سعید کا یہ شعر دیکھیے ۔

محبت کا مزہ جب ہے کہ ملتے ہی نگاہوں کے
ادھر اقبال ہو جائے اُدھر ایجاب ہو جائے

شاخ گل ص ۲۳

اوپر کے شعر کے دوسرے مصرعے میں ادھر اور اُدھر استعمال ہوا ہے؟ اگر ان دونوں میں حرکت کا لحاظ نہ کیا جائے تو شعر کا وقار مجروح ہوگا۔

صنعت تجنیس زائد:

کلام میں ایسے دو لفظ لانا جن میں ایک حرف کا فرق ہو۔ خواہ یہ حرف شروع میں ہو یا آخر میں یا درمیان میں جیسے۔ جے۔ پی سعید نے کہا تھا۔

مدت کے بعد ہم پہ ہوا اس کا انکشاف
طالب تھے جس کے ہم وہ ہماری طلب میں تھا

شاخ گل ص ۲۰

ڈھونڈنے سے بھی کبھی آپ کو شاید نہ ملے
کیفیت بے خبری کی ہے جو مستانے میں

ایضا، ص ۲۸

گل کبھی زیب گلو ہونے کے سائل ہوں گے
خوش نصیب آپ کی گردن میں حمائل ہوں گے

ایضاً، ص ۳۱

مذکورہ اشعار کے پہلے شعر میں ''طالب'' اور ''طلب دوسرے شعر میں ''بھی'' اور ''کبھی''، تیسرے شعر میں " گل "اور'' گلو'' ایسے ہی الفاظ ہیں کہ جن کے مابین ایک حرف کا فرق پایا جاتا ہے اور یہ فرق شروع میں بھی ملتا ہے، آخر میں بھی اور درمیان میں بھی واضح ہوتا ہے۔

صنعت تجنیس مزیل:

کلام میں ایسے دو لفظ لانا جن کے ایک لفظ میں دو حرف زائد ہوں جیسے جے۔ پی سعید کے اشعار دیکھیے۔

اب اس کو کوئی شکایت نہ ہوگی آئندہ
قرار مجھے دل بے قرار سے پہلے

شاخ گل ص ۳۰

بے وفا نکلے وہی جن سے وفا آپ نے کی
آپ کسی دن مرے ایثار کے قائل ہوں گے

ایضاً ص ۳۱

پہلے شعر میں لفظ ''قرار'' کے چار اور ''بےقرار'' کے چھے حروف ہیں، اس طرح بے قرار کے دو حرف زائد ہیں، جب کہ دوسرے شعر میں ''بے وفا'' کے پانچ اور ''وفا'' کے تین حرف ہیں۔ اس طرح ''بے وفا'' کے دو حرف زائد ہیں۔

صنعت تجنیس تکرار

کلام میں لفظ مکرر لائے جائیں، اس طرح لفظوں کی تکرار کی وجہ سے اصوات کی تکرار ہو کر شعر میں نغمگی پیدا ہوتی ہے، جے۔ پی سعید کے کلام میں تجنیس تکرار ہتکریر یا مکرر کی کئی مثالیں ملتی ہیں، یہاں اختصار کے پیش نظر چند مثالوں پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

بہار اوج پہ اور طبع باغباں رنگیں
روش روش ہے ارم صحن گلستاں رنگیں

گل گشت،ص۳۳

مہر و وفا کے ہیں وہ قاصد عشق کا وہ مفہوم رہے ہیں
جو دیوانے تنہا تنہا کوچہ کوچہ گھوم رہے ہیں

ایضاً ص۴۹

نظر نظر میں فسانے نفس نفس میں سوال
وہ مست آنکھیں حسین و شریر و شوخ و نجل

ایضاً ص۱۳۶

درج بالا اشعار میں روش روش،تنہا تنہا،کوچہ کوچہ،نظر نظر اور نفس نفس صنعت تکرار کی بہترین مثالیں ہیں۔

صنعت تجنیس محرف:

شعر میں ایسے لفظوں کا استعمال ہو جن میں حروف یکساں ہوں مگر اعراب اور نقطے مختلف ہوں۔جیسے جے۔پی سعید کے ان اشعار میں تجنیس محرف اعراب کی مثالیں ملتی ہیں۔

تری چاہ تھی جو دل میں وہی روح تھی بدن میں
یہ ادھر ہوئی روانہ، وہ اُدھر ہوئی روانہ

گل گشت ص۵۳

نہ حرم میں تیرا پتہ چلا ، نہ تو دہر ہی میں نشاں ملا
جو ترے مقام کو پاگئے وہ ادھر گئے نہ اُدھر گئے

ایضاً ص۷۷

نہ خردا ہی سب کی رفیق ہے نہ جنوں کا فیض ہی عام ہے
یہ تو حو صلے کا سوال تھا کچھ ادھر گئے کچھ اُدھر گئے

ایضاً ص۷۷

اوپر کے اشعار میں ''ادھر اور ادھر''،تجنیس محرف کی مثالیں ہیں جو اعراب کے بدلنے سے واقع ہوئی ہیں۔

صنعت تجنیس ناقص وزوائد

جب تجنیس کے دولفظوں میں صرف ایک حرف کی بیشی ہو۔جے۔پی سعید کے پاس درمیان میں حرف زیادہ یا کم ہونے کے بیان کے اعتبار سے مثال یوں ملتی ہے۔ جیسے۔

تیرے رخسار، ترے لب ، ترے ابرو مانگے
ذوق نظارہ تجلی تری ہر سو مانگے

گل گشت،ص۵۴

اوپر کے شعر کے پہلے مصرعے میں ''تیرے اور ''ترے''میں تجنیس زائد و ناقص کی دوسری صورت موجود ہے۔

صنعت ذوقافیتین

شعر میں ایسے الفاظ لانا جن میں دو یا زیادہ قافیے ہوں۔جیسے

الفت ہے اسی سے انتہا کی

ISBN: 978-93-344-4743-9

جن نام سے میں نے ابتدا کی

گل گشت ص ۲۵

یہ بازار محبت ہے یہاں نفرت نہیں ملتی
جہاں خورشید ہوتا ہے وہاں ظلمت نہیں ملتی

شاخ گل، ص ۲۲

کبھی جو آیا ہے وہ گل عذار پہلو میں
سمٹ کے آئی ہے فصل بہار پہلو میں

ایضاً، ص ۲۳

اوپر کے اشعار میں قافیوں سے پہلے مزید قافیے آئے ہیں جن کے حرف روی یکساں استعمال ہوئے ہیں۔

صنعت ذولسانین

ایسا شعر جو دو زبانوں میں پڑھا جائے۔ جیسے۔

داعی احکام حق مربع پیر و جواں
حامی دین خدا راہ بر انس و جاں

شاخ گل ص ۱۱۶

مذکورہ شعر کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

صنعت تلمیع

جب شعر کا ایک مصرع ایک زبان میں اور دوسرا مصرع کسی اور زبان میں ہو تو یہ صنعت قائم ہوتی ہے (صنعت ذولسانین الگ ہے جس میں ایک ہی مصرع یا شعر بیک وقت دو زبانوں میں پڑھا جاتا ہے) یہ صنعت صنائع لفظی سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسے۔

''میان عاشق و معشوق رمزیست ''
کوئی کمرے کے اندر بولتا ہے

شاخ گل، ص ۶۰

حضرت برہان الدین راضی ہو ان سے خدا
کامل شرع متیں واقف سر نہاں

ایضاً ص ۱۱۶

مذکورہ اشعار کے پہلے شعر کا پہلا مصرع فارسی زبان میں ہے جب کہ دوسرا مصرع خالص اردو کا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کا دوسرا مصرع فارسی زبان میں بھی من و عن استعمال ہوگا۔

صنعت رقطا

نظم کے الفاظ میں ایک حرف بے نقطہ اور ایک حرف نقطہ دار ہو۔ جیسے۔

راہ حق راست ہے کہنا تو ہے آسان سعید
اسی جادے میں کبھی سر بھی قلم ہوتا ہے

گل گشت، ص ۲۸

لوگ مغرور اس کو کہتے ہیں
ہم سے جو سادگی سے ملتا ہے

ایضاً ص ۹۲

رکھ کے سر سوتا ہوں جب زانوئے مادر پہ سعید
بادشاہوں کی سعادت کا مزا آتا ہے

شاخ گل، ص ۱۹

اوپر کی مثالوں میں غور کرنے سے تمام منقوط الفاظ میں حرف بے نقطہ اور نقطے دار ملیں گے۔ اس صنعت کی رو سے کہیں بھی دو منقوط حرف ایک ساتھ نہیں ملتے۔

صنعت سیاقۃ الاعداد

وہ صنعت شعری جس سے کلام میں اعداد کا ذکر پایا جاتا ہو اس میں ترتیب وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے۔

رفاقت تھی تمہاری ایک نعمت
لگا کیا ہمارا ساتھ لکھنا

شاخ گل، ص ۱۷

ہزاروں میں کوئی ہوتا ہے بختاور زمانے میں
بنے مٹی سے سونا سب کی یہ قسمت نہیں ہوتی

ایضاً ص ۲۲

بجا ہے ترک تعلق مگر گزارش ہے
کہ مشورہ تو کریں آپ چار سے پہلے

ایضاً ص ۳۰

اوپر کے اشعار میں ''ایک'' ''ہزاروں'' اور ''چار'' صنعت سیاقۃ الاعداد کے طور پر آئے ہیں۔

صنعت تنسیق الصفات

جب کلام میں کسی چیز یا فرد کی متعدد اور مسلسل خوبیاں بیان کی جائیں تو اسے صنعت تنسیق الصفات کہتے ہیں۔ جیسے۔

زلف، ابرو، چشم، عارض، لب، دہن
ایک نازک آرزو اور اتنے دام

گل گشت، ص ۲۹

مذکورہ شعر میں ایک آرزو کے لیے متعدد خوبیاں مصرعہ اولیٰ میں بیان کی گئی ہیں۔

صنعت اشتقاق

اشتقاق لفظ مشتق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ایک مصدر سے کئی الفاظ بنانا۔ جیسے ک، ت، ب، سے کتاب، کاتب، مکتوب اور کتابت وغیرہ یعنی کلام میں ایک اصل کے ہم معنی الفاظ نظم کرنا۔ جیسے۔

یوں دھڑکتے ہوئے دل سے وہ لفافہ کھولا

ISBN: 978-93-344-4743-9

دل مرا اس میں ہے ملفوف کہ خط کا کاغذ

گل گشت ص ۱۲۱

گلشن دل میں ہیں پر مردہ امیدوں کے گلاب
کیا ہو گلگشت اگر زخم نظاروں سے ملیں

ایضاً ص ۴۶

لفافہ،ملفوف ایک اصل (ماڈّے) سے مشتق ہیں،اسی طرح گلشن اور گلگشت بھی ایک مصدر سے بنے ہیں۔

صنعت تابع مہمل

جب کسی بامعنی لفظ کی متابعت میں بے معنی لفظ لایا جائے جیسے سچ سچ جھوٹ موٹ وغیرہ کو صنعت تابع مہمل'' کہتے ہیں۔جیسے۔

ندی چپ چاپ کی آغوش میں ہے
بہت خوش ہے سمندر بولتا ہے

شاخ گل' ص ۶۰

اس شعر میں ''چپ چاپ'' تابع مہمل ہے۔

صنعت ترصیع

شعر میں دونوں مصرعوں کے تمام الفاظ علی الترتیب ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں تو یہ صنعت قائم ہوتی ہے۔جیسے۔

تو مالک شمس وقمر
تو مالک جن وبشر

گل گشت' ص ۲۱

اول تو ہی آخر تو ہی
باطن تو ہی ظاہر تو ہی

ایضاً' ص ۲۱

گفتگو ہو تو سماعت کا مزہ آتا ہے
روبرو ہو تو بصارت کا مزہ آتا ہے

شاخ گل' ص ۱۹

اوپر دیے گئے کبھی اشعار ہم وزن اور بیش تر اشعار میں الفاظ ہم قافیہ استعمال ہوئے ہیں۔

صنعت قطار البعیر

اس صنعت میں پہلے مصرعے کا آخری لفظ اور دوسرے مصرع کا پہلا لفظ ایک ہوتا ہے۔جیسے۔

اب محبت کی نظر سے مجھے دیکھے نہ کوئی
کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں نہ کنکر مارے

شاخ گل ص ۵۲

جیسا کہ شعر کا پہلا مصرع ''کوئی'' پر ختم ہو رہا ہے اور دوسرا مصرع بھی ''کوئی'' سے شروع ہو رہا ہے۔یہی صنعت قطار البعیر ہے۔صنائع معنوی سے شعر کی معنوی خوبیاں

واضح ہوتی ہیں۔ ذیل میں چند خاص صنعتوں کی تفصیل دی جارہی ہے:

صنعت تضاد

شعر میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں تو اس کو صنعت تضاد یا صنعت طباق' کہتے ہیں۔ اگر دو متضاد معنی کے الفاظ لائے جائیں تو ایسی صورت میں طباق ایجابی کہیں گے۔ جے۔ پی سعید کے درج ذیل اشعار صنعت تضاد کی مثالیں ہیں۔

پاسباں ساتھ رہا کرتا ہے ہر وقت کوئی
خار سے گل کی حفاظت کا مزا آتا ہے

شاخ گل، ص ۱۹

جو خوشی سے آئے گا ، جائے گا وہ افسردہ
فائدہ ہی کیا آخر زخم کی نمائش سے

ایضاً، ص ۲۵

اگر ہے آج جدائی تو کل ملن ہوگا
چمن میں آتی ہے پت جھڑ بہار سے پہلے

ایضاً، ص ۳۰

ان اشعار کے پہلے شعر میں خار کے ساتھ گل دوسرے شعر میں آئے گا'' اور'' جائے گا آیا ہے، اسی طرح تیسرے شعر میں آج اور کل کے علاوہ پت جھڑ کے بعد بہار آیا ہے جس سے صنعت تضاد واضح ہو رہی ہے۔

صنعت ایہام

ایہام کے اصل معنی "شک" یا "وسوسے میں ڈالنا کے ہیں۔ کلام میں اس طرح کا لفظ لانا جس کے دو معنی نکلتے ہوں اور دونوں سے شعر کے الگ الگ مطلب بھی نکالے جاسکتے ہوں اسے صنعت ایہام کہتے ہیں۔ قدیم شعرا کے یہاں صنعت یہام کا استعمال ایک فن مانا جاتا تھا۔

باب اجابت واکر یا رب اپنے نبی کے صدقے میں
نام پر ملت کے بچوں کے تسخیر آئندہ کر دے

شاخ گل، ص ۱۵

''باب اجابت'' سے صنعت ایہام کی توضیح ہو جاتی ہے۔

صنعت مشاکلہ

دو مختلف چیزوں کا ذکر کیا جائے اور ان میں تشبیہہ، استعارہ، محاورہ یا روزمرہ کے استعمال سے باہمی ربط ظاہر کیا جائے۔

روکھی سوکھی پہ سدا عمر بسر کی ہم نے
اپنی تقدیر میں سونے کا نوالا کب تھا

شاخ گل، ص ۱۸

شعر میں ''سونے کا نوالا'' بطور استعارہ استعمال ہوا ہے، اس طرح شعر میں ''روکھی سوکھی'' کا سونے کے نوالے سے تقابل کیا گیا ہے، جو محاورے کے ساتھ ساتھ روزمرہ بھی کہلاتا ہے۔

صنعت عکس

ISBN: 978-93-344-4743-9

کلام کے بعض اجزا کو مقدم و موخر کر کے دوسرا فقرہ یا مصرع بنالیا جائے۔

ہوں غیر اپنوں میں ، اپنوں میں اجنبی جیسا
دیا ہے تیری محبت نے مجھ کو کیا اعزاز

شاخ گل ص ۳۹

اوپر کے شعر میں غیر اپنوں میں'' کو اپنوں میں اجنبی یعنی غیر کا عکس بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہی عمل صنعت عکس کہلاتا ہے۔

صنعت تلمیح

کلام میں کسی مشہور واقعہ یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں لیکن اس کے پیچھے وہ پورا قصہ ہوتا ہے جس کی طرف شاعر اشارہ کرنا چاہتا ہے۔اس پورے قصے کو جانے بغیر نہ تو شعر کا مطلب بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی شعر کے اندر لائی گئی صنعت تلمیح کا پورا پورا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ شعر میں کفایت لفظی اور ایمانیت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جے۔ پی سعید کے ہاں صنعت تلیح کی مثالیں ملتی ہیں، جن سے انتخاب یہاں پیش کیا جاتا ہے۔۔

زمیں پر معجزے سب انبیا نے اپنے دکھلائے
فلک پر معجزہ سرکار کا شق القمر بھی ہے

شاخ گل، ص ۱۳

نہیں ہے کم کسی جمشید سے مری تقدیر
بشکل قلب مجھے ایک جام جم تو ملا

ایضاً ص ۲۱

جدا ہے درد محبت مرا زمانے سے
سمجھ سکیں گے مرے غم کو غزنوی نہ ایاز

ایضاً، ص ۳۹

اوپر کے اشعار میں شق القمر " جام جم، اور'' غزنوی نہ ایاز'' جیسی تلمیحات استعمال ہوئی ہیں۔اس طرح علامہ جے۔ پی سعید کے کلام میں صنائع لفظی اور ضائع معنوی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں اختصار کے پیش نظر بہت کم صنعتوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے نیز موصوف کے شعری مجموعوں سے مثالیں بھی کم کم ہی دی گئی ہیں۔

☆☆☆

معاصر حسیت کا شاعر: قاضی سلیم

ڈاکٹر انصاری مسعود اختر جمال احمد
اسوسیٹ پروفیسر وصدر شعبہ اردو، انکوش راؤ ٹوپے کالج، جالنہ (مہاراشٹر)

اردو زبان وادب کے صف اول کے نقاد محقق اور ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ:

''ادب کے دریچوں کو تازہ ہواؤں کے لئے کھلا رکھنا پہلی شرط ہے۔۔۔۔۔۔مغرب ہو یا مشرق تہذیبی لین دین اور دروازے بند نہیں کیے جا سکتے۔'' (آزادی کے بعد اُردو شاعری، مرتبہ شہزاد انجم ص ۵)

قاضی سلیم نظم نگار، مثنوی نگار، ہائیکو نگار، رباعی نگار، نثر نگار، مکتوب نگار اور ترجمہ نگار تھے۔ وہ ۲۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے، ۸۷ سال کی بھرپور زندگی گزاری۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ایل ایل بی کیا تھا۔ انھوں نے بیک وقت ادب، سیاست اور سماج سبھی شعبوں میں دلچسپی لی اور ان سبھی میدانوں میں اپنا نقش قائم کیا۔

قاضی سلیم پیشے سے وکیل تھے۔ انھیں ۱۹۸۰ء میں اورنگ آباد (حالیہ چھترپتی سنبھاجی نگر) حلقے سے لوک سبھا کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ دس سال تک مہاراشٹر کی قانون ساز مجلس کے رکن بھی رہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ ادیب کا تعلق براہ راست سرگرم عملی سیاست سے بھی رہا ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی کی مثال شاذ ہی کہی جائے گی لیکن قاضی سلیم کا اختصاص یہ ہے کہ وہ عوام کے ذریعے منتخب پارلیمینٹرین تھے اور انھوں نے اپنے حلقے اورنگ آباد کی بھرپور اور پرزور نمائندگی کی۔ وہ جب بھی دہلی اپنے ساؤتھ ایونیو کے ایم پی کوارٹر میں آتے تو وہاں بھی ملنے والوں میں اکثر ادیب اور شاعر ہی ہوا کرتے اور بسا اوقات غیر رسمی شعری محفل بھی جم جاتی۔

۱۹۶۸ء میں قاضی سلیم کا پہلا مجموعہ ''نجات سے پہلے'' شائع ہوا۔ تعجب کی بات ہے کہ قاضی سلیم کے اس مجموعے پر تبصرہ اشاعت کے پورے چار سال کے بعد ماہنامہ ''آج کل'' میں شائع ہوا۔ پروفیسر رشید حسن خاں نے اپنے اس تبصرے میں لکھا تھا کہ:

''اس مجموعے کی بیشتر نظموں میں ابہام اس قدر ہے جیسے گہری کہر آلود صبح ہوتی ہے۔ کہیں کہیں مفہوم کی چمک دکھائی دے جاتی ہے اور پھر اندھیرا اور سناٹا۔ جو لوگ اس انداز کی شاعری میں حسن و پسندیدگی کو دیکھ سکتے ہیں، اُن کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔''

(بحوالہ مضمون قاضی سلیم: ضمیر کی آواز کا شاعر۔ 'مضمون نگار: ابرار رحمانی' مطبوعہ ماہنامہ اردو دنیا، جولائی ۲۰۱۸ء)

متذکرہ بالا مجموعے میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں، جن میں آہنگ اور وضاحت اظہار دونوں عناصر پائے جاتے ہیں، لیکن یہ ۱۹۵۰ تا ۱۹۵۵ء کی یادگار ہیں، جیسے 'عروس البلاد' اور دھرتی تیرا مجھ سا روپ'۔ ان میں معنویت کی سطح بلند ہے اور اظہار کا حسن نمایاں ہے۔ لیکن مکمل مجموعے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی سلیم نے جلد ہی اس پرانے پن سے پیچھا چھڑا لیا اور ۱۹۶۰ء کے بعد کی بیشتر نظمیں پرانے پن کے ہر الزام سے محفوظ ہیں۔ ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۰ء تک لکھی گئی جو نظمیں ہیں وہ ۱۹۵۵ء کی نظموں سے مکمل طور پر مختلف ہیں اور اُس خلفشار کی بہت اچھی نمائندگی کرتی ہیں جو جدت کے نام پر اردو شاعری میں رونما ہو رہا ہے۔

اس کے بعد ان کی ایک مثنوی 'باغبان وگل فروش، شائع ہوئی جو ان کی کلیات رستگاری میں بھی شامل ہے۔ یہ تخلیق دراصل مثنوی کی ہیئت میں اپنے زمانے کی ہجو ہے۔ ادبی پیرائے میں سماج، سیاست اور تمام معاصر مسائل پر قاضی سلیم نے اپنی برہمی اور ان کا اظہار کیا تھا چنانچہ مثنوی میں طنز واستہزاء کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہے۔ گو کہ قاضی سلیم ترقی پسند تحریک کے دور سے شاعری کر رہے تھے اور اپنے معاصرین کے درمیان اُنھوں نے اپنی علیحدہ شناخت بھی بنائی تھی لیکن انھیں باضابط مسلم الثبوت شاعر کی حیثیت سے معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے 'نئے نام' کے تحت پیش کیا۔ نئے نام میں قاضی سلیم کی تین نظمیں 'وائرس'، 'وقت' اور 'بےنظر میری آنکھیں' شامل ہیں۔

نئے نام: اُردو ادب میں رجحانات کی سطح پر ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا کہ نئے نام کے بعد سے جدیدیت کا رجحان تیزی سے عام ہوا۔ گرچہ اردو شاعری کے اس مختصر سے مجموعے پر بہت گفتگو ہوئی۔ حمایت میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ حامیوں نے اُسے جدید شاعری کا اصل نمائندہ قرار دیا تو مخالفین نے اُسے چیستاں اور ترسیل و

 ISBN: 978-93-344-4743-9

ابلاغ کا المیہ قرار دیا۔لیکن قاضی سلیم کی شاعری باوجود ان سبھی الزامات کے باوصف اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب رہی۔اگر یہ کہا جائے کہ نئے نام کے شاعروں میں قاضی سلیم کی شاعری نے سب زیادہ متوجہ کیا تو غلط نہ ہوگا۔قاضی سلیم کی لکھی ہوئی نظم وائرس ملاحظہ کریں۔۔۔

ابھی ابھی تو لب ملے تھے کتنے پیار سے
زباں پہ یہ کسیلا پن کہاں سے آ گیا
مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
ذرا سی دیر کے لیے پلک جھپک گئی
تو راکھ کسی طرح جھڑی
سنا ہے دوٗر دیس سے
کچھ ایسے وائرس ہمارے ساحلوں پر آ گئے
جن کے تاب کار سحر کے لیے
امرُت اور زہر ایک ہیں
اب کسی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں
کسی دوا کا درد سے کوئی واسطہ نہیں
ہم ہوا کی موج موج سے
درد کھینچتے ہیں چھوڑتے ہیں سانس کی طرح
لہوٗ کی ایک ایک بوند زخم بن گئی
رگوں میں جیسے بددعا میں تیرتی ہیں پھانس کی طرح
مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا
دیو علم کے چراغ کا
کیوں بھلا پھر گیا
دھواں دھواں بکھر گیا
سنو کہ چیختا ہے
''کام۔۔۔کوئی کام''
کچھ نہیں
جاؤ ساحلوں کی سمت ہو سکے تو روک لو
اس نئے عذاب کو
یا کروڑوں سال کے لیے
خدا کی آخری شکست تک
سمندروں کی ریت چھانتے رہو

قاضی سلیم کی دوسری نظم ''وقت'' کے عنوان سے، اس انتخاب میں شامل ہے، جو کچھ اس طرح ہے:

ISBN: 978-93-344-4743-9

ایک رپھر دوسری رپھر تیسری
اوراب تو پیہم رگھڑ گھڑاہٹ کی مسلسل چوٹیں
میرے اعصاب پر پڑنے لگیں رتب ریل کی رفتار بڑھی
بھاگتے پیڑ رچٹانیں رکھمبے
پاس سے گزرے تو آواز ملا کر چینے
شور ہی شور ہے ریہ شور مگر
اپنا اظہار ہے اثبات ہے ہر شے کے لیے
آسماں سرخ ہے راب بھی دو ستارہ تنہا
نگراں ہے مرے ہر کرب کا ریہ کہتا ہے
۔۔۔عمر اک چیخ کی میعاد ہے رتم بھی چیخو
اتنی شدت سے کہ مدت تک روقت کو یاد رہے
جنگلوں اور پہاڑوں میں یہ فریاد رہے
آہنی پہیوں نے' فولادی زباں میں اپنی بات دُہرائی، یہ آواز تھی جانی بوجھی
ایسے مانوس تھے الفاظ جنہیں عمر تمام رسنتے رہتے ہیں مگر سیکھ نہیں پاتے ہیں
آج بھی دیر تلک سنتے رہا رثانیے
ساعتیں رشام اور سحر رمنزلیں کٹتی رہیں۔۔۔۔وقت چلا
دھیرے دھیرے میری رگ رگ میں لہو کی گردش
دو رونزدیک بے درد کشاکش سے ملی رگھڑ گھڑاہٹ سے ہم آہنگ ہوئی
اب ہوں میں جزو اسی کا شاید رآہنی پہیہ ہوں، اک ایسا تسلسل ہوں کہ جس کے کوئی معنی ہی نہیں
پچھلی ضربات سے ہر ضرب نئی رایسے مل جاتی ہے جیسے اس میں کسی احساس کا فریاد کا وقفہ بھی نہیں

یہ اتفاق ہے یا پھر اسے قاضی سلیم کا منصوبہ بند پروگرام کہنا چاہیے کہ 1915ء میں 'نئے نام' شائع ہوا جس میں اُن کی ادبی انگڑائی کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور ۱۹۹۸ء میں اُن کا پورا مجموعہ 'نجات سے پہلے' شائع ہوا اور اس کے ساتھ وہ معاصر ادبی منظر نامے میں اپنا اہم مقام بنانے میں کامیاب ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب نظمیہ شاعری میں افتخار جالب، باقر مہدی، بشر نواز، بلراج کومل، بمل کرشن اشک، حمید الماس، راج نرائن راز، زبیر رضوی، شاذ تمکنت، سلطان اختر، شہاب جعفری، شہر یار، عادل منصوری، کمار پاشی، محمد علوی محمود ایاز مخمور سعیدی مصحف اقبال توصیفی، وحید اختر اور وہاب دانش جیسے اہم نام شامل تھے: اور جنھوں نے غزل گوئی پر نظم نگاری کو ترجیح دی لیکن اُن میں سے بیشتر چیستانی اور لایعنیت کا بھی شکار ہوئے۔ ۱۹۶۸ء کا ہی سال تھا جب قاضی صاحب نے ایک جلسے میں ایک ادبی منشور پیش کر دیا جس میں انھوں نے ایک طرح سے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے ہی بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ قاضی سلیم کو اپنا یہ ادبی منشور اس قدر عزیز رہا کہ جب ۲۰۰۳ء میں یعنی پورے ۳۵ سال بعد معروف فکشن نگار نور الحسنین صاحب کے اشتراک سے ایک سہ ماہی رسالہ 'دل رس' کا اورنگ آباد سے اجراء کیا تو اس رسالے میں پھر سے ایک بار اس منشور کو پیش کر دیا کہ اُن کی نظر میں یہ ہر دور کے لیے قابل قبول ہے۔ 'دل رس' کے افتتاحی شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اردو رسالوں کی یوں تو کمی نہیں، بلکہ یوں کہیں تو اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ ایسے میں جب کبھی ہوئی اچھا رسالہ نظروں سے گزرتا ہے تو فطری طور پر جی خوش ہوتا ہے۔ سرزمین دکن (وجد میموریل ٹرسٹ، نزد دھر کل گیٹ، اورنگ آباد، 431001) سے

جاری ہونے والا رسالہ 'دل رس' ایک ایسا ہی رسالہ ہے، جس سے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ یہ تشنگان ادب کو ایک طویل عرصے تک سیراب کرتا رہے گا کیوں کہ اس کے حلقہ ادارت میں قاضی سلیم اور برادرم نور الحسنین کے علاوہ مظہر محی الدین، خواجہ محمد معین الدین اور شاہ حسین نہری جیسے صاحبانِ علم و فن شامل ہیں۔ان کے علاوہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اب یہ دونوں راہی ملک عدم ہوئے۔''

(بحوالہ مضمون 'قاضی سلیم :ضمیر کی آواز کا شاعر۔مضمون نگار: ابرار رحمانی' مطبوعہ ماہنامہ اردو دنیا، جولائی ۲۰۱۸)

رسالے میں ایک خاص چیز اس کا افتتاحیہ ہے جس کی وجہ سے رسالہ 'دل رس' کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔قاضی سلیم نے اپنے افتتاحیہ میں ۱۹۶۸ء کے ایک جلسے میں جدید شاعری پر پیش کیے گئے اس چھ نکاتی منشور کو پھر سے پیش کیا ہے جسے قاضی صاحب نے ہر عہد کی اچھی شاعری کے لیے میزان سے تعبیر کیا ہے:

۱) ذات اور شعور کی ساری پناہ گاہیں پاش پاش ہو کر بکھر گئی ہیں۔اس جہنمی صورت حال سے نکلنے کے لیے پنڈورا کے صندوق میں ایک ہی امید بچی ہے اور وہ ہے آرٹسٹ کا ضمیر،اس لیے ہم تمام فلسفوں اور نظریوں میں آزاد ضمیر کے آگے جوابدہ ہیں۔

(۲) ہم زندگی کے دوسرے شعبوں کے متوازی فن کے علاحدہ وجود کا اثبات کرتے ہیں۔اس میکانکی جبریت کے عہد میں ہم آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت پر گواہی دیتے ہیں۔

۳) ہم مبہم تعمیمات (VegueGeneralization) کی بجائے اپنے ذاتی ردعمل کے مختصر اظہار کو فن کی بنیاد سمجھتے ہیں۔اس لئے ہماری شاعری بھی ہماری صورتوں کی طرح مختلف اور منفرد ہوگی۔

۴) ہم گھسے پٹے درسی معیارات، سکہ بند انداز بیان اور زیبائشی لفاظیوں کی بجائے اظہار و بیان کے ہر نئے امکان کو لبیک کہتے ہیں۔اس لیے لفظ، استعارے، علامتیں یہ سب زبان کی توسیع کا وسیلہ ہوں گے۔

لہذا ہم ترسیل و ابلاغ کو فن کا ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔یہ چیلنج تخلیق کار اور قاری دونوں کے لیے ہوگا۔

۵) ہم تمام روایات کا احترام کرتے ہیں، چاہے وہ ہماری روایات ہوں یا کسی اور زبان سے حسن و آہنگ کی صورت میں زمان و مکان کو پھلانگتی، ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔''

مندرجہ بالا منشور پر بحث کی پوری گنجائش ہے اور ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔اس منشور میں قاضی سلیم نے آرٹسٹ کا ضمیر اور ضمیر کے آگے جواب دہی کی بات کی ہے۔اس موقع پر قاضی سلیم کی مشہور و معروف نظم 'بے ضمیری' کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

زمیں گھومی رہوا بدلی رچلو موسم بدلتا ہے
سلیم اب تم پہاڑوں سے اُتر آؤ ر
وہ دیکھو چیونٹیوں کے پر نکل آئے رفضائے بیکراں میں
موت کی وادی میں
اڑتی پھر رہی ہیں آج کتنی بے نیازی سے
کہ جیسے مطمئن ہیں مکڑیوں کی سرفرازی سے
سلیم اب تم پہاڑوں سے اُتر آؤ
تمھاری دوُر کی آواز کیسے گونج بن کر پلٹ آئی ہے
شاید بستیوں کے بھی بارود گھر سیلے ہوئے ہیں
کوئی ہتھیار صحیح سالم نہیں ہے
نکیلے دانت، کانٹے، ڈنک، ناخن

ISBN: 978-93-344-4743-9

حفاظت کے بھی سامان جیسے چھن چکے ہیں
اندھیرے کی پندگاہوں میں
سحر سامری سے آج سب مبہوت ہیں
ہاتھ پاؤں ذہن سب مفلوج ہیں
سونے کا بچھڑا بولتا ہے
تبھی تو ظالموں سے درد کا رشتہ جڑا کر
خدا کی گود میں آرام سے سوتے ہیں جب سب پیمبر
یہ کس کا درد سہتے ہیں یہ کس کا پاس رکھتے ہیں
خود اپنی موت کی نظارگی کا زخم دے کر
درندوں کی نگاہوں سے
الوہی روشنی کی آس رکھتے ہیں
سلیم اب تم پہاڑوں سے اُتر آؤ
تمہارے راز تم ہی جانتے ہو
یہ سب کچھ جھوٹ ہے، اک ڈھونگ ہے
ہم میں کوئی رایوب ہے، بدھ ہے، نہ عیسیٰ ہے
بس اتنا ہے تمہارا اپنا شیطان مر چکا ہے

مذکورہ بالا نظم میں زمین کا گھومنا، ہوا کا بدلنا، موسم بدلنا، پہاڑوں سے اُتر آنا، چیونٹیوں کے پر نکل آنا، مکڑیوں کی سرفرازی، بارود گھر کا سیلنا، نکیلے دانت، کانٹے، ڈنک، ناخن وغیرہ علامات واستعارات سے قاضی سلیم نے کام لیتے ہوئے زمانے کی بے ضمیری پر بھر پور وار کیا ہے۔اسی طرح ایوب، بدھ اور عیسیٰ کا صرف نام لے کر خوب صورت تلمیحات استعمال کیا ہے۔ اپنے خوبصورت ڈکشن، اسلوب اور پیرایہ اظہار کے سبب یہ نظم اس وقت کافی مقبول ہوئی تھی۔ گیان پیٹھ نے ۱۹۸۵ء میں ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے انتخاب 'بھارتیہ کویتائیں' میں نظم بے ضمیری کو بطور خاص شامل کیا ہے۔

قاضی سلیم نے اس میکانکی جبریت کے عہد میں آرٹ کی جاملیاتی اور سماجی ضرورت پر زور دیا ہے۔ قاضی سلیم ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی فعال تھے اور لکھتے پڑھتے رہتے تھے اور جب جدیدیت کا غلغلہ بلند ہوا تو یہاں بھی وہ صف اول میں نظر آئے۔

اُن کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی اچھائیوں اور خوبیوں کو کشید کیا اور اپنے فن پارے کو اسی کشید کئے ہوئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی چنانچہ وہ اپنے معاصرین کو نہ صرف آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان کی شاعری بھی خود اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُن کی نظم 'دوسری کربلا' اس پس منظر میں خاص اہمیت رکھتی ہے:

کوکھ صحرا کی کتنی ہری ہے
کیکٹس کے اُبھرے ہوئے ہاتھ ر۔۔۔ ہاتھوں میں
کانٹوں بھری انگلیاں کانٹوں بھری اُنگلیوں سے
پھوٹتے ان گنت ہاتھ رپھوٹتے ان گنت ہاتھوں میں
کانٹوں بھری اُنگلیاں کیا تم نے دیکھی ہیں

ISBN: 978-93-344-4743-9

وہ پیڑ جو بے زمیں ہیں/اپنے ہی جسم میں دوڑتی
بے محابہ جڑیں/پتھروں کی رگیں/جانتی ہیں
روئیدگی کے خزانے/شہیدوں کے خون میں
چھپے بارودخانے
اے خدا/ہجرتوں کی گھڑی ہے
سرزمیں تیرے وعدے کی/موت شاید قریب آچکی ہے
کوئی جی کر دکھائے/موت پر فتح پانے کے ارمان میں
یہ تو تیرا کرم ہے/ریت کا دودھ اُترا ہے
بگولوں کے پستان میں/کینہ پرور ہواؤں کی سازش کو
سب جانتے ہیں شاید/اسی واسطے لہو
آج اتنا لہو جسم میں جوڑ رکھا ہے
جو چیرو، تو اس زندگی کا/لہو ٹپ ٹپ گرے گا
کاٹتے جاؤ/کانٹوں بھری انگلیوں سے
جسم سالم ابھر آئیں گے/جس سے پھوٹتے
انگنت ہاتھ/ہاتھوں میں/کانٹوں بھری اُنگلیاں

یہ اور اسی طرح کے متعدد اشعار میں قاضی سلیم علامات اور استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں لیکن مبہم تعمیمات کے قائل نہیں۔ حالانکہ یہ ان کے دور کا غالب رجحان رہا ہے۔ مبہم تعمیمات کے دور میں بھی اپنے ذاتی ردعمل کو ہی انھوں نے فن کی بنیاد قرار دیا۔ انھوں نے اسے ایک انتہائی خوبصورت تشبیہ کے ذریعے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہماری شاعری بھی ہماری شکلوں اور صورتوں کی طرح مختلف اور منفرد ہونی چاہیے۔ انھوں نے ایک طرح سے ترقی پسندی کی یکسانیت، بورنگ واکتا دینے والے، جدیدیت کا معمہ اور لایعنیت دونوں پر تنقید کی ہے۔

قاضی سلیم کی تمام تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ اظہار و بیان کے ہر نئے امکان کے قائل رہے۔ چنانچہ انھوں نے گھسے پٹے درسی معیار، سکہ بند انداز بیان اور زیبائشی لفاظیوں سے نہ صرف خود اجتناب کیا بلکہ اُس کی تلقین بھی کی ہے۔ انھوں نے لفظ استعارے اور علامتوں کی محض زبان کی توسیع کا وسیلہ گردانا ہے۔

قاضی سلیم جس زمانے میں اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے عروج پر تھے اور اختر الایمان وغیرہ کے بعد اُن کی شاعری کا شہرہ تھا، اُس زمانے میں بھی انھوں نے اپنی تخلیق کو چیستاں نہیں ہونے دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہر شاعر و ادیب چیستانی کے فیشن یا زعم میں ترسیل و ابلاغ کی ناکامی کا شکار ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں فیشن کے ساتھ رہتے ہوئے بھی فن کی ترسیل اور ابلاغ کے اُس معاصر چیلنج کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس سے نمٹنے کی بھرپور کوشش بھی کی ہے اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی رہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ان تمام مسائل سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنی روایات کا پاس اور لحاظ رکھا بلکہ دوسری زبانوں کی روایات کو بھی عزیز جانا اور اس کے حسن آہن کو اپنایا جو بلاشبہ کبھی ترجموں کی صورت میں تو کبھی تبادلہ خیالات اور لین دین کے توسط سے ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔ قاضی سلیم نے اپنے آزاد ضمیر کی یہ باتیں ۱۹۶۸ء میں کہی تھیں لیکن آج نصف صدی بعد بھی حسب حال لگتی ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو قاضی سلیم کی معنویت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ قاضی سلیم کے خاکے میں عوض سعید لکھتے ہیں کہ:

''ادب میں جب بھی جمود کا نعرہ بلند ہوا، قاضی سلیم نے اپنی موہ لینے والی نظموں کے ذریعے اس کی تردید کردی۔'' اختر الایمان نے

قاضی سلیم کے بارے میں بجا لکھا ہے کہ اُن کی شاعری، شاخ نہالِ غم ہے۔''

(بحوالہ ''رستگاری'')

آ ماخذ و حوالہ جات:

اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب و رسائل سے مدد لی گئی ہے:

(1) ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی، جولائی ۲۰۱۸ء

(۲) خاکہ قاضی سلیم: از عوض سعید (بشکریہ ڈیجیٹل لائبریری)

(۳) قاضی سلیم- مونوگراف: از غضنفر اقبال

(۴) آزادی کے بعد اُردو شاعری: از ڈاکٹر شہزاد انجم

☆☆☆

منور رانا کی شخصیت ایک بلند قامت

ڈاکٹر محمد مجاہد حسین
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو
پورنیہ کالج، پورنیہ، بہار

اردو شعر وادب کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے لیکن فنون لطیفہ میں مشاعروں کی رسم بھی کافی پرانی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری اور مشاعرے کا تعلق بہت قدیم ہے زبان کے دو عظیم دبستان ملتے ہیں جسے دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دہلی ایک طویل مدت تک اردو شعر وادب کی آماجگاہ بنی رہی لیکن حالات کے بدلتے ہوئے رجحان سے شعراء کی نظر آرام وآسائش کی طرف گامزن ہونے لگی کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر اور اس سے پہلے احمد شاہ اور نادر شاہ کے حملوں نے دہلی کا سکون چھین لیا تھا۔ چند شعراء کے علاوہ باقی اپنی جانوں کا خطرہ سمجھ کر لکھنؤ کی طرف رخ کرتے ہیں دہلی کے اردو شعراء وادباء کے چرچے لکھنؤ میں خوب ہونے لگے۔ جہاں نوابوں کے ہاتھوں آرام وآسائش کی تمام سہولیات دستیاب تھیں۔ اب لکھنؤ میں اردو شاعری کا سکہ چلنے لگا اور مختلف مقامات پر علمی وادبی محفلیں سجائی جانیں لگیں۔ لکھنؤ کے قرب وجوار سے اردو داں طبقہ محفلوں کی رونق میں اضافہ کرنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ وقت گذاری اور سیر وتفریح کی غرض سے بھی لکھنؤ وارد ہونے لگے اور یہاں کے ماحول اور اس کے تہذیبی عناصر کو اپنی زندگی میں ڈھالنے لگے عوام کو راحتِ قلبی محسوس ہونے لگی مشاعروں میں لاتعداد لوگوں کی شرکت سے اردو داں طبقہ روز بروز ترقی کرنے لگا۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ لکھنؤ دبستان میں ادباء بھی موجود رہے ہیں جن کے ہاتھوں داستان، افسانہ، ناول اور ڈراما وغیرہ جیسی نثری اصناف بھی خوب پروان چڑھیں لیکن اس دبستان کی شاعری میں نشاطیہ عنصر غالب ہے آرام وآسائش موضوع سخن رہا ہے محبوب مجازی کے چاہنے والے زیادہ نظر آتے ہیں اور شاعری عشق وعاشقی، شراب وکباب، کیف وسرور کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ریاست اتر پردیش کے اس خطہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں سے اردو شعر وادب کے بہترین فنکار پیدا ہوئے ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان نے خوب ترقی کرکے زینہ درزینہ اپنا مقام ومرتبہ حاصل کیا ہے، موجودہ عہد میں دبستان لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں آج بھی جاری ہیں اور جدید قلمکاروں کی ایک کہکشاں موجود ہے ان جدید شعراء میں سے منور رانا بھی ایک ہیں جو بیک وقت شاعر، نثر نگار اور ڈراما نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں ان کا تعلق ریاست اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی سے ہے جو لکھنؤ سے ۸۰ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے لیکن طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت کرنے کی غرض سے زیادہ وقت لکھنؤ میں ہی گذارتے تھے۔ بیسویں صدی میں اردو شاعری کا آغاز کرنے والوں میں منور رانا نے اپنا مقام منفرد لب ولہجہ، خوشنما آواز اور درد دل رکھنے والا شاعر کی حیثیت سے منوایا ہے۔ منور رانا نے مغربی بنگال کی اردو کی طرف سے نمائندگی حاصل کی ہے ان کی انتھک محنت ومشقت سے مغربی بنگال کی اردو کے پوشیدہ عناصر کو منظر وام پر لایا گیا ہے ان کی تعلیمی وادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۲ء سے ہوتا ہے باقاعدگی سے مشاعروں میں شرکت کرنا اور اپنی آواز سے سامعین کو محظوظ کرنا ان کا خاصا رہا ہے۔

منور رانا کی شخصیت بلند قامت، انتہائی خلیق، سنجیدہ اور پرکشش ہے ان کے بات کرنے کا بے باک انداز، موقع پر برمحل الفاظ سے عوام کو گرویدہ بنانا ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہے۔ ان کی پیدائش ضلع رائے بریلی میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی ان کے گھر کا ماحول ادبی اور علمی رہا ہے ان کے بزرگوں نے درس وتدریس کو اپنا مشغلہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ منور رانا کی شخصیت پر گھر کے مذہبی ماحول کا کافی حد تک اثر ہے اور منور رانا کی ابتدائی زندگی بڑے آرام وآسائش میں گذری لیکن شادی کے بعد زندگی مختلف نشیب وفراز کا مرکز بن گئی تلاش معاش کی غرض سے مختلف شہروں میں ٹرک چلاتے رہے اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالتے رہے۔

منور رانا نے اردو شعر وادب کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی ان کے شعری مجموعہ کی تعداد گیارہ ہے جو اشاعت کے زیور سے آراستہ ہو کر داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔ منور رانا نے نثری کارنامے بھی انجام دیئے ہیں ان کی چھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

منور رانا کی شہرت غزل گوئی کی حیثیت سے زیادہ ہے ان کی غزلوں میں مختلف موضوعات کو پیش کیا گیا ہے ان کی غزلوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے جس کی وجہ

 ISBN: 978-93-344-4743-9

سے شاعری میں سوز و گداز پیدا ہو گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں اشعار کی تعداد کم رہتی ہے پانچ سات اشعار کے علاوہ تین اور چار اشعار پر مبنی غزلیں ہیں ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا تاثر ہے جو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ غزل میں توانا پن موجود ہے جس سے قاری نہ چاہتے ہوئے بھی غزل کی گرفت میں آ جاتا ہے۔

منور راناؔ کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے انہوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ عام انسانی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان موضوعات کا دائرہ وسیع ہے جن میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ جدید قلم کاروں میں موضوعات کے لحاظ سے منور راناؔ منفرد مقام کے حامل غزل گو ہیں۔

منور راناؔ کا کلام سماج کے اس طبقہ کی آواز ہے جو محنت کش ہونے کے ساتھ افلاس اور غربت کا مارا ہوا ہے ان کی غزلوں میں رشتوں کی پاکیزگی کا خاص عمل دخل ہے۔ ابتدائی زندگی کی شاعری میں پختگی نظر نہیں آتی جو کلکتہ کے تعلیمی سفر کے بعد دیکھنے کو ملتی ہے۔

انہوں نے نثر اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شہرت کا دار و مدار غزل پر ہے۔ بالالفاظ دیگر منور راناؔ کو اگر غزل گو شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

فکر و فن کے حوالہ سے منور راناؔ کا کلام منفرد مقام کا حامل ہے ان کی انفرادیت انداز بیان اور تجربات و مشاہدات کی بنا پر ہے ان کے کلام میں طنز و مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ منور راناؔ نے اپنی ذہانت اور انتھک محنت سے یہ انفرادیت قائم رکھی ہے جو جدید قلم کاروں سے انہیں منفرد کرتی ہے۔ منور راناؔ کی غزلیں اس لئے بھی قاری کی فہم و ادراک کے اردگرد گھومتی ہیں کیونکہ انہوں نے معاشرتی منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے غزل کی وساطت سے رشتوں کی رسی کو کمزور ہونے سے بچانے کی کوشش کی ہے اور انسانی مسائل کی کھل کر وضاحت کی ہے تاکہ انسانی مسائل حل ہو سکیں اور ہر مفلس آدمی اپنے حقوق کا تحفظ از خود کر سکے۔

منور راناؔ ایک نظم نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں ان کی نظموں میں انسان کی زبوں حالی کو بیان کیا گیا ہے ان کے مطابق انسانی جذبات کی عکاسی وہاں کی تہذیبی و تمدنی مسائل پر ہوتی ہے۔ نظم نگاری میں جس طرح محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، فیضؔ، جوشؔ، اقبالؔ نے اپنے جوہر دکھائے ہیں اور مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں اسی طرح منور راناؔ نے سیاسی اور سماجی منظر نامے کو نظموں میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظمیں معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر کشی کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات سماج سے لئے گئے ہیں ان کی نظموں پر آزاد نظم نثری نظم اور نظم معریٰ وغیرہ کا اطلاق ہوتا ہے آپ نے فن کو ملحوظ خاطر رکھ کر شاعری کی ہے۔ ان کی نظموں میں ''احساس''، ''خود کلامی''، ''لگنے لگے ہو چہرے سے بیمار چھوڑ دو'' جیسی بہترین نظمیں ہیں۔

منور راناؔ نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا محبوب موضوع ''ماں'' ہے۔ آپ نے ماں کی عزت و حرمت پر بے شمار غزلیں اور نظمیں کہی ہیں اس کے علاوہ باپ، بہن، بیٹی اور دیگر خونی رشتوں پر کھل کر لکھا ہے عوام کو اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ سماج میں انسانی وقار کیا ہے اور ہمیں سماج میں کس طرح رہنا چاہئے ان کی نظموں میں اخوت جہانگیری اور مروت عالمگیری کا درس جا بجا ملتا ہے۔ منور راناؔ کی شاعری میں دیہاتی پس منظر دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ ان کا تعلق سماج کی مٹی سے تھا جہاں خلوص و پیار کی رسمیں نبھائی جاتی ہیں اس کے علاوہ اوائل عمری میں گاؤں سے دور تعلیم کی غرض سے نکلنا اس محبت میں اور بھی اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ منور راناؔ کو گاؤں کی پگڈنڈیوں کی یادوں نے ماضی کی طرف سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ گاؤں کے لوگوں کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا نہ ہی کوئی ریاکاری سے پیش آتے ہیں ان کی شاعری سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ حیا، محبت، شرافت صدق دلی اور خلوص وغیرہ صرف گاؤں میں موجود ہے۔

منور راناؔ کی شاعری میں ہندوستانی سماج کے تہذیب اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے انہوں نے یہاں کی گنگا جمنا تہذیب کو بڑے مؤثر طریقہ سے پیش کیا ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے سماجی تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی انسان دوستی ہے اور دو گروہ کو آپس میں جوڑنے کا کام کرتی ہے یہی بات ہے کہ ان کی شاعری ہندو مسلم دونوں مذاہب کے لوگ پڑھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب، تمدن اور مذاہب و عقائد کی چاشنی جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے جس کا ذکر وضاحت کے ساتھ منور راناؔ کی شاعری'' میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

نثر نگاری کے لحاظ سے بھی منور راناؔ کا مقام اہم ہے نثر کے میدان میں منور راناؔ نے نثر میں صنف انشائیہ پر طبع آزمائی کی۔ ان کے انشائیوں اور خاکوں کے عنوانات بھی نئے اور اچھوتے انداز کے ہیں اور ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ عنوان بہت طویل ہیں مثلاً لکھنؤ میں ملیح آباد کے آموں کی دعوت، لیکن اختصار کے طور پر ان کی ترجیحات کے عنوان رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین زیادہ تر شاعرانہ مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''مرے آنسو بھی شاید استخارہ دیکھ لیتے ہیں'' دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں کون ہے کس رنگ میں'' شہروں میں چاند کو کوئی ماما نہیں کہتا۔ ''میری ہنسی تو میرے غموں کا لباس ہے'' عشق میں اتنا خسارہ ہے تو گھر جاتے ہیں ان

کے خاکوں میں معتبر ادبی وسیاسی شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے اور اس بات کی طرف توجہ مرکوز کروائی ہے کہ ہم نے کس طرح علمی و ادبی شخصیات کو چند برسوں میں دل سے بھلا دیا ہے۔

منور رانا کی نثر تصانیف کسی انعامی دوڑ کی غرض سے نہیں تحریر ہوئیں البتہ ایک مثبت سوچ وفکر کو نثر کے جامہ میں پیش کیا ہے۔ان کی نثری تصانیف سے اردو خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا ہے یہ الگ بات ہے کہ موجودہ عہد میں ان نثری اصناف کی طرف کم دھیان دیا گیا ہے لیکن منور رانا نے وقت کے تقاضے کو سمجھ کر اس کام کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

منور رانا نے جن لوگوں کے خاکے تحریر کیے ہیں ان کے طور طریقوں اور خصوصیات کے علاوہ ان کے اوصاف، کردار، خیالات، مزاج اور سنجیدہ پن پر گہری نظر رکھی ہے اور خاکہ نگاری کے وقت شخصیت کے کارناموں کو فن کی کسوٹی پر، پرکھنے کی کوشش کی ہے جس میں کچھ حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔منور رانا نے ادبی اور غیر ادبی شخصیتوں کے خاکے پیش کیے ہیں جن کے ساتھ ان کو گہرا شغف تھا اور ان تمام ہستیوں کو منور رانا نے غور سے دیکھا تھا اور ان کی ذاتی اور عام زندگی میں منور رانا کے ساتھ تعلقات رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ منور رانا نے ان ہستیوں کی خوبیوں اور خامیوں کو مؤثر طریقہ سے پیش کیا ہے۔

منور رانا نے انشائیوں کو اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ معاشرے کی زبوں حالی کی داستان ملتی ہے۔انہوں نے سماج کی بدمعاشیوں، پریشانیوں، موقع پرستیوں، خودغرضیوں اور پسماندگیوں پر طنز کیا ہے اور کہیں کہیں ظرافت کے لب ولہجہ سے سماج کے نظام پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے وہ اپنے شاعرانہ عہد کا ذکر بھی انشائیوں میں پیش کرتے ہیں جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

منور رانا کے مضامین میں سادگی کے ساتھ ساتھ پُر مذاق شوخی بھی ملتی ہے ان کی تحریروں سے انسانی ضمیر جھنجھوڑا جاتا ہے اور حقائق کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا فن کے لحاظ سے اعلیٰ مقام ہے۔

منور رانا عہد حاضر کے انشائیہ نگار ہیں انہوں نے اچھے اچھے مضامین قلم بند کیے ہیں اور اپنے عہد کا منظر نامہ پیش کیا ہے جس میں تاریخی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ان کے موضوعات حقائق پر مبنی ہیں تبھی تو ان کے انشائیوں میں جھول نظر نہیں آتا بلکہ سنجیدہ اور عام فہم زبان میں پیش کیے گئے انشائیے فطری معلوم ہوتے ہیں۔

منور رانا کی نثر اور نظم میں منظر نگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔یہ خوبی منظر کے انتخاب موزوں ترین الفاظ کے صحیح استعمال اور تحریر کے صحیح ہونے کے باعث ہے ان کی ادبی نگارشات میں بہت سارے پہلو نمایاں ہیں جن سے منظر نگاری کی اہمیت وافادیت واضح ہوجاتی ہے۔

منور رانا کی تحریروں میں طنز ومزاح کا امتزاج، مزاح وفلسفہ کا مزاج، تفکر وتفنن، تنقیدی نقطۂ نظر، علمی وادبی تلمیحات واصطلاحات، شخصی حوالے، رنگین بیانی، لفظیات، تشبیہات واستعارات، اقوال زریں، ذخیرہ الفاظ، انگریزی الفاظ کا برمحل استعمال، تحریقات، جذبات نگاری، منظر کشی، نادر تشبیہات، شوخی، بذلہ سنجی، لطائف، سیاست، اردو کے چاہنے والے، شہری ودیہی ماحول، حسن وعشق کی سرمستیاں اور ملک کے مختلف شہروں کا تذکرہ ملتا ہے۔

قانہوں نے اردو نثر میں ایسا دلفریب پہلو پیدا کیا ہے جس سے اردو نثر کی رعنائی، شوخی، تندی، تلخی اور لطافت وغیرہ بیک وقت ابھر کر سامنے آتے ہیں ان کی تحریروں میں مخصوص لب ولہجہ اور اسلوب ہے جو انہیں اپنے معاصرین سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ان کی شاعری اور نثر میں تمام اسالیب اور فنی لوازمات کو بہترین ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔

منور رانا کا کلام معاصر شعراء اور ادباء میں اپنے فن واسلوب کی وجہ سے منفرد ہے ان کی تحریروں میں جاذبیت ہے ماحول کی منظر کشی ملتی ہے اور حق وباطل کا ٹکراؤ ملتا ہے۔منور رانا کے دل میں انسانیت کا درد ہے اور ایک ادیب جب قلم کا صحیح استعمال کرتا ہے تو وہ سچ کو اپنا ایمانی تقاضہ سمجھتا ہے وہ دنیا کے جبر واستبداد، سیاسی وسماجی مسائل کو ختم کرنا چاہتا ہے اسی تناظر میں منور رانا کا پورا کلام ماحول کی عکاسی کرتا ہے اردو شعر وادب کے مزاحمت پسند شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے اور ان کے ہاں مزاحمتی ادب بھی تخلیق ہوا ہے جو وقت کے حکمراں سے انسانی اقدار کی پامالیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا سبق دیتا ہے۔انہوں نے قوم وملت کی ناسمجھی، نااہلی، پرانی قدروں کی پامالی پر اظہار خیال کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا ہے جمہوریت کے نام نہاد رہنماؤں، اداروں، سامراجی ذہنیت اور اس کی قوتوں، حکومت کے فرسودہ نظام پر تنقید کی

 ISBN: 978-93-344-4743-9

ہے یہ ان کی کوئی ذاتی تنقید نہیں ہے بلکہ عالم انسان کے وقار کی خاطر حق و سچ کا رزمیہ پہلو بیان کیا ہے۔

منور رانا ایک ہی وقت میں شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ منور رانا مشاعروں میں عوام کے پسندیدہ شاعر ہیں جو اپنے لب و لہجے سے منفرد پہچان رکھتے ہیں اور ملک کے علاوہ بیرون ممالک میں بھی مختلف مشاعروں میں بحیثیت صدر مشاعرہ کے شرکت کرتے ہیں اور اپنے کلام سے سامعین و ناظرین کو نوازتے ہیں کیونکہ اردو مشاعروں میں ایک عرصہ تک خلاسی چھائی رہی لیکن نظامت گوئی میں انور جلال پوری نے اور شاعری میں منور رانا نے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

غرض یہ کہ منور رانا شخص، شاعر اور نثر نگار تینوں حیثیتوں سے اہم اور منفرد مقام کے حامل ہیں جنہوں نے اردو شعر و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں ہیں ان کا سفر ہنوز جاری ہے اور امید ہے کہ وہ مزید شعری و نثری فن پارے تخلیق کریں گے جن سے آنے والی نسلیں مستفید ہوتی رہیں گی۔ ان کی تحریریں عصر حاضر کی جگ بیتی ہیں۔ بقول منور رانا

نہ میں کنگھی بناتا ہوں نہ میں چوٹی بناتا ہوں
غزل میں آپ بیتی کو میں جگ بیتی بناتا ہوں
میری تحریر بھی میری طرح منھ پھٹ ہے اے رانا
خدا کا شکر ہے شمشیر کو خامہ نہیں لکھا
ہر لفظ مہکنے لگے لکھا ہوا میرا
میں لپٹا ہوا یادوں کے لوبان سے جاؤں

<u>حوالہ جات</u>

(۱) سخن سرائے:- منور رانا۔ مکتبہ الفہیم مئو ناتھ بھنجن یو پی۔ ۲۰۱۳ء
(۲) شہدابہ:- منور رانا۔ مکتبہ الفہیم مئو ناتھ بھنجن یو پی۔ ۲۰۱۳ء
(۳) مہاجر نامہ:- منور رانا۔ مکتبہ الفہیم مئو ناتھ بھنجن یو پی۔ ۲۰۱۳ء
(۴) ماں:- منور رانا۔ ایم آر پبلی کیشنز۔ نئی دہلی۔ ۲۰۱۵ء
(۵) مقدمہ شعر و شاعری:- الطاف حسین حالی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۲۰۱۱
(۶) رانا آرٹ ایک مطالعہ:- ڈاکٹر سروشہ نسرین۔ مژگان۔ پبلی کیشنز۔ ۲۰۱۰ء
(۷) جدید غزل:- رشید احمد صدیقی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۲۰۱۰ء
(۸) جدید شاعری:- عبادت بریلوی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۲۰۰۵ء

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

شعری ادب آزادی کے بعد

ڈاکٹر میمونہ بیگم سار دگی

اسسٹنٹ پروفیسر وریسرچ گائیڈ' شعبہ اردو' خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی کلبرگی

ہمارا ملک کثیر اللسان اور کثیر التہذیب کی علامت ہے اس میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی، معاشی اور بالخصوص مذہبی پہچان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں جو ایک گنگا جمنی تہذیب ہے جس کی مثال کرۂ ارض پر کہیں نہیں ملتی۔ یوں تو اردو ایسی زبان ہے جو کم و بیش پوری دنیا میں پڑھی، سمجھی اور بولی جاتی ہے یہ صرف میل جول اور پیار واخوت کی زبان ہی نہیں بلکہ یہ ایک جاندار انقلابی تغیر کی اختراعی زبان ہے اردو ہندوستان کی ایسی واحد زبان ہے جس نے آزادی ہند کے لیے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ چاہئے کسی بھی میدان میں ہو، زبان نے آزادی کی جیت کے گیت گائے، ترانے لکھے اور آزادی کا پرچم بلند کیا۔ آزادی سے قبل بھی اور آزادی کے بعد بھی، اس کی مقبولیت کا اصل راز یہ ہے کہ اس زبان کی شیرینی اور مٹھاس کسی اور زبان میں مزہ نہیں دیتی ہے ہر قوم و مذہب کے رہنے بسنے والوں کو یہ زبان اپنی زبان معلوم ہوتی ہے، اس میں عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کے علاوہ اور بھی بہت سی علاقائی بولیوں کے الفاظ شامل ہیں۔ جب سیاست کی جدید کاری کا زمانہ شروع ہوا اور نئے نئے مفاہیم گڑھے جانے لگے اور سیاست کا مکمل منظر نامہ ہی بدل گیا تو اسی کے نتیجے میں نوآبادیاتی نظام کا تسلط بڑی تیزی سے بڑھنے لگا جس کے سبب پورے ملک میں بہت تیزی سے تہذیبی و ثقافتی قدریں بدلنے لگیں جس کی شروعات جان گلکرسٹ کی سربراہی میں فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قیام تھابات شعری ادب کے حوالے سے ہو رہی ہے لیکن ہمیں زبان کی جامع معلومات نہیں ہوں گی تو ذہن میں بہت ساری الجھنیں جنم لیں گی چونکہ اردو کو مغل دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ جس کا پہلے پہل ادبی استعمال صوفیہ اکرام اور عوامی شعراء نے کیا۔ اس کی وجہ سے اس کو دکنی سے موسوم کیا، دکن کے اہم اور مشہور شعراء میں (پہلا صاحب دیوان شاعر) قلی قطب شاہ، غواصی، نصرتی، ابن نشاطی اور ولی اورنگ آبادی اہم ہیں۔ ولی سے متاثر ہو کر دہلی کے قابل قدر شعراء نے شاعری کا آغاز کیا۔ کمال یہ کہ اردو شاعری کو وہ اتنا ہی موزوں مانتے ہیں جتنا موزوں ان کی نظر میں فارسی شاعری تھی۔ لہٰذا اردو کی ترقی کی راہ ہموار ہوئی یہ بات بھی چاند، سورج کی طرح روشن ہے کہ اردو کلاسیکی شاعری کا سنہرا دور ۱۸۰۰ء اور ۱۹۰۰ء کا دور تسلیم کیا جاتا ہے اس دور میں اردو زبان کی لطافت اور چاشنی اپنے عروج پر تھی۔ اس کی سب ے بڑی وجہ اس دور کے زبان داں اور قادر الکلام شعراء ہیں جن میں میر تقی میر، انشاء، مصحفی، ناسخ، آتش، مومن، ذوق اور غالب قابل ذکر ہیں یہ شعراء خالص غزل کے تصور کیے جاتے ہیں صنف مثنوی میں میر حسن، دیا شنکر نسیم نواب مرزا شوق ہیں۔ نظیر عوامی شاعر مانے جاتے ہیں۔ مرثیہ کے میدان میں انیس اور دبیر ید طولیٰ رکھتے ہیں جس پر آج تک کوئی سبقت نہیں لے پایا جب کہ مرزا غالب مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے معاصر، ان کو جدید شاعری کا پہلا شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ اقبال کو بیسویں صدی کا عظیم اور بڑا شاعر مانا جاتا ہے جب کہ اس زریں دور کے نامور شعراء، ن۔م۔ راشد، میرا جی، جوش، مخدوم محی الدین، اور اختر الایمان شمار کیے جاتے ہیں یہ وہ شعری منظر نامہ ہے جو ابتداء سے اب تک قائم ہے اس منظر نامہ کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے۔ ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا تا کہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ آزادی سے قبل کون کونسے شعراء، شعری ادب کے فروغ میں پیش پیش تھے اور آزادی میں کن کن شعراء نے اپنی خدمات انجام دی تھیں نیز آزادی کے بعد سے اب تک کون کونسے شعراء، شعری سرمایہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ گو کہ اس تمہیدی گفتگو میں اردو کی ابتداء۔ عہد وسطیٰ اور ۲۰۰۰ء تک کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے تا کہ پتہ چلے کہ کب، کیسے، کیوں اردو بالخصوص شعری ادب کو فروغ ملا۔ یہ سوچنا جاننا بھی لازمی ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ کل کہاں تھے، اور آنے والے کل یعنی مستقبل میں ہم کہاں ہوں گے؟ یعنی ہمارا مستقبل کتنا تابناک ہوگا، اسی کے مدنظر ہم نے زبان کیا ہے؟ کیسی ہے؟ کیوں۔۔۔ اور کن مراحل سے ہو کر پہنچی ہے اور وہ کون تھے جنہوں نے اسے اپنے خون جگر سینچا۔

شعری ادب بہت بڑا سرمایہ ہے اس نے نہ صرف عوام کو مستفید کیا بلکہ ملک کی آزادی میں بھی اہم کردار نبھایا۔ اور ملک کو آزاد کرنے کے لیے گویا شاعری کو سب سے مضبوط وسیلہ بنایا، آزادی ملک کے لیے دو فوجیں کارساز تھیں۔۔ ایک مسلح فوج، جو ملک کی سرحد پر چوکسی برتتے ہوئے تھی تو دوسری فوج شعراء کی

تھی جو اپنی باغیانہ اور مجاہدانہ شاعری سے اہل فرنگ کے ایوانوں میں ہنگامہ برپا کیے ہوئے تھی۔ دوسری جانب وہ شعراء باشندگان وطن کو اپنے کلام کے ذریعہ ولولہ کے ساتھ حوصلہ بھی دے رہے تھے کہ صبر سے کام لو کامیابی ضرور تمہارے قدم چومے گی اور ہوا بھی ہی۔ یہ جانا لینا بھی ضروری ہے کہ اس وقت سیاسی منظر نامہ کیسا تھا جس کی وجہ سے جو مسائل رونما ہوئے اور بحرانی صورت حال پیدا ہوئی اس کی وجہ کیا تھی؟ چوں کہ ملک ایک ایسی قوم اور حکومت کے استبداد سے آزاد ہو رہا تھا جو ہندوستان پر برسہابرس سے حکومت کرتی آ رہی تھی یہ ایک ایسا تاریخی موڑ تھا جس طرح ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مغربی حکومت کے خاتمے کی دہلیز تک پہنچایا اور ایک صدی کا وہ سفر ختم ہوا جو ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ سے شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد انگریزوں کی سیاست اور جارحیت ہندوستان پر اپنے قبضے اور اختیار کو برابر مضبوط کرتی جا رہی تھی مگر یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء پر ختم ہوا۔ یہ ایک اہم موڑ تھا۔ یہیں سے ہندوستانیوں کے ذہن میں نئے نئے سوالات جنم لینے لگے کیوں کہ مغربی ذہن، زندگی اور تعلیمی اقدار سے ہم آہنگی پیدا کرنا بھی اشد ضروری تھا؟ اس وقت انگریز حکومت کی سیاسی حکمت عمل کو سمجھ کر اس کے دور رس نتائج پر نظر رکھنا اور اختلاف بھی ضرور تھا اسی کشمکش میں ایک صدی کا سفر ختم ہوگیا۔ اسی زمانے میں سرسید کی تحریک بھی معرض موجود میں آئی اور ۱۸۸۵ء کے بعد کانگریس کی قومی تحریک بھی شروع ہوئی اور ادبی سطح پر حقیقت پسندی اور رومانیت کے رویے بھی وجود میں آئے۔ اس کے بعد روس کے عالمی اور ایشیائی نتائج کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی، جب کہ ہندوستان میں نئی صنعتوں کے رواج اور ان کے ذہنی، زمینی اور زمانی اثرات نے جو مسائل پیدا کیے ان کا اظہار ۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے ذریعے سے ہوا۔

جدوجہد آزادی کا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء میں ختم ہوتا ہے ۱۴/ اور ۱۵/ اگست کی درمیانی شب میں انگریزوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اسی کے ساتھ ملک کی تقسیم کا عملی نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ یہ ایک تاریخی المیہ سے کم نہ تھا ملک بٹ گیا، ہندوستان اور پاکستان۔ یہ بٹوارہ دراصل ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی افسوس ناک تقسیم اور آزادی سے بے شمار مسائل درپیش آئے، وہیں اس انقلاب کے خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔ جہاں اس سرزمین پر آباد بے شمار انسانوں کو اندوہ ناک کوائف سے دو چار ہونا پڑا، تہذیب، زبان وثقافت، اقدار حیات، معاشی خوش حالی اور امن وسکون ہر شئے اپنے محور سے ہٹنے لگی۔ ملک کے باشعور قائدین، عوام اور اہل علم وقلم نے اس صورتحال کا زندہ دلی سے استقبال کیا۔ لیکن ابھی خاص تعداد ایسے لوگوں کی بھی موجود تھی۔ جو بر ہی حالات سے مکمل مستفید ہونے کے لیے تیار بیٹھی تھی جب کہ ملک کے پس ماندہ اور مظلوم طبقے پر ظلم وستم کے کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ لہٰذا یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ شعری ادب نے بے حد ناساز گار حالات میں قدم جمائے اس وقت شعریات کے دامن میں جو ورثہ موجود تھا وہ نہایت ہی تابناک تھا انہی تابناک روایات کے سہارے اس نے اہل وطن اور بنی نوع انسان کے درد وآشوب کی ترجمانی کی۔ اور یہ سلسلہ تحریک علی گڑھ سے شروع ہوتا ہے سرسید کی یہ تحریک شعروادب کے بلند مقاصد اور معاشراتی و مذہبی انقلاب کی ترجمان تھی۔ حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر اردو شاعری کو برگزیدہ مقصدیت اور ملی دردمندی کی طرف موڑ دیا اور ماضی وحال اور مشرق ومغرب کی قبائیں ملا دیں حالی خود فرماتے ہیں کہ "قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایسا آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں اگر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔"

وہ دن گئے جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کچھ نماز تو

علامہ شبلی اپنی نظموں میں ملی مسائل کو خوب موضوع سخن بنایا۔ شبلی عالم گیر ملی وحدت کے حامی تھے۔ مسجد کانپور کے واقعہ پر ان کی مشہور نظم کا یہ شعر

پنہائی جارہی ہیں عالمان دین کو زنجیر یں
یہ زیو ر سپہ سجا د حالی کی نشانی ہے

شبلی کی سیاسی بصیرت پر وقار عظیم کی یہ بصارت بھی خوب ہے کہ "یہ آواز ایک صاحب بصیرت مورخ کی بھی ہے ایک حق پسندی، مبصر کی بھی شاعر کی بھی جس نے تاریخ اور سیاست کے حقائق کو شاعری کے سانچے میں ڈھالا او مصلحت کی راہ پر چھوڑ کر حق گوئی کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔" اکبرالہ آبادی بڑے عظیم شاعر تھے انہوں نے بھی اس نئے ذہن پر اپنی نظموں میں تنقید کی جو سرسید کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی فکر کے نتیجہ میں وجود میں آرہے تھے۔ اس سے مشرقیت کے سلسلہ میں بے زاری اور اسلام میں تشکیک و بے اعتنائی پروان چڑھ رہی تھی یہ شعار دیکھیے۔

وہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں سید نے

ISBN: 978-93-344-4743-9

کعبہ کو کر دیا گم اور کلیسا نہ ملا

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد کی

۳

اکبر ایک دیدہ ور شاعر تھا لیکن سرسید بھی کچھ کم نہ تھے انہوں نے بھی اپنی اصلاحی تحریک سے نہ صرف معاشرہ کی اصلاح کی بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا دونوں نے بھی مغرب کی تنقید کے علاوہ مسلم معاشرے کے عیوب کو نشانہ بنایا۔

تہہ کر دو صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب
بے اثر ہوگئی شرافت مال دیکھا جائے گا

علامہ اقبال نے بھی مظلوم انسانوں بالخصوص مسلمانوں کے زوال آمادگی کے اسباب پرحکیمانہ انداز سے تجزیہ کیا اشعار ملاحظہ کیجیے

نسل نو، قومیت کلیسا، بندگی، تہذیب ، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

اقبال نے اردو شاعری کا مزاج بدلا اور درماندگی و بے چارگی کے احساس کو زائل کیا۔ابواللیث جاید رقم طراز ہیں۔ "اردو شاعری میں شاید ہی کوئی دوسرا شاعر ہو جس نے شعوری طور پر اپنے زمانہ کو اتنا متاثر کیا ہو۔" ۱۹۴۷ء کے بعد شعراء نے تقسیم وطن کے نتیجے میں کھیلی جانے والی خون کی ہولی اور بکھرتے خوابوں کی ترجمانی اپنے کلام میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔احمد راہی، انجم راہی کے کلام سے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

شب خزاں کی فردہ سیاہیاں نہ چھٹیں
امید صبح بہاراں خیال خام ہوئی
ترا کرم ہے کہ زندہ ہیں آج بھی ہم لوگ
یہ اور بات ہے کہ احساس زندگی نہ رہا

اس زمانے کی بیشتر اشعار میں بے اطمینانی خوابوں کے ٹوٹنے ،بکھرنے کا کرب، بے گھر ہو جانے کا کرب اپنے اندر سموئے ہوئے ہے حتیٰ کہ ترقی پسند شعراء جو غزل کو جاگیردارانہ نظام کی علامت تھے وہ بھی اس قیود سے باہر رہے اس لیے کہ اپنے افکار کا وسیلہ اظہار موجودہ تناظر میں رکھیں گے چنانچہ فیض،فراق۔مجروح، جذبی، مجاز،احمد ندیم قاسمی، جاں نثار اختر، تاباں، مخدوم۔ساحر لدھیانوی، سردار جعفری اور وامق نے غزل کی معنویت اور تہ داری میں اضافی کیے اور عصری مسائل سے اپنے دامن کلام کو وسیع تر کیا فیض بیک وقت نظم اور غزل کے شاعر ہیں تو فراق کے یہاں ایک خاص طرح کی دروں بینی اور جذباتی سر شاری، حسن وعشق کی واردات موجود ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تم آئے ہو نہ شب انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

(فیض)

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل

وہ رات کوئی ذرہ محو خواب نہیں

(فراق)

یہی زندگی مصیبت یہی زندگی مسرت

یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ

(جذبی)

دیکھتے رہے کہ ہو جائے نہ کم شان جنوں

آئینہ جن کے خود اپنے ہی مقابل رہے

(سرور)

اعلان حق میں خطرۂ دارودرسن تو ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ درودرسن کے بعد

(کیفی)

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں

جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

(ساحر)

۴

ان شعراء کے علاوہ اور بھی بہت سے شعراء نے غزل کی آبیاری کی اور اپنے لب ولہجہ سے غزل کو فنی اعتبار بخشا ۱۹۴۷ء کے بعد جنہوں نے شعری ادب کا رخ موڑنے کی سعی کی۔ اس سے نئے رجحان کو ترقی پسند کا ردعمل بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اعظمی ،کاظمی اور ابن انشا کا نام بھی نمایاں ہے۔ یہاں میر کا لب ولہجہ نمایاں ہے یہی داخلیت ودروں بینی، غم کی مدھم آنچ اور کسک محسوس ہوتی ہے زندگی کو ایک مخصوص انداز سے دیکھتی ہے۔ اعظمی اور ناصر کاظمی کے کلام سے شعر دیکھیے۔

جلتا نہیں اب کوئی دیا دل کے نگر میں

ویران ہے ایک ایک گلی دیکھئے کیا ہو

شور بر پا ہے خانہ دل میں

کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

شاعری کو عوامی زبان سے قریب تر کرنے کے لیے نئی لفظیات تراشی گیئں جو اپنی فنی بصیرت اور انسان دوستی کا بین ثبوت ہے ان میں بڑی دلکشی ہے۔ دیگر شعراء میں قاضی سلیم، باقر مہدی، شہریار اور کمار پاشی وحید اختر، ندا فاضلی، شاذ تمکینت نے شعری ادب میں نئے نئے تجربے کیے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ تکنیک میں بھی تجربے ہو رہے ہیں آزاد نظم، نثری نظم، تک تحریکیں گیئں صنف رباعی بھی اس سے جدا نہیں۔ جوش کی رباعیوں میں ان کا انقلابی آہنگ اور باغیانہ انداز اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود ہے۔

کتب برائے مطالعہ

پروفیسر عنوان چشتی آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل، اردو اکادمی ۱۹۹۲ء

سید عبدالباری آزادی کے بعد اردو زبان نئی او ایس، نئی دہلی ۱۹۹۸ء

شہزاد انجم آزادی کے بعد اردو شاعری، ساہتیہ اکادمی ۲۰۰۲ء

فرمان فتح پوری، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ۲۰۱۲ء

جدید شاعری اور نظم آزاد

ڈاکٹر قاضی محمد شکیل الدین

اسسٹنٹ پروفیسر، شرد چندر مہاودیالیہ شراڈھون

جدید شاعری بظاہر ایک عجیب سی اصطلاح ہے کیونکہ ہر زمانے کی شاعری جدید ہوتی ہے۔اس کو قدامت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔وہ اپنے زمانے کے نئے احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔اس زمانے کی جذباتی اور ذہنی زندگی کے سارے خط وخال اس کے آئینے میں بے نقاب نظر آتے ہیں۔کسی خاص زمانے کی شاعری کو جدید کیوں کہا جاتا ہے؟ درحقیقت جدید شاعری وہ شاعری ہے جو کسی انقلابی انداز سے بدلتے ہوئے ماحول کی صحیح ترجمانی میں خود اپنے آپ کو بدل دے۔اس کے لئے روایت سے تھوڑی سی بغاوت ضروری ہے۔تجربے کے ہاتھ کا بھی اُس میں شامل ہونا یقینی ہے جو شاعری کی روایت کی بنی ہوئی ڈگر سے تھوڑا سا ہٹ کر چلتی ہے اور جس کی رفتار میں تجربہ کا آہنگ ہوتا ہے اس کو ادبی اصطلاح میں جدید کہتے ہیں اور یہ صورت حال کسی خاص دور کی شاعری میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب احساس بدلتا ہے، زندگی کے نئے تقاضے جب نئے شعور کو پیدا کرتے ہیں۔جب سوچنے کے انداز میں تبدیلی ہوتی ہے۔جب غور کرنے کا آہنگ ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے۔جب نئے تصورات کے چراغ جلتے ہیں، نئے خیالات کی شمعیں فروزاں ہوتی ہیں، نئے نقطۂ نظر کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔نئے معیار بنتے ہیں، نئی قدروں کی تشکیل ہوتی ہے۔۔۔ اوران حالات کے سائے میں زندگی اور ادب کا قافلہ نئی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔۔۔اس عالم میں شاعری ایک نیا روپ، ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ اختیار کرتی ہے۔۔۔اسی کو جدید شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جدید شاعری کی جس تحریک کی داغ بیل انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کو منعقد کر کے آزادؔ اور حالیؔ نے ڈالی اور سرسیدؔ کی تحریک کے زیر اثر جس نے ارتقائی منزلیں طے کیں وہ انیسویں صدی کے دورِ آخر میں شاعری کی ایک اہم تحریک بن گئی۔اب شاعری کے ایک نئے انداز کا آغاز ہوا اور سارے ملک میں جدید طرز کی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ان نظموں میں مناظر قدرت کا بیان تھا، سماجی حالات کی ترجمانی تھی، قومی شعور کی عکاسی تھی، یہی سبب ہے کہ وطن پرستی، انسان دوستی اور آزادی کے خیالات ان نظموں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں یہ خیالات نہ ہوتے تو شاید ان نظموں کا وجود ہی نہ ہوتا لیکن ان میں انقلابی آہنگ نہیں ہے کیونکہ یہ انقلابی آہنگ اس زمانے کی زندگی میں ہی موجود نہیں تھا۔زندگی تو اصلاح کی راہوں پر گامزن تھی۔یہ اصلاح اس زمانے کے افراد کا نصب العین تھا۔چنانچہ اسی اصلاحی رجحان کی ایک لہر سی اس زمانے کی نظموں میں دوڑی ہوئی ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ اس دور کی نظموں میں ہئیت کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہوا۔بات یہ ہے کہ اس اصلاحی میلان کی ترجمانی کے لئے مثنوی اور مسدّس وغیرہ کے سانچے بہت کافی تھے۔بہر حال یہ جدید شاعری کے سفر کی پہلی منزل تھی اور اس کا اصل سفر تو بیسویں صدی میں شروع ہونے والا تھا۔

بیسویں صدی میں جدید شاعری آگے بڑھتی ہے۔اب اس میں ایک انقلابی آہنگ بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے دامن میں وسعتیں بھی پیدا کرتی ہے۔اس کے موضوعات بھی اب محدود نہیں رہے۔وہ سماجی معاملات کی ترجمانی اب بھی کرتی ہے۔قومی مسائل کا بیان اس میں اب بھی ہوتا ہے لیکن اس بیان میں اب نسبتاً زیادہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔سیاسی شعور بھی اب اس میں بڑھتا ہے اور وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی مسائل کو بھی اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔چکبستؔ اور اقبالؔ جدید شاعری کے اس نئے رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

چکبستؔ کی شاعری میں وطنیت کا ایک نیا تصور ابھرتا ہے۔اب وہ محض انفرادی جذباتی تصور ہی باقی نہیں رہتا بلکہ اس کی نوعیت اجتماعی اور سیاسی ہو جاتی ہے۔اور ایک سیاسی تصور کی حیثیت سے وہ ایک نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات بن جاتا ہے۔چکبستؔ کی بیشتر نظمیں اسی صورت حال کی ترجمان ہیں وہ غلامی سے نفرت کرتے ہیں انہیں آزادی سے محبت ہے۔وہ اپنے وطن کو آزاد دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے وہ جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے داخلی مسائل کو حل کرنا بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے۔وہ فرقہ پرستی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں لیکن آزادی کا تصور ان کے یہاں ہوم رول سے آگے نہیں بڑھتا شاید اس کا سبب یہ ہے کہ چکبستؔ اپنے زمانے کے اعتدال پسند سیاست کے ساتھ اتفاق رکھتے تھے۔اسی لئے وہ اپنے وطن کی بنیادی کشمکش کو نہیں سمجھتے

تھے بہر حال ان کی نظمیں ان کے زمانے کی زندگی کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ان کے یہاں انقلابی آہنگ نہیں لیکن ایک سیاسی شعور کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔وہ ہندوستانی قومیت کا ایک واضح تصور ضرور رکھتے ہیں۔ان کے یہاں ایک سماجی اور تہذیبی شعور اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے۔اسی لئے ان کی شاعری اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں زیادہ آگے بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔

اقبالؔ اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔وہ چکبستؔ سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور ان کی نظمیں اپنے زمانے کی زندگی کے مختلف رجحانات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ان کے یہاں سیاسی شعور بھی اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔تہذیبی اور سماجی معاملات کو بھی وہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔بنیادی انسانی حقائق کی جھلک بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے وہ انقلابی انداز میں بھی سوچتے ہیں۔اسی لئے ان کی نظوں میں ہر جگہ ایک انقلابی آہنگ ملتا ہے۔ابتدائی دور میں ان کے یہاں وطن پرستی کا رجحان نمایاں ہے لیکن یہ وطن پرستی جذباتی وطن پرستی نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی نصب العین ہے جس میں غلامی سے نفرت آزادی سے محبت اور بندہ وآقا کے تعلقات کی صحیح بصیرت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔کم وبیش اسی زمانے میں اقبالؔ کی نظر ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی پر پڑتی ہے اور ان پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔چنانچہ وہ اس موضوع پر متعدد نظمیں لکھتے ہیں طلوع اسلاف، تصویر درد، شمع اور شاعر، شکوہ، جواب شکوہ وغیرہ ان کی ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں وہ مسلمانوں کے معاملات ومسائل کو محسوس کر کے پیش کرتے ہیں۔انہیں نظموں میں کہیں کہیں ایک بین الاقوامی تصور کی جھلک بھی ان کے یہاں نظر آجاتی ہے اور وہ ایک عالمگیر برادری بنانے کا خواب دیکھنے لگتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں انسانیت کے بنیادی مسائل کا حل اسی طرح ممکن ہے۔انسان کے بنیادی مسائل اقبالؔ کو برابر اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں، چنانچہ خضر راہ میں وہ سرمایہ ومحنت، سلطنت، غلامی، آزادی اور اسی طرح کے بعض موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں اور خضر کی زبانی بندۂ مزدور کو بیدار ہونے کا پیام دیتے ہیں۔اور مغرب ومشرق میں انہیں اس کے دَور کا آغاز نظر آتا ہے۔آخری دور میں وہ اپنی نظموں میں تمام تر مسلمانوں کے معاملات ومسائل کو موضوع بناتے ہیں لیکن انسانیت کے خیال اور اس کے بنیادی مسائل کو نظر انداز نہیں کرتے۔ان سب کو پیش کرنے کا بھی ایک نیا انداز اقبالؔ نے پیدا کیا اور وہ اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔غرض اقبالؔ کے ہاتھوں جدید شاعری کو ایک انقلابی اور انسانی آہنگ ملا، سیاسی اور سماجی شعور سے وہ صحیح طور پر آشنا ہوئی۔۔۔اس میں بنیادی انسانی معاملات ومسائل کی ترجمانی کا احساس پیدا ہوا۔۔۔فکر وفلسفہ کا پہلو بھی اس میں نمایاں ہوا۔۔۔اور اس طرح جدید شاعری بالکل نئے حالات سے دوچار ہوئی ان حالات نے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔اقبالؔ اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔

جدیدیت کے زیر اثر اردو شاعری کے موضوع اسلوب اور ہیئت تینوں سطحوں پر واضح تبدیلیاں آئیں۔ترقی پسندوں نے نظم پر زیادہ توجہ دی تھی مگر جدیدیت پسند شاعروں نے نظم اور غزل دونوں صنفوں میں اپنے فکر وخیال کی ترجمانی بھی کی اور نئے تجربے بھی کیے۔ہیئت میں نیا پن لانے کے لیے آزاد نظم، نثری نظم، آزاد غزل اور نثری غزل کے امکانات پر غور کیا گیا ہے۔

نظم آزاد اردو شاعری کے لیے ایک زمانے میں اجنبی اور نامانوس ضرور تھی لیکن جدید دور کے بعض شاعروں نے اس کو اپنی شعری روایت میں داخل کر دیا ہے اور اب وہ اس روایت کا ایک اہم جُز بن گئی ہے۔غزل کے ساتھ ساتھ اس نے بھی ترقی کی ہے اور نئے ذہن اور نئے شعور کے علم بردار بعض شاعروں نے اس صنف میں شاعری کے اعلیٰ اور ارفع معیار قائم کئے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ یہ صنف اردو میں مغرب سے آئی ہے اور ان شعراء نے اس کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے مغربی ادبیات کی صنف جدید تحریکوں سے متاثر ہوئے ہیں۔اس کی ترقی کا زمانہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہے۔مغرب میں بھی اس نے اسی زمانے میں اپنی جگہ بنائی ہے اور اس کے اثرات پھیلتے پھیلتے اُردو تک پہنچے ہیں۔

مغربی شاعری میں نظم آزاد کی روایت یوں تو بہت پرانی ہے لیکن اس نے ایک تحریک کی صورت پہلی جنگ سے کچھ قبل ہی اختیار کی ہے۔غالباً ۱۹۱۳ء کی بات ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے بعض اہم شاعروں نے جدید نظم میں انقلابی تبدیلیوں کا ایک خواب دیکھا چنانچہ وہ سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے ایک اعلان شائع کیا جس میں جدید شاعری کے نئے تقاضوں کی وضاحت تھی۔ان شاعروں میں ایلیٹؔ، اذرا پاؤنڈ، جے۔جی۔فلیچر، رچرڈ ایلڈنگٹن، ٹی۔ایس۔فلنٹ اور ایچ۔ڈی (ہلڈا ڈولٹل) وغیرہ شامل تھے۔انہوں نے اپنے بیان میں ان خیالات کا اظہار کیا کہ شاعری میں عام زبان کا استعمال ضروری ہے۔الفاظ کو خواہ مخواہ

 ISBN: 978-93-344-4743-9

سجا کر پیش کرنے سے شاعری پیدا نہیں ہوتی۔شاعری میں الفاظ کا در و بست حالات کا پابند ہوتا ہے اور ان سے جس آہنگ کی تخلیق ہوتی ہے وہ شاعر کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔جدید دور میں چونکہ نئے خیالات کے زیر اثر شاعر کی ذہنی کیفیت بڑی حد تک بدل چکی ہے اور اس کے احساس وشعور نے نئی صورتیں اختیار کی ہیں، اس لئے جدید شاعری میں ایک نیا آہنگ پیدا ہونا چاہئے اور یہ نیا آہنگ نظم آزاد ہی پیدا کرسکتی ہے کیونکہ اس میں پابندیاں کم ہیں اور چونکہ نیا ذہن بڑی حد تک آزاد ہوکر محسوس کرنا اور سوچنا چاہتا ہے، اس لئے آزاد نظم کا استعمال اس کے لئے ضروری ہے۔جدید دور نے جو ماحول پیدا کیا ہے وہ بہت پیچیدہ ہے اس ماحول نے افکار وخیالات میں بھی پیچیدگی پیدا کردی ہے اس صورت کے حال کا اظہار بہتر طریقے سے آزاد نظم ہی میں ہوسکتا ہے کیونکہ ایک شاعر کی انفرادیت پوری طرح آزاد نظم ہی میں ظاہر ہوتی ہے موضوعات کے انتخاب میں بھی شاعر کو پابند نہیں کیا جاسکتا شاعری بنیادی طور پر شکلوں اور پیکروں (images) کا مجموعہ ہے اس لئے جاندار شکلوں اور پیکروں کا تراشنا بھی جدید دور کے شاعروں کے لئے ضروری ہے۔غور وفکر کے بغیر اعلیٰ وارفع شاعری کی تخلیق نہیں ہوسکتی، اور یہ غور وفکر کے عناصر اسی وقت شاعری میں نمایاں ہو سکتے ہیں جب شاعر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کرے، اس کے لئے ارتکاز (Concentration) ضروری ہے۔اگر ایسا ہوگا تو شاعری میں فروعی اور عام باتیں نہیں ہونگی بلکہ وہ گہرے اور ٹھوس خیالات کو پیش کرے گی۔۔ اور یہی وقت کی شاعری کا تقاضہ ہے۔یہ خیالات یورپ اور امریکہ سے نکل کر ساری دنیا میں پھیلے۔۔اور ان کے اثر سے شاعری میں ایک نئی تبدیلی رونما ہونے لگی کیونکہ ہر جگہ حالات ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلے ہی سازگار تھے۔اس تحریک نے شاعری میں انقلابی خیالات کی ایک لہر سی دوڑادی اور اس کا رنگ وآہنگ بدلنا شروع ہوا۔

آزاد نظم پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے اس کی ہئیت پر نظر پڑتی ہے اس میں مروجہ اور متداول بحروں کو استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن چونکہ ان بحروں کا آہنگ شاعر کے خیال کا پابند ہوتا ہے، اس لئے وہ اس کی روانی اور بہاؤ کی نسبت سے بحر کے مروجہ ارکان کو گھٹا بڑھا دیتا ہے ظاہر ہے کہ اس سے بحر کے مخصوص آہنگ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ارکان کے گھٹنے بڑھنے کا عمل جب شروع ہوتا ہے تو اس میں قافیے اور ردیف کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔لیکن اگر قافیہ خیال کے آہنگ اور موسیقی کا ساتھ دے اور فطری طور پر آئے تو آزاد نظم کا شاعر اس کو نظر انداز نہیں کرتا۔اس طرح جب آزاد نظم میں قافیے آتے ہیں تو اس کی موسیقی کچھ اور بھی دلکش اور اس کا ترنم کچھ اور بھی دل آویز ہوجاتا ہے۔کیونکہ ایسی صورت میں قافیے کا استعمال صرف قافیہ پیمائی کی غرض سے نہیں ہوتا بلکہ خیال کے فطری بہاؤ کی کیفیت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔راشدؔ نے لکھا ہے:

> ''قافیہ شعر کا ضروری جز نہیں بلکہ اتفاقی اور ضروری عنصر ہے۔جس شاعر کو قدرت نے آہنگ اور توازن کی حس عطا کی ہے۔اُسے قافیے کے سامنے دریوزہ گری کرنے کی ضرورت نہیں۔قافیہ اندھے کی لاٹھی کے مانند ہے۔شاعر اندھا ہوتو اسے یقیناً لاٹھی سے راستہ ٹٹولنے کے سوا چارہ نہیں۔لیکن گر شاعر کو قدرت نے آنکھیں بخشی ہیں تو لاٹھی اس کی حفاظت تو کرسکتی ہے مگر راستہ نہیں دکھا سکتی۔قافیے سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ادنیٰ شاعروں کے ہاتھوں میں نظم کے اندر ترنم اور مصرعوں کا باہمی ربط واتحاد پیدا کرنے کے لئے سب سے زیادہ سہل الحصول ذریعہ بن جاتا ہے۔حالانکہ بسا اوقات یہ ترنم اور یہ مصرعوں کا ربط واتحاد سطحی اور نظم کے دوسرے عیب کا پردہ پوش ہوجاتا ہے۔کوئی ادنیٰ شاعر، سکہ بند قافیوں کی بخشی ہوئی سہولت سے استفادہ کرنے کی ترغیب کو نہیں روک سکتا۔حالانکہ یہی ترغیب اکثر اس کی تباہی کے لئے راہیں صاف کرتی ہے۔''

اس سے ظاہر ہے کہ آزاد نظم کا شاعر قافیوں کے شعوری التزام کو پسند نہیں کرتا لیکن اگر قافیہ نظم میں فطری طور پر آئے تو اس کو روکتا بھی نہیں۔بلکہ بعض آزاد نظموں میں تو ایسی مثالیں ملتی ہیں جب ہر مصرع میں قافیہ ازخود آتا ہے اور اس سے تاثر کی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔راشدؔ نے خود اپنی بعض آزاد نظموں میں قافیے سے کام لیا ہے اور اس کے استعمال سے تاثر میں اضافہ ہوا ہے۔یہ اقتباس دیکھیئے۔

مِٹ گئے میری تمناؤں کے پروانے بھی
خوفِ ناکامی و رسوائی سے
حسن کے شیوۂ خودرائی سے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

دل بیچارہ کی مجبوری و تنہائی سے
میرے سینے ہی میں پیچاں رہیں آہیں میری
کر سکیں روح کو عریاں نہ نگاہیں میری

یہاں تقریباً ہر مصرعے میں قافیہ آیا ہے لیکن اس میں شاعر کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں۔ اسی لئے ان اقتباسات میں قافیے ایک ایسے آہنگ کو پیدا کرتے ہیں جس کی بدولت ایک مترنم کیفیت ظہور میں آتی ہے۔ آزاد نظم کے شاعروں کی توجہ چونکہ قافیہ پیمائی پر صرف نہیں ہوتی، اس لئے ان کی نظموں میں از خود اس مترنم کیفیت کا وجود ہوتا ہے اور یہ کیفیت تاثر کو گہرا کرتی ہے۔ غرض نظم آزاد کی ہیئت خیال کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ شاعر کا احساس ہی اس کو ایک مخصوص شکل دیتا ہے۔ یہ شکل نئے احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں ایک نیا آہنگ نظر آتا ہے اور کچھ نئے پیکر اُبھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ آزاد نظم کی ہیئت میں جدّت کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ جدّت نئے دور کے مزاج کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں ہے۔

اُردو کی آزاد نظم نے بھی جدّت پسندی کے ان اثرات کو قبول کیا ہے اور اس میں بھی ایک نیا اندازِ فکر اور ایک نیا طرزِ اظہار نظر آتا ہے۔ اس جدّت پسندی میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ شاعر کے داخلی تجربات ہیں۔ اردو میں جو آزاد نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں انہیں داخلی تجربات کی ترجمانی ہے۔ ان داخلی تجربات کی بنیاد شدت احساس پر استوار ہے۔ شاعر کے شعور اور لاشعور کی جھلکیاں اس میں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اسی لئے بیشتر آزاد نظموں میں اظہار اشاروں اور علامتوں کا تابع ہوتا ہے۔ اس طرح ان میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی بیشتر آزاد نظمیں مبہم بھی ہو جاتی ہیں۔ راشدؔ اور خالدؔ کی آزاد نظموں میں یہ ابہام نسبتاً کم ہے لیکن میراجیؔ کی بیشتر آزاد نظموں میں یہ ابہام پایا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ ہے کہ میراجیؔ نے لاشعور کی باتیں زیادہ کی ہیں۔ پھر بھی ان شاعروں کی آزاد نظموں میں شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

آزاد نظموں میں صرف ہلکے پھلکے موضوعات ہی کو پیش نہیں کیا گیا ہے اجتماعی زندگی اہم مسائل کی ترجمانی بھی اس صنف میں کی گئی ہے۔ فیضؔ کی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' ایک آزاد نظم ہے لیکن اس نظم میں اجتماعی زندگی کی بعض اہم حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے ۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے لڑے
جس طرح تیتری کوہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

اس نظم کی ساری فضا تمثیلی ہے علامتوں کا سہارا لے کر اس میں اجتماعی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے، اور یہی اس نظم کی خوبی ہے۔

ان کے علاوہ سردار جعفریؔ نے بھی زندگی کے بعض حقائق کو ایک مخصوص زاویۂ نظر سے اپنی بعض آزاد نظموں میں پیش کیا ہے اور اس طرح اس صنف میں بعض نئی راہیں نکالی ہیں۔ ان کی نظموں میں بلا کی تیزی اور تندی ہے۔ ان کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن آزاد نظموں میں انہوں نے جو ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔۔ ان کی آزاد نظم کا نمونہ دیکھیے ۔

ساتھیو! اب میری انگلیاں تھک چکی ہیں
اور مرے ہونٹ دکھنے لگے ہیں

ISBN: 978-93-344-4743-9

آج میں اپنے بے جان گیتوں سے شرمار ہا ہوں
میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو
تا کہ میں اپنے نغموں میں فولا دو بارود کا زور بھر دوں
میں تمہاری صفوں میں تمہاری طرح
اپنے دشمن سے لڑنے چلوں گا

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آزاد نظم نے جدید اردو شاعری میں اپنی جگہ بنالی ہے، اور ایک مقام پیدا کرلیا ہے۔اس نے جدید شاعری کے تمام رجحانات کو اپنے دامن میں سمویا ہے۔۔نو جوان ذہن کی مختلف اور متنوع کیفیات کی صحیح عکّاسی کی ہے۔وہ نئی زندگی کے پیچیدہ ماحول کی صحیح ترجمان ہے۔۔۔اس نے نئے موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور نئے اسالیب کی تخلیق کرنے کے نئے حالات کے تقاضوں کو پورا کیا ہے اس لئے وہ نئی زندگی اور جدید شاعری دونوں کے لئے اب اجنبی اور نامانوس نہیں رہی ہے۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

اردوغزل میں جدیدیت کے رجحانات

ڈاکٹر صدیقی افروزہ خاتون مجیب الحسین

صدر شعبہ اُردو، چشتیہ کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس خلدآباد ضلع اورنگ آباد (مہاراشٹر)

جدیدیت کی وہ ادبی تحریک جو مغرب میں پہلی عالمی جنگ کے بعد باقاعدہ ظہور پذیر ہوئی، اس کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی کے مغربی ادب میں نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ تحریک اس جدید زندگی کی آئینہ دار تھی جو روشن خیالی، صنعتی انقلاب، امریکا اور فرانس کے سیاسی انقلابات اور سائنسی ٹیکنالوجی پر استوار تھی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے آغاز ہونے والی یہ جدید زندگی انیسویں صدی میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی اور جس کے نتیجے میں مغرب میں ناول، افسانہ اور جدید نظم کے سفر کا آغاز ہوا۔ ہندوستانی معاشرت کی عکاسی اس دور میں غزل کر رہی تھی، چنانچہ اس کے ابتدائی نقوش بھی غزل ہی میں معرض اظہار میں آئے۔ غالب وہ عظیم شاعر ہے جس نے اسے اپنے تخلیقی تجربے کے ذریعے سب سے پہلے وجدانی اور لاشعوری طور پر دریافت کیا۔ اکیسویں صدی میں نمایاں ہونے والے ''صارفی کلچر'' کو انہوں نے کتنی گہرائی سے دو سو سال پہلے پیش کیا ہے، دیکھئے:

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوس زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

غالب ہی پہلا شاعر ہے جس نے عشق پر استوار تہذیب کی بساط لپٹنے کی پہلی خبر اپنی غزل میں دی:

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئِ مردِ افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

غالب کی شاعری میں جدیدیت کے گہرے رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور ہمیں متوجہ کر رہے ہیں کہ ساٹھ کی دہائی میں اردو ادب میں مصنوعی طور پر پیدا ہونے والی جدیدیت کی تحریک کے تخلیقی نقوش کس طرح انہوں نے انیسویں صدی کے نصف اول کی غزل پر ثبت کئے۔ یہ نقوش لفظیات سے فکریات تک غالب کے پورے تخلیقی تجربے پر سایہ فگن ہیں۔ خود غالب نے اسے شعوری طور پر قیام کلکتہ کے دوران میں دریافت کیا، لیکن ان کا عظیم تخلیقی تجربہ اسے پہلے ہی دریافت کر چکا تھا۔

غالب کے بعد حالی و آزاد نے اُردو شاعروں کو لفظیات، صوتیات اور موضوعات بدلنے پر مائل کیا۔ حالی نے عملی طور پر اپنی غزل میں یہ کام کر کے نمونہ بھی فراہم کیا لیکن حالی کی کاوش میں بیشتر مقامات پر تخلیقی تجربے کی وہ گہرائی نہیں جو ان کا مطمع نظر تھا۔ یہ کام بعد میں اقبالؒ کی غزل میں ممکن ہوا۔ اقبالؒ فی الاصل نظم کے شاعر تھے تاہم ان کی غزل میں وہ گہرائی ہے جو بعد کے شاعروں کو نصیب نہیں ہوئی۔ اُردو کے جدید ادب میں تخلیقی تجربے کا بہترین اظہار نظم میں ہوا۔ غزل میں نئے پن کی جھلک تو ہے لیکن زیادہ تر نئے شاعر رومانی طرزِ احساس کے حامل تھے چنانچہ نئے پن کے باوصف اپنے عہد کی جدید زندگی کو اس طرح دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جس طرح غالب اور ان کے بعد اقبالؒ نے کیا۔ یگانہ اور فراق اقبالؒ کے جونیئر تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے ربع ثانی میں اردو غزل کو وہ نیا رنگ روپ دیا جس کا تسلسل آج اکیسویں صدی میں بھی جاری ہے۔ یگانہ کلاسیکی مزاج رکھنے والے انسان تھے، چنانچہ جدید زندگی نے جس طرح اعلیٰ انسانی اقدار کا خاتمہ کر کے ایک تاجرانہ زندگی کو فروغ دیا، اس کے خلاف بہت شدید ردعمل ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اسی مناسبت سے ان کے اسلوب شعر میں وہ غصہ، درشتی اور کھردرا پن محسوس ہوتا ہے جو مسائل کا زائیدہ تھا۔ خود انہیں زندگی میں جن مسائل اور مصائب سے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

گزرنا پڑا، اس کا عکس بھی ان کے اسلوب کی تشکیل میں کارفرما نظر آتا ہے۔ یگانہ کی روایت بعد میں سلیم احمد اور ظفر اقبال کی شاعری میں ارتقا پذیر ہوئی۔ ساٹھ کی دہائی میں اینٹی غزل کے تجربے کے پیچھے بھی یگانہ ہی کے طرز احساس کی چھوٹ پڑتی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں اس حیرت انگیز حقیقت کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے کہ جوں جوں اردو ادب کی تہذیب پر اس جدیدیت کے اثرات بڑھتے گئے، غزل میں تجربات زیادہ ہو گئے، گہرائی کم ہو گئی اور معیار کے باوصف مقدار میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اگر تیس کی دہائی کے بعد کے ادب کو سرسری بھی دیکھیں تو کوئی ادیب منٹو، بیدی کے ادبی مقام کو پہنچتا ہے اور نہ راشد، میراجی، مجید امجد کے تخلیقی معیار پر نظر آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ فراق، یگانہ ہیں یا پھر ان کے جونیئر ناصر کاظمی جو اپنے تجربے میں کلاسیکی روایت سے مختلف اور اپنی لفظیات، موضوعات، استعارات اور تمثالوں میں نئے ہیں۔

یہاں ہمیں دہرا لینا چاہیے کہ جدیدیت کی مغربی تحریک فنی طور پر علامت، تجرید اور فکری طور پر وجودیت کے فلسفے سے منسلک تھی اور دونوں کا تعلق انفرادیت سے ہے۔ اس تحریک کے پس منظر میں جو تاجرانہ معاشرت نظر آتی ہے، اس نے جاگیرداری نظام کی اجتماعیت کو ختم کر کے انفرادیت کو فروغ دیا۔ جاگیرداری نظام کی بنیاد خاندان، برادری اور قبیلے پر تھی جب کہ سرمایہ داری نظام میں فرد کو مرکزیت حاصل ہے کیونکہ ہر فرد صارف ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کلاسیکی ادوار میں اجتماعی علامتوں میں شاعری ہوئی اور جدیدیت کے اثرات سے شخصی علامتیں تخلیق ہوئیں۔ کلاسیکی شاعری فکری طور پر وحدت الوجودی فکر سے منسلک تھی تو جدید شاعری، وجودیت کے فلسفے سے اثر پذیر ہوئی جس کا مرکز فرد یعنی ''میں'' ہے۔ کلاسیکی شاعری صیغہ جمع متکلم ''ہم'' سے معمور ہے۔ وہاں ہمیں ''میں'' کم سے کم نظر آتا ہے کیونکہ وحدت الوجودی فلسفہ ''میں'' کو ذات مطلق میں ضم کر دیتا ہے۔ ''میں'' بذات خود کچھ نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کا ایک عنصر ہے۔ یہاں میں ایک اور بات عرض کرنا چاہونگی کہ میرا ل ادب کا مطالعہ اس بات کی توثیق نہیں کرتا کہ ساٹھ کی دہائی میں اردو ادب پر جدیدیت کے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس دوران میں ہمارے ادیبوں نے شعوری طور پر مغربی جدیدیت کو اردو ادب میں مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن جدیدیت اپنی پوری آب و تاب سے اور اپنی روح کے ساتھ ہمیں اردو ادب میں اس وقت نظر آئی جب وسائل پر قبضے کیلئے ہمارے خطے پر مغربی طاقتوں نے غیر علانیہ تیسری عالمی جنگ مسلط کی۔ مغرب میں پہلی عالمی جنگ بھی تاجرانہ مقاصد کے حصول کیلئے لڑی گئی اور اس کے نتیجے میں وہاں جدیدیت کی تحریک پیدا ہوئی، لیکن اس کے ساتھ انقلاب روس بھی برپا ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد وہاں جدیدیت کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا اور انقلاب چین برپا ہوا۔ 1979ء سے آغاز ہونے والی تیسری غیر علانیہ عالمی جنگ کیلئے انہوں نے ایشیا کو میدان جنگ کے طور پر منتخب کیا ہے چنانچہ گزشتہ چالیس سال کے ادب پر جدیدیت کے اثرات فطری طور پر مرتب ہوئے۔ ساٹھ کی دہائی کے مصنوعی علامتی و تجریدی ادب نے ادب اور قاری کے درمیان فاصلہ پیدا کیا اور موجودہ دور میں فطری جدیدیت اور قاری کا تعلق جوڑ رہی ہے اور آنے والے سالوں میں اور زیادہ جوڑے گی۔ اب ہمارے ادب کی علامتیں ہماری زندگی نے پیدا کی ہیں اور ہمارے تجربے کی زائیدہ ہیں۔ ایک بات تو میں نے عرض کی کہ صیغہ واحد متکلم گزشتہ نصف صدی کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ فراواں ہوتا چلا گیا ہے۔ اب ''ہم'' کو اجتماع میں ضم فرد کیلئے استعمال کرنے والے شاعر خال خال ملیں گے۔ 1979ء کے بعد جوں جوں زندگی آگے بڑھی اردو غزل میں ''میں'' کا استعمال فراواں ہوتا گیا حتیٰ کہ شعری مجموعوں کے عنوانات میں بھی ''میں'' شامل ہو گیا۔ جدیدیت کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ اردو ادب میں بھی مغرب کی طرح ناول کا تجربہ بنیادی تخلیقی تجربہ بنا۔ گزشتہ ربع صدی میں اردو میں اہم ناولوں کی تعداد اِس سے پہلے کے ڈیڑھ سو برسوں میں لکھے جانے والے اہم ناولوں سے زیادہ ہے، لیکن دیگر اصناف بشمول غزل بھی جدیدیت کے اثرات سے نہیں بچ سکی۔

غزل کی شاعری پر دوسرا اثر یہ ہوا کہ صنعتی آلودگی کے ردعمل میں اس دور کی غزل میں فطرت کے استعاروں کی بہتات نظر آتی ہے۔ شجر، پرندے، پھول، دریا اور دیگر عناصر فطرت کے استعاروں میں ڈھلنے لگے۔ جہاں بیسویں صدی کے نصف آخر کی غزل میں کارواں، رستہ، منزل، سفر، خواب، چراغ آئینہ کی اجتماعی علامات ہمیں بیشتر شاعروں کے ہاں نظر آتی ہیں، وہاں گزشتہ ربع صدی کی غزل میں شخصی علامتوں کی بھرمار ہے۔ یاد رہے کہ یہاں مشاعراتی غزل کی بات نہیں ہو رہی حالانکہ مشاعراتی غزل بھی ان اثرات سے بچی ہوئی نہیں ہے۔ اس غزل میں سائنسی ایجادات، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور تاجرانہ معاشرت سے منسلک لفظیات فراوانی سے ملتی ہے۔ اگر چہ جدیدیت کے اثرات غزل کی لفظیات، استعارات اور علامات پر بھی بہت نمایاں ہیں لیکن جدیدیت فی الاصل ایک مختلف طرزِ احساس، طرز فکر اور طرزِ حیات کا نام ہے، اس لئے اس دور کی غزل موضوعاتی اور فکری طور پر زیادہ تبدیل ہوئی ہے۔ منافقت، خود غرضی، سخت دلی، خرید و فروخت، عدم برداشت، لالچ، خوف، دہشت، ظلم اور بربیت ہمارے وجود میں بھی پیدا ہوئے ہیں اور غزل میں بھی۔ چلیے! ذرا ساٹھ کی دہائی کی جدیدیت اور گزشتہ چالیس سال کی جدیدیت کا فرق غزل کے شعروں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد غزل کچھ یوں جدید ہوئی:

ISBN: 978-93-344-4743-9

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کے چلی حیات
نکلی برونِ شہر تو بارش نے آ لیا

مجھے کبڑا نہ سمجھو، زندگی پر
میں ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا ہوں

دکانِ اسلحہ سے میں نے جو شمشیر لی ہے
میں اس کے دام پوچھوں گا نہ اس کے دام دوں گا

...

بچھڑ کے تجھ سے نہ دیکھا گیا کسی کا وصال
اڑا دیے ہیں پرندے شجر پہ بیٹھے ہوئے

اب گزشتہ ربع صدی کے اس غزل کے چند شعر دیکھئے جس میں جدیدیت کا اظہار فطری، گہرا اور مختلف ہے، جس میں اقدار حیات کا فقدان، نئی لفظیات، تجارتی معاشرت اور فرد کی فرد ہونے کی روداد پیش ہوئی ہے:

دھوپ کچھ اتنی زیادہ ہے کہ اب سوچتا ہوں
میں کسی پیڑ کے سائے میں تمنا رکھ دوں

گلوں کی تازگی، خوش بو، ہنسی برائے فروخت
ہے اس چمن میں ہر اک چیز ہی برائے فروخت

میری تقسیم بار بار ہوئی
اب تو میں بھی نہیں رہا مجھ میں

نقلی پھول، پرائی بات نہ بھیجا کر
بنے بنائے پیغامات نہ بھیجا کر

قمری تیری کوکو پر اب کان دھرے گا کون
اپنی اپنی دیواریں ہیں، اپنے اپنے کاگ

غزل ایک کلاسیکی روایتی صنف ہے، اس پر جدیدیت کے اثرات مرتب تو ہوئے ہیں لیکن اس طرح نہیں ہوئے جس طرح ناول، افسانے اور نظم پر مرتب ہوئے ہیں، اس کے باوجود اگر ہم اس صنف کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کریں تو سرمایہ داری نظام کے ردعمل میں تخلیق ہونے والی دوسری جنگِ عظیم سے قبل کی غزل، ساٹھ کی دہائی میں مصنوعی طور پر جدیدیت کی تحریک کے زیر اثر لکھی جانے والی غزل اور گزشتہ ربع صدی میں کہی جانے والی فطری طور پر جدید غزل، تینوں تجربے مختلف نظر آتے ہیں۔ آج اردو میں جو غزل کہی جا رہی ہے وہ اپنی لفظیات، استعارات و علامات اور موضوع و فکر ہر حوالے سے جدید زندگی سے فطری طور پر ہم آہنگ ہے۔

آزادی کے بعد اُردو شاعری میں روایت اور جدیدیت کا تفاعل

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ
گورنمنٹ کالج، اورنگ آباد

اُردو شاعری اپنی ابتدا سے لے کر آج تک مختلف ادبی رجحانات اور تحریکات کے زیرِ اثر رہی ہے۔ کلاسیکی شاعری میں عشق، صوفیانہ تصورات، قدرت کے مظاہر اور فلسفیانہ خیالات کا غلبہ رہا، جبکہ ترقی پسند تحریک نے سماجی شعور، انقلاب اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ آزادی کے بعد اُردو شاعری میں روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک فکری مکالمہ شروع ہوا، جہاں بعض شعرا نے روایت کو برقرار رکھا، جبکہ بعض نے جدیدیت کے اصولوں کو اپنایا۔

اُردو شاعری کی تاریخ مسلسل ارتقائی مراحل سے گزرتی رہی ہے، جس میں مختلف ادبی تحریکات، فکری مکاتبِ فکر اور سماجی و ثقافتی عوامل نے اہم کردار ادا کیا۔ اُردو شاعری کا ابتدائی دور کلاسیکی روایات کا حامل تھا، جہاں فارسی و عربی کے اثرات غالب تھے۔ غالب، میر، سودا، اور مومن جیسے شعراء نے غزل کو فکری وسعت دی، جبکہ مثنوی اور مرثیہ نگاری کی صورت میں داستانوی اور المیہ شاعری بھی فروغ پاتی رہی۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ترقی پسند تحریک نے شاعری میں ایک نیا رجحان متعارف کروایا، جس نے ادب کو سماجی حقیقت نگاری اور معاشرتی شعور سے جوڑا۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کا رجحان بھی اُردو شاعری میں سرایت کرنے لگا، جس نے روایت کو ایک نئے انداز سے دیکھا اور شاعری میں داخلی تجربات، علامتی اظہار، اور مجرد فکر کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

آزادی کے بعد کا دور اُردو شاعری میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ اس دور میں جہاں کچھ شاعروں نے کلاسیکی روایات کو برقرار رکھا، وہیں بعض نے جدید اسلوب اور رجحانات کو اپنایا۔ فیض احمد فیض، سردار جعفری، اور مجروح سلطانپوری جیسے ترقی پسند شعراء نے روایت اور جدیدیت کے امتزاج سے شاعری کو وسعت دی، جبکہ ن۔م۔راشد، میراجی، اور جون ایلیا جیسے شاعروں نے جدیدیت کو مکمل طور پر اپنا کر ایک نئے شعری اظہار کو فروغ دیا۔

اردو شاعری کی تاریخ میں روایت اور جدیدیت کا تفاعل ہمیشہ سے ایک اہم مسئلہ رہا ہے، لیکن آزادی کے بعد کے دور میں یہ پہلو اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔ اس کی بنیادی وجہ برصغیر کی تقسیم، نئے سماجی، سیاسی اور ثقافتی تناظر میں تبدیلیاں، اور عالمی ادبی تحریکوں کا اثر تھا۔ آزادی کے بعد اردو شاعری میں ایک طرف روایت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا رجحان دیکھا گیا، تو دوسری طرف جدیدیت کے نئے اسالیب اور تجربات کو بھی جگہ دی گئی۔

روایت سے مراد وہ کلاسیکی اقدار، اسالیب، موضوعات اور طرزِ اظہار ہیں جو صدیوں پر محیط اردو شاعری میں پروان چڑھے۔ میر، غالب، اقبال، سودا، درد، انیس، اور دبیر کی شاعری اس روایت کے مختلف رخ ہیں۔ دوسری طرف، جدیدیت ایک فکری تحریک کے طور پر مغرب کے اثرات سے اردو شاعری میں داخل ہوئی اور اس میں نئی علامتیں، جدید لب ولہجہ، اور انسانی تجربات کے پیچیدہ پہلو شامل ہوئے

روایت کا تسلسل: کلاسیکی اثرات

اردو شاعری کی روایت صدیوں پر محیط ہے اور آزادی کے بعد بھی اس کا اثر نمایاں رہا۔

1۔غزل کی بالادستی

آزادی کے بعد بھی غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف رہی۔

میر، غالب، اقبال اور فراق گورکھپوری جیسے کلاسیکی شعرا کی روایت کو فیض احمد فیض، احمد فراز، ناصر کاظمی، اور پروین شاکر نے آگے بڑھایا۔

روایتی تغزل، محبوب، ہجر و وصال، اور تصوف جیسے موضوعات جدید پس منظر میں بیان کیے گئے

2۔کلاسیکی لب ولہجہ

کلاسیکی شاعری میں جو نغمگی، رعایتِ لفظی، اور محاوراتی چاشنی تھی، وہ آزادی کے بعد کی شاعری میں بھی موجود رہی۔ مثلاً، ناصر کاظمی کی شاعری میں میر کی سادگی اور فکری گہرائی نظر آتی ہے۔

3۔ اصناف کا تحفظ

روایتی اصناف جیسے غزل، رباعی، اور مسدس آزادی کے بعد بھی تخلیق ہوتی رہیں۔ حالی، اقبال، اور جوش ملیح آبادی کے بعد نظم میں بھی روایتی اثرات باقی رہے، جیسے فیض کی انقلابی نظموں میں حالی کی اصلاحی شاعری کی جھلک ملتی ہے۔

جدیدیت کا آغاز اور اثرات

جدیدیت بنیادی طور پر روایت کے ردعمل میں پیدا ہوئی، جو 1960 کی دہائی میں ایک ادبی تحریک کے طور پر ابھری۔ اس کا اثر اردو شاعری پر مختلف سطحوں پر نظر آتا ہے:

1۔ داخلی انفرادی اظہار

جدیدیت نے اجتماعی فکر کے بجائے فرد کی داخلی کیفیت اور نفسیاتی کشمکش پر زور دیا۔ ن م راشد، میراجی، اور منیر نیازی کی شاعری میں وجودیت (Existentialism) اور داخلیت نمایاں ہے۔

2۔ آزاد نظم اور نثری نظم کی مقبولیت

روایت کی پابندیوں سے ہٹ کر شاعری میں آزاد نظم اور نثری نظم نے جگہ بنائی۔ ن م راشد نے پابند نظم کے بجائے آزاد نظم کو ترجیح دی، اور ان کے ہاں مغربی شاعری کے اثرات نمایاں ہوئے۔

3۔ نئے موضوعات

جدید شاعری میں جنس، نفسیات، بے معنویت، اور شہری زندگی جیسے موضوعات آئے۔ فیض کی شاعری میں جہاں روایت کا اثر تھا، وہیں جدید دور کی پیچیدگیوں کو بھی شامل کیا گیا۔

4۔ زبان و اسلوب میں تجربات

جدید شاعری میں استعارات اور علامتوں کا استعمال بڑھ گیا۔ میراجی کی شاعری میں علامتی رنگ اور نفسیاتی گہرائی جدیدیت کی علامت بن گئی۔

روایت اور جدیدیت کا امتزاج

آزادی کے بعد اردو شاعری میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج ایک دلچسپ پہلو کے طور پر سامنے آیا:

1۔ ترقی پسند روایت اور جدید رنگ

فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، اور ساحر لدھیانوی نے روایتی اسلوب میں جدید سماجی شعور شامل کیا۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی غزل کی نرمی اور جدید نظم کی بے باکی ساتھ نظر آتی ہے۔

2۔ جدید شاعروں میں کلاسیکی اثرات

ناصر کاظمی اور احمد فراز نے روایت اور جدیدیت کے سنگم کو کامیابی سے نبھایا۔ پروین شاکر کی شاعری میں کلاسیکی تغزل اور جدید عورت کے احساسات ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔

3۔ جدیدیت اور لسانی مابعد تجربے

آزادی کے بعد، اردو شاعری میں روایت اور جدیدیت کے امتزاج نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ جون ایلیا، افتخار عارف، اور کشور ناہید جیسے شعرا نے روایت کو نئے انداز میں پیش کیا۔ آزادی کے بعد اردو شاعری روایت اور جدیدیت کے سنگم پر کھڑی رہی۔ جہاں ایک طرف غزل، تغزل، اور کلاسیکی شعری آہنگ باقی رہا، وہیں دوسری طرف جدیدیت نے اس میں نئے فکری زاویے، داخلی کیفیت، اور آزاد اسلوب متعارف کرایا۔ یوں، آزادی کے بعد کی اردو شاعری ایک متحرک اور ہمہ جہت

ISBN: 978-93-344-4743-9

صنف کے طور پر ابھری، جس میں روایت کی جڑیں مضبوط رہیں اور جدیدیت کے تجربات نے اسے مزید وسعت دی۔ اُردو شاعری میں روایت کا ایک مستحکم تسلسل موجود رہا ہے، جس کی جڑیں فارسی اور عربی شعری روایات میں پیوست ہیں۔ میر تقی میر، غالب، مومن، اور انیس جیسے کلاسیکی شعراء نے اُردو شاعری کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ ان کے بعد بھی یہ روایت چلتی رہی، اور آزادی کے بعد کئی شاعروں نے کلاسیکی روایات کو اپنایا یا ان سے استفادہ کیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی اپنی کتاب میں کہا

"اگر میں غالب کی شاعری کو ایک پلڑے میں رکھوں اور اردو شاعری کے باقی تمام شعری سرمائے کو دوسرے پلڑے میں، تو غالب کا پلڑا بھاری رہے گا۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی، ''غالب: معنی آفرینی، جدلیات اور شعریات''، صفحہ 134)

غالب کی شعری روایت کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، جو آزادی کے بعد بھی اُردو شاعری پر گہرے اثرات مرتب کرتی رہی۔ غالب کی شاعری میں جو فلسفیانہ گہرائی، جدلیاتی انداز اور فکری وسعت تھی، وہ جدید شاعری میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

"جدید شاعری روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، مگر اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتی ہے۔"

(وزیر آغا، ''اُردو شاعری کا مزاج''، صفحہ 78)

جدید شاعری اور روایت کے باہمی ربط کو بیان کرتا ہے۔ جدید شاعری نے کلاسیکی روایات سے استفادہ کیا مگر نئی تکنیک، علامتی اظہار، اور جدید فکری میلانات کو اپنایا، جو اس کے انفرادیت کا باعث بنے۔

آزادی کے بعد جدیدیت کا آغاز اور اس کے اثرات

ازادی کے بعد جدیدیت اُردو شاعری میں ایک فکری اور اسلوبیاتی تحریک کے طور پر سامنے آئی، جس کا مقصد شاعری کو روایتی بندھنوں سے آزاد کر کے نئے امکانات پیدا کرنا تھا۔ آزادی کے بعد کے دور میں علامتی شاعری، داخلی کرب، وجودیت، اور سماجی اضطراب جیسے موضوعات نمایاں ہونے لگے۔:

"میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے "

(جون ایلیا، ''شاید''، صفحہ 43)

جون ایلیا کی شاعری جدیدیت کے رجحانات کی عکاسی کرتی ہے، جہاں داخلی کرب، شناخت کی تلاش، اور وجودی مسائل واضح نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں روایت کی جھلک موجود ہے، مگر جدید طرزِ احساس کے ساتھ، جس سے ان کی شاعری ایک منفرد حیثیت اختیار کرتی ہے۔

"دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے، کتابوں کو ہٹا کر دیکھو "

(ن۔م۔ راشد، ''لا = انسان''، صفحہ 92)

ن۔م۔ راشد کی شاعری جدید علامتی اسلوب اور داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہاں روایت کی بجائے جدید طرزِ احساس نمایاں ہے، جو قاری کو عملی زندگی کے تجربات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

روایت اور جدیدیت کا امتزاج: ایک تفاعل

بعض شعرا نے روایت اور جدیدیت کے امتزاج سے ایک منفرد اسلوب تخلیق کیا، جن میں فیض احمد فیض، احمد فراز، ظفر اقبال، اور منشا یاد شامل ہیں۔

"ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے "

ISBN: 978-93-344-4743-9

(فیض احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، صفحہ 118)

فیض کی شاعری روایت اور جدیدیت کے حسین امتزاج کی مثال ہے۔ان کے ہاں کلاسیکی غزل کی نرمی اور جدید شاعری کا شعور دونوں موجود ہیں، جو شاعری کو ایک منفرد جہت عطا کرتے ہیں۔

"یہ جو سنگ میل ہیں راستے میں، کوئی لمحہ ہو، کوئی شام ہو
انہیں روندنے کی ہوس نہ کر، انہیں چومنے کی طلب نہ کر "

(ظفر اقبال، ''گرفت''، صفحہ 56)

ظفر اقبال نے جدید لب و لہجے میں شاعری کی اور روایت سے انحراف کیا، مگر روایت کو مکمل طور پر ترک بھی نہیں کیا۔ان کے ہاں روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک فکری مکالمہ محسوس ہوتا ہے۔آزادی کے بعد اُردو شاعری میں روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک تخلیقی اور فکری تفاعل جاری رہا۔ جہاں روایت نے شاعری کو گہرائی، تہذیبی تسلسل، اور کلاسیکی آہنگ فراہم کیا، وہیں جدیدیت نے نئے موضوعات، علامتی اظہار، اور داخلی تجربات کو وسعت دی۔ یہ امتزاج اُردو شاعری کے مستقبل کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے، جہاں شاعر روایت سے جڑ کر جدید امکانات کی طرف بڑھتے ہیں۔

حوالہ جات

فاروقی، شمس الرحمٰن۔ ''غالب: معنی آفرینی، جدلیات اور شعریات''۔ مکتبہ جامعہ، دہلی، 1990۔

. آغا، وزیر۔ ''اُردو شاعری کا مزاج''۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1984۔

. جون ایلیا۔ ''شاید''۔ الفیصل ناشران، لاہور، 1998۔

. راشد، ن۔م۔ ''لا = انسان''۔ اردو اکادمی، دہلی، 1975۔

. فیض، احمد۔ ''نسخہ ہائے وفا''۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2004۔

. ظفر اقبال۔ ''گرفت''۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2006۔

☆☆☆

بشیر بدؔر: جدید اردو غزل کی آبرو

ڈاکٹر صدیقی محمد عرفان سعداللہ غازی الدین
پرنسپل ملیہ گرلز ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج بیڑ

اردو شاعری چاہے قدیم ہو یا جدید ہر دور پر عہد میں اہل زبان کے دل کی ترجماں ٹھہری۔ خسرو کی پہیلی، میرؔ کی ہمراز، غالبؔ کی سہیلی وقت کے پنگھوڑے میں سوار اکیسویں صدی میں جب بشیر بدؔر کی دہلیز پر پہنچی تو بشیر بدر کی شگفتہ بیانی اسے آئینہ میں اتارنے کے لیے بیقرار بیٹھی تھی۔ اعلان ہو گیا کہ ؎

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
میرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اتار لوں
اگر آسماں کی نمائشوں میں مجھے بھی اذن قیام ہو
تو میں موتیوں کی دکان سے تری بالیاں تیرے ہار لوں

سادہ سلیس گفتگو کی زبان کو شعروں کی نغمگی میں ڈھالنے والے، منفرد اسلوب کے حامل سید محمد بشیر بدؔر ۵؍فروری ۱۹۳۵ کو کانپور کی خاک سے پیدا ہوئے۔ یہ شخصیت بچپن ہی سے شعر و ادب کی رسیا تھی۔ ساتویں جماعت میں نیاز فتح پوری کے رسالہ ''نگار'' سے منظر عام پر آنے والا یہ شاعر ۲۰ سال کی عمر تک ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں اپنی ایک منفرد شناخت بنا چکا تھا۔

اسلوب کی سادگی میں جذبوں کی حدّت نے ان کی شاعری میں ایک عجیب سی غنائیت برپا کر دی تھی۔ جس کی جھلک مندرجہ ذیل ہیں ؎

تم مجھے چھوڑ کے جاؤ گے تو مر جاؤں گا
یوں کرو جانے سے پہلے مجھے پاگل کر دو
آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

بشیر بدر نے اپنے دل کی تمام تر شدتوں کو لفظوں کی رعنائیوں کے ہمراہ جس صداقت سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے، نئے حسی پیکر تراشے ہیں۔ نئے زمانے کے لہجے میں جس سادگی کے ساتھ محبت کو لفظوں میں سمویا ہے وہ انہیں کا خاصّہ ہے ؎

اگر تلاش کروں کوئی مل ہی جائے گا
مگر تمہاری طرح کون مجھ کو چاہے گا
تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا
تمہارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسا ہے
تمہارے بعد یہ موسم بہت ستائے گا

انہوں نے روائتی مضامین اور ترقی پسندی و جدیدیت کے نظریاتی حصار سے آزاد رہتے ہوئے عام آدمی کے روزمرّہ کے تجربات و مشاہدات کو شعری اظہار میں ڈھال کر اردو داں طبقے کے ساتھ ساتھ غیر اردو داں طبقے کی بھی توجہ اپنی جانب مرکوز کر لی تھی ؎

بشیر بدؔر کی غزل کا مجموعی آہنگ یکسر غیر روایتی ہے۔ وہ محبوب کا حسن ہو، زمانے سے شکایت ہو، مظاہر کائنات کا تذکرہ ہو انہوں نے ان سب کا احساس منفرد

اندازمیں کیا ہے۔جو ہم عصر شعراء سے انہیں جدا کرتا ہے۔جیسے ۔

بے وقت اگر جاؤں گا لوگ چونک پڑیں گے
ایک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

ان کی غزلوں میں اک نازک ڈرامائی کیفیت ملتی ہے۔انکے اشعار محض اک واردات نہیں بلکہ انکشافات کرتے ہیں۔جن میں علامات واستعارات کی لطیف سی نقاب پوشیدہ نظر آتی ہے۔کہتے ہیں کہ ہر شاعر وادیب کی زندگی کے داخلی اثرات اسکی ادبی زندگی پر گہرے نقوش مرتب کرتے ہیں پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری مکمل کرنے والی، زبان وادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والی، باوقار ادبی شخصیت کی زندگی میں میرٹھ کے فسادات نے جو انقلاب برپا کیا وہ انکی شخصیت بدل گیا ۔

شاعر وادیب معاشرے کے سب سے حساس اشخاص ہوتے ہیں۔ان کی حساسیت ہی انہیں قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔زندگی کی لطافتیں ان کے لہجے میں محبتیں گھول دیتی ہیں جن کے گواہ ان کے اشعار بن جاتے ہیں۔وہیں یہی اشعار درد وکرب کے لمحات کی عکاسی کرتے ہوئے بھی نہیں چوکتے۔کہتے ہیں کہ درد واذیت اک شاعر کی میراث ہے اور عمر کے اک موڑ پر بشیر بدر کو دان کردی گئی۔خلاصہ یہ ہے کہ کانپور میں آنکھ کھولنے والے بشیر بدر دوران ملازمت میرٹھ میں تعینات تھے ۔۱۹۸۷ کے میرٹھ فسادات میں دہشت پسندوں نے شاعر کا آشیانہ لوٹ کر جلا دیا۔محبتوں کی زمین میں خوبصورت لب ولہجہ رکھنے والا شاعر اذیتوں کی سرزمین کا مسافر بن گیا۔اندرونی شکست وریخت کے عکاس کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں ۔

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں اک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں
ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

فسادات کی وحشت، بے گھری کا عذاب اور مدت تک ایک گیراج میں افراد خانہ کے ہمراہ دن رات بسر کرنے میں ان کے مزاج میں تلخی بھردی۔گردش ایّام نے کہنے پر مجبور کردیا کہ ۔

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار سے سر لگتا ہے
مرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسماں ہے
انہیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہیں

بشیر بدر کی شاعری میں سب سے منفرد پہلوان کے اسلوب کی سادگی ہے۔انہوں نے غزل کے پیکر میں بے شمار ایسے نئے الفاظ استعمال کیے جو اس سے قبل کسی نے استعمال نہیں کیے تھے۔بول چال کی ٹھیٹھ اردو نہایت شگفتگی وروانی سے ان کی شاعری میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کی غزلوں میں جو شگفتگی شعریت اور حسن ہے انہیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے ۔

بقول گوپی چند نارنگ ''بشیر بدر نے پوئٹری میں نئی بستیاں آباد کی ہیں۔ان کی شاعری وہ خوشبو ہے جو ہمارا رشتہ آریائی مزاج سے، ہماری دھرتی سے، گنگا جمنی کی وادی سے 'اور ہندی، برج، اودھی بلکہ تمام مقامی بولیوں سے جوڑتی ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ بشیر بدر نے اپنی غزلوں میں نئے دور کے نئے موضوعات، مسائل، افکار وتناظرات سے اپنی گہری،، وجدائی، جذباتی اور فکری وابستگی کو

ISBN: 978-93-344-4743-9

اک انوکھے اور دلکش پیرایہ بیان دے کر اردو غزل میں اک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے اشعار میں کوئی تصنع و بناوٹ نظر نہیں آتی۔ زمین سے جڑے ہوئے سوندھے رشتوں کی مہک اور شہری زندگی کے تلخ حقائق کی سنگینی دونوں ہی لہجوں سے ان کی غزلیں گندھی ہوئی ہیں ۔

ہے عجیب شہر کی زندگی نہ سفر رہا نہ قیام ہے
کہیں کاروبار سی دوپہر کہیں بدمزاج سی شام ہے

جہاں ان کی شاعری نے تغزل کو ایک نیا مفہوم عطا کیا ہے۔ وہیں ان کی ذات کی خود پسندی ایک ناقد کو چونکاتی ہے۔ سن ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والے اپنے تیسرے مجموعے '' آمد '' میں انہوں نے عجیب خود پسندانہ دعوے کیے ہیں۔ اس مجموعے میں انہوں نے ۲۰۳۵ء کے قارئین کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں مستقبل میں آنے والی نسلوں کو مخاطب ہو کر کہا گیا تھا کہ '' آج ۱۹۸۵ کی غزل میں مجھ سے زیادہ محبوب و مقبول کوئی شاعر نہیں ہے۔'' میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن چکا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے عہد ۲۰۳۵ میں جو غزل رواں دواں ہے اس کا آغاز مجھ ناچیز کے چراغوں سے ہوگا۔

روایتوں سے بغاوت کرنے والا' عام بول چال کی زبان کو شعروں کی غنائیت میں ڈھالنے والا۔ عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ساتھ یادداشت کمزور ہونے کی شکایت کا شکار ہو گیا۔ ساری زندگی اردو شاعری کی آبیاری کرنے والا شاعر جو خوبصورت لہجہ میں ہم کلام ہوتا تھا کہ ۔

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے
وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

وہ جس کی روح میں اردو رچی بسی ہوئی تھی عمر کے آخری دور میں لفظ' شعر' لہجہ مشاعرہ ہر چیز بھول گیا جس کا دعویٰ تھا کہ ۔

ایک میرؔ تھا سو آج بھی کاغذ میں قید ہے
ہندی غزل کا دوسرا اوتار میں ہی ہوں

اپنی ہی ذات کو فراموش کر گیا ۔

بھول شاید بہت بڑی کر لی
دل نے دنیا سے دوستی کر لی
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

بشیر بدر کو بجا طور پر جدید اردو غزل کی آبرو کہا جا سکتا ہے جنہوں نے اردو شاعری کو عام فہم، دل پذیر اور شگفتہ بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کو حکومت ہند نے پدم شری کے خطاب سے نوازہ۔ ان کے کلام کے چھ مجموعے' اکائی' امیج، آمد، آس، آسمان اور آہٹ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کلیات بھی دستیاب ہے ۔

ترے اختیار میں کیا نہیں مجھے اس طرح سے نواز دے
یوں دعائیں میری قبول ہوں مرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

 ISBN: 978-93-344-4743-9

عدم گونڈوی کی شاعری میں سیاسی اور سماجی شعور

ڈاکٹر شری سین کمار بھارتی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

ہندی شاعری میں ملک کی عوام کے دکھ درد اور اس کی ٹوٹی پھوٹی حسرتوں کو شاعرانہ انداز دے کر اس کو واپس کرنے والا شاعر کا نام عدم گونڈی ہے۔ عدم گونڈوی کا اصل نام رام ناتھ سنگھ تھا۔ ان کی پیدائش 22 اکتوبر 1947ء کو گاؤں آٹا پرسپور ضلع گونڈہ، اتر پردیش میں ایک غریب کسان گھر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شری دیوکلی سنگھ اور والدہ کا نام شری متی مانڈوی سنگھ رہا۔ ان کا بچپن مفلسی میں گزرا اور اسی وجہ سے وہ بہت زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر پائے۔ انھوں نے محض پرائمری تک ہی تعلیم حاصل کی اور پھر پڑھائی چھوڑ کر کسانی کرنے لگے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام سے سے مٹھیر، عنوان سے 2010ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ کلام ''دھرتی کی سطح پر'' کے عنوان سے 2012ء میں اور تیسرا مجموعہ کلام گرم روٹی کی مہک'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ ملک کی عوام ہی ہے جو کبیر نظیر، ٹیگور، رویداس، ملک محمد جائسی وغیرہ جیسے شعراء کے کلام کو سنبھال کر رکھا ہے۔ وہ دکھ سکھ میں ان کے شاعری کو گنگناتے رہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو عدم گونڈوی بھی ایسے ہی شاعر تھے۔ انھوں نے کوئی مہا کا یہ نہیں لکھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کسی بادشاہ یا ہیرو کو جگہ نہیں دیا۔ بلکہ ملک کے دبے کچلے، بے بس، مایوں، مجبور، لاچار، مظلوم اور محنت کش عوام کو جگہ دی۔ عدم گونڈوی کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر انیل کمار ویشوکرمہ لکھتے ہیں:

وہ (عدم گونڈوی) عہد حاضر میں جو کچھ بھی گھٹتے ہوئے دیکھتے ہیں اس پر قرار احملہ کرتے چلتے ہیں۔ گونڈوی کی غزلوں کی خوبصورتی اونچے محلات یا کوٹھوں کا نہیں ہے، ان کی خوبصورتی ہے، ہاتھوں کے چھالے اور پیروں میں پھٹی بیوائی کا محنت کش لوگوں کی، فاقہ کشی و بھوک مری اور ذلالت میں زندگی گزر بسر کرنے والے لوگوں کا ہے۔

1980 کی دہائی میں جب ہندی اردو زبان کے شعرا کی تخلیقی کام کی دھوم مچی تھی تو عدم اپنے سامعین اور قارین کو شہر سے گاؤں کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس کے متعلق کچھ یوں کہتے ہیں۔ محبت کی کہانی اب جلی ماچس کی تیلی ہے غزل کو لے چلو اب گاؤں کے دلکش نظاروں میں انھوں نے اپنے سامعین اور قارین کو خاص کر شمالی ہندوستان کے اس گاؤں کی تنگ گلیوں میں لے جاتے ہیں جہاں دلتوں کی زندگی بد تر سے بدتر ہے۔ جہاں دلتوں کی زندگی کا استحصال ہو رہا تھا۔ گونڈوی نے ان تنگ گلیوں کے دلتوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کو عزت بخشی۔ گونڈوی نے اپنے سامعین و قارین کو دعوت دی کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں۔

آیئے محسوس کریئے زندگی کے تاپ کو
میں چماروں کی گلی تک لے چلوں گا آپ کو
جس گلی میں بھوک مری کی یاتنا سے اوب کر
مرگئی پھلیا بچاری اک کنویں میں ڈوب کر

گونڈوی اس کے آگے بتاتے ہیں کہ کس طرح سرجوندی کے قریب بے کسی گاؤں میں ایک دلت نابالغ لڑکی کی عصمت لوٹی گئی اور پورا سماج صرف تماشائی بنا رہا۔

آرہی تھی وہ چلی کھوئی ہوئی جذبات میں
کیا پتہ اس کو کہ کوئی بھیڑیا ہے گھات میں
ہونی سے بے خبر کرشنا بے خبر راہوں میں تھی
موڑ پر گھومی تو دیکھا اجنبی باہوں میں تھی

 ISBN: 978-93-344-4743-9

چیخ نکلی بھی تو ہونٹوں میں ہی گھٹ کر رہ گئی
چھٹپٹائی پہلے، ڈھیلی پڑی ، پھر ڈھ گئی

اس طرح کے واقعات آج بھی ہندوستان کے مختلف خطوں میں آئے دن ہوتے رہتی ہیں لیکن اس میں شکار وہی رہتا ہے بس شکاری بدل جاتے ہیں۔ 2006ءمہاراشٹر کے بھنڈارضلع کے خیر لانجی میں یہی تو ہوا تھا جب گاؤں کے اعلیٰ ذات کے دبنگوں نے ایک دلت خاندان کے بھی فرد کو دھارے دار ہتھیاروں کے زور پر باہر نکالا اور سبھی کو برہنہ کر کے پورے گاؤں میں گھمایا گیا۔عورتوں کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کیا اور پھر ان کا قتل کر دیا۔

عدم گونڈوی کسی بھی بات کو سہل، آسان، صاف اور سیدھے طریقے سے کہتے تھے۔ وہ بہت کم بولتے تھے البتہ بولتے بھی تھے تو اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے ہی بولتے تھے۔لوگ حکومت اور سیاست دانوں سے خوف کے مارے خاموش رہتے تھے۔لیکن عدم ہندوستان کی عدلیہ، انتظامیہ، حکومت اور سیاست دانوں سے کبھی ڈرتے نہیں تھے وہ سیدھے سوال کرتے تھے۔

جو ڈل ہوجی نہ کر پایا وہ یہ حکومت کر دیں گے
کمیشن دو تو ہندوستان کو نیلام کر دیں گے
یہ وندے ماترم کا گیت گاتے ہیں صبح اٹھ کر
مگر بازار میں چیزوں کا دو گونا دام کر دیں گے
سدن میں گھس دے کر بچ گئی کردی تو دیکھو گے
وہ اگلی یوجنا میں گھس کھوری عام کردیں گے

مندرجہ بالا اشعار میں صاف دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح عدم گونڈوی ہندوستان کی انتظامیہ اور سیاست دانوں کے دوگلے پن کی پردہ فاش کر رہے ہیں۔انھوں نے نوجوانوں کو سیاست دانوں کے جھوٹے وعدوں سے کمزور اور بے بس ہوتے دیکھا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جو جوان اس ملک کی تصویر بدل سکتا تھا، آج ان سیاست دانوں کے دیے سستے نشے میں اپنے آپ کو مار رہا ہے۔

آج سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ذریعہ کامیابیاں حاصل تو کی جارہی ہیں لیکن اس کی وجہ سے شخصیت جیسی چیزیں ختم ہوتی جارہی ہیں۔انسان کے شخصیت کا مستقل زوال اسے تنہائی میں رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔سائنس نے چاند تارے کو چھولیا۔ پوری دنیا مادے سے مشتعل ہوگئی، انسان آسمانوں میں چلنا سیکھا، لیکن وہ زمین پر چلنا بھولتا جارہا ہے۔ترقی کی اس چکا چوند میں انسان بے حس ہوگیا ہے۔اس کی زندگی مصنوعی ہوگئی ہے۔آج وہ ترقی کے اندھی دوڑ میں اپنا وجود ہی کھو بیٹھا ہے۔عدم گونڈوی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چاند ہے زیرِ قدم ، سورج کھلونا ہو گیا
ہاں ، مگر اس دور میں انسان بو نا ہو گیا

عدم گونڈوی نے عورتوں کی حالات پر بھی روشنی ڈالی۔انھوں نے کچھ جگہوں پر عورتوں کی بدتر حالات بنانے کے ذمہ دار ملک و معاشرے کے منتظمین پر طنز کیا ہے۔

یہ روٹی کتنی مہنگی ہے یہ وہ عورت بتائے گی
کہ جس نے جسم کو گیروی رکھ کے یہ قیمت چکائی ہے

ہمارے معاشرے میں عورت کئی صورت میں نظر آتی ہے۔ وہ کبھی سڑکوں پر جھاڑو لگاتی ہوئی، کبھی کھیتوں میں کسانوں کے ساتھ، کبھی پارلیمنٹ میں بحث کرتی ہوئی تو کبھی تعلیم میں بچوں کو تہذیب وتمدن سیکھاتی ہوئی۔کبھی کھیل کے میدان میں جوہر دیکھاتی ہوئی، کبھی ملک کے سرحد پر دشمنوں کو دھول چٹاتی ہوئی۔لیکن اس کے علاوہ بھی اس کی ایک زندگی ہے جو کسی کے سامنے نظر نہیں آتی۔دولت مندوں اور مالداروں کے گھروں میں جنسی تشدد کا نشانہ، کبھی جسم فروشی کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ عالمگیریت کے اس دور میں عدم نے عورتوں کے اس صورت حال کے بارے میں تلخ حقیقت تبصرہ کیا ہے۔

عورت تمہارے پاؤں کی جوتی کی طرح ہے
جب بوریت محسوس ہو گھر سے نکال دو
محترم یوں پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں قبر میں
چاہیے کوئی لڑکی سولہہ کوئی انیس کی

جسم کو ڈھاکنے کے لئے کپڑوں کی ایجاد اور اس کی ترقی یافتہ ثقافت کا نتیجہ ہے۔لیکن آج عریانیت جدیدیت کی تمام برے علامات کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس رجحان کے حامل لوگ اسے بڑے شوق سے جدیدیت کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ یہ رجحان ابھی میٹرو اور کسی حد تک شہروں تک ہی محدود ہے۔ کیوں کہ جدیدیت کی اندھی چکا چوندھ ابھی وہیں تک اپنی دخول زیادہ اچھی طریقے سے بنا۔

پائی ہے۔ ایسے شہریوں پر طنز کرتے ہیں کہتے ہیں
یوں خود کی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے ہیں
اے شہر کے بشندوں ! ہم گاؤں سے آئے ہیں
عریانیت میں پیچھے ہم آپ سے نہیں ہیں
تم شوق سے ننگے ہو ہم غم کے ستائے ہیں

غربت اخلاقیات کے زوال کی اصل وجہ ہے۔ پیٹ کے چلتے لوگ جھوٹ بولتے ہیں، چوری کرتے ہیں۔اس پر گونڈوی لکھتے ہیں

چوری نہ کرے جھوٹھ نہ بولے تو کیا کریں
چولھے میں کیا اصول پکائیں گے

عدؔم کے ہاں عام آدمی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بھوک اور روٹی کی جنگ نظر آتی ہے۔ اپنے حق کے لیے عوام کو ہتھیار اٹھانے تک کی صلاح دیتے ہیں۔

گر خودسری کی راہ پر چلتے ہوں رہنما
کرسی کے لئے گرتے سنبھالتے ہوں رہنما
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوں رہنما
ٹکڑوں پہ جمع خور کے پلتے ہوں رہنما
جنتا کو حق ہے ہاتھ میں ہتھیار اٹھا لے

معاشرے میں پھیلی بدعنوانیوں کو دیکھ کر لوگوں کے ذہن میں ان بدعنوانیوں کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے شعور بیدا کرتے تھے

وید میں جن کا حوالہ حاشیے پر بھی نہیں
وہ اَبھاگے آستھا، ویشواس لے کر کیا کریں
لوک رنجک کو یہاں شمبوک وَدھ کے آڑ میں
اس ویوستھا کی گھڑیت اتیہاس لے کر کیا کریں

اس ضمن میں ان کا ایک اور شعر جو بہت مقبول ہے۔ یہ آج بھی لوگوں کی زبان پر رہتا ہے

کا جو بھونی پلیٹ میں ویسکی گلاس میں
اترا ہے رام راج ودھا ئک نیواس میں

عدم کے کلام میں اکثریت اور اقلیت کی فرقہ پرستی کے خلاف سخت احتجاج نظر آتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھیں فرقہ پرستی اور مطلبی سیاست کا چہرہ

ہندو یا مسلم کے احساسات کو مت چھیڑیئے
اپنی کرسی کے لئے جذبات کو مت چھیڑیئے
ہم میں کوئی ہوڑ، کوئی شک کوئی منگول ہے
دفن ہے جو بات 'اب اس بات کو مت چھیڑیئے
گر غلطیاں بابر کی تھی، جمّن کا گھر پھر کیوں جلے
ایسے نازک وقت میں حالات کو مت چھیڑیئے
ہے کہاں دیگر ہٹلر'ہلکو، زار یا چنگیز خاں
مٹ گئے سب، قوم کی اوقات کومت چھیڑیئے
چھیڑیے اک جنگ، مل جل کر غریبی کے خلاف
دوست میرے مذہبی نغمات کو مت چھیڑیئے

آج عدم گونڈوی کی مطابقت اس لحاظ سے بڑھتی ہے کہ انسان مستقل طور پر مفلوج ہورہا ہے۔ وہ دنیا کی ڈھیروں ساری سہولیات کی ہوڑ میں نظام سے بغاوت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ نامردی ہمارے ماحول، معاشرے اور ملک کے لئے بہت خطرناک ہے۔ عدم نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوامی بیداری کی ہے۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

شین-کاف نظام کی شاعری میں عصری حسیت

ارون کمار

ریسرچ اسکالرشعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد

شین-کاف نظام کا پورا نام شیور کشن بہتہ ہے-شن-کاف نظام 26 نومبر 1947ء کو جودھ پور میں پیدا ہوئے-ان کے والد کا نام گنیش داس بسّہ تھا اور ان کی ابتدائی تعلیم مغربی راجستھان کے قصبوں میں ہوئی جودھ پور یونیورسٹی سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نظام نے مختلف جگہوں پر ملازمتیں کی-شین-کاف نظام کے اب تک آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں-مثالحوں کی صلیب، دشت میں دریا، ناد 1980 لفظ در لفظ 2000ء سایہ کوئی لمبا نہ تھا، ساؤں کے سائے، بیاض کھوگئی ہیں 1997، گمشدہ دیر کی گونجتی گھنٹیاں اور راستہ یہ کہیں نہیں جاتا ہے-ناد کے علاوہ تمام شعری مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئی ہیں-ان کا کلام ہندوستان کے موثر ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے-اور شاعری کے علاوہ تنقید، تبصرہ بھی لکھتے رہے ہیں-اور افسانوں سے بھی دلچسپی رہی ہے بعض رسالوں کی سرپرستی بھی کی ہے-اور ایڈیٹوریل بورڈ میں بھی رہے ہیں-انھیں ترجمے سے بھی دوپسی رہی ہے-شین-کاف نظام نے غزل نظم نثری نظم، رباعی، قطعہ اور دوہے ان سبھی اصناف میں خود کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے-وہاب اشرفی اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو میں شین-کاف نظام کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> شین-کاف نظام عصری حسیت پر غالت توجہ دیتے رہے ہیں-ان کے ہاں زندگی کے حقائق رنج والم کا باعث تو ضرور ہیں لیکن ان سے وہ بشر مردہ نہیں-ان کے خواب باقی رہتے ہیں لبند الحروی کو وہ آخری مرحلہ نہیں تصور کرتے اور اس سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں-۱۲

شین-کاف نظام نے جدید خیالات وتصورات کا اظہار اپنی شاعری میں دلکش انداز میں کیا ہے-انھوں نے کلاسکی شاعری سے بھی استفادہ کیا اور دور حاضر کی تحریکات جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بھی ان کی نظر گہری ہے-ان کے خیالات میں گہرائی بھی ہے-ان شعروں کو دیکھئے جن میں انھوں نے جدید خیالات وتجربات اور مشاہدات کو کس طرح شعری پیرایے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

جب سے بچھڑا ہے کوئی تب سے یہ حالات ہے انتظام
بات بے بات پر رونے کے بہانے ڈھونڈوں

فکری اعتبار سے تو اس شعر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے تجربات میں گہرائی اور گیرائی موجود ہے لیکن فنی اعتبار سے ان کی شاعری میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں-مثال کے طور پر شعر کے دوسرے مصرعہ میں ڈھونڈوں، صوتی لحاظ سے خوبصورت اور خوش آہنگ ردیف نہیں ہے-شاعر اس شعر میں اسی تنہائی کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ہمارا معاشرہ گزر رہا ہے-تنہائی کے اس دردوکرب کو نظام نے بھی محسوس کیا اور اس کو شعر کے پیرایے میں ڈھال دیا-

دونوں اطراف کے لوگ زخمی ہوئے
پتھروں کی کہاں تھی کی شہر میں

دیکھا جائے تو یہ شعر آج کے سیاسی اور معاشرتی رویوں کی طرف اشارہ کرتا ہے-جہاں دوفریقوں کا آپس میں لڑنا اور پتھر مار کر ایک دوسرے کو زخمی کرنا ایک عام رجحان بن گیا ہے-شاعر کہہ رہا ہے کہ دونوں طرف کے لوگ زخمی ہوئے کیونکہ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے پر پتھر برسائے اور شہر میں پتھروں کی تو کمی تھی نہیں اس لیے دل بھر کر پتھروں کو برسایا گیا-کسی کو کسی کے زخمی ہونے کی پرواہ نہیں تھی-

 ISBN: 978-93-344-4743-9

جو چپ رہے گی زبان خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

آج کا انسان بھیڑ میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ دوسروں سے قربتوں کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں اور وسائل بھی جن کے ذریعے ان قربتوں کو حاصل کرنا اب مشکل نہیں آسان ہو گیا ہے مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی چھیلتے ہوئے معاشرے میں ذہن جیسے سکڑ گئے ہیں۔ اب آدمی اپنے بارے میں سوچتا ہے' دوسروں سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن دوسروں سے متعلق اس کی سوچ بھی دراصل اس کے اپنے وجود سے متعلق ہوتی ہے اس لیے کہ اس کا اپنا وجود بہت سے وجودوں میں شامل ہے اور دوسرے موجود اس کے اپنے وجود کا حصہ ہیں۔ دل ہو یا دماغ خواب ہو یا بیداری مسکراہٹیں ہوں یا افسردگی کا عالم اس میں انسان تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہا نہیں ہوتا۔ دور ہوتے بھی دوریوں کو محسوس نہیں کرتا اور قریب ہوتے ہوئے بھی قربتوں کے زندہ پائندہ تصور سے محرومی کے احساس میں گھرا رہتا ہے۔

مر کے بھی چھوٹ جائیں کون کہے
جانے کتنے ابھی جنم میں میاں

ہندو مذہب میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک بار مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے۔ اس طرح انسان کو اپنی پوری زندگی میں کئی جنم لینے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو نجات دیکھتی ملتی ہے اس طرف شاعر نے یہاں اشارہ کیا۔ یہ کس کو معلوم ہے کہ موت کے بعد ہم کو تمام پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے گا، یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے کتنے جنم ابھی باقی ہیں، اس شعر کا مضمون غالب کے اس شعر سے بہت ملتا جلتا ہے۔

گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

آج جس تیزی کے ساتھ بڑے اور صنعتی شہروں کی آبادی بڑھ رہی ہے اس کی وجہ سے مکانات کی قلت پیدا ہو گئی ہے۔ اس بات کو شاعر اپنے شعر میں کسی طرح کہتا ہے؟

اونچی عمارتیں تو بڑی شاندار میں
پر اس جگہ تو رین بیرے تھے کیا ہوئے

اس شعر میں اسی سماجی تبدیلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے اس جگہ مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے جو رین بیرے بنے ہوئے تھے وہ سب کیا ہو گئے۔ ان کو توڑ کر اس جگہ اونچی اونچی اور خوبصورت و شاندار عمارتیں تیار ہو گئی ہیں۔ یہ عمارتیں اپنی جگہ بہت خوب ہیں لیکن اس کے باوجود آج کا مسافر تو اپنے اس رین بیرے کو تلاش کرتا ہے جہاں آ کر وہ کچھ دیر آرام کر لیتا تھا، ہو جاتا تھا اور پھر صبح اپنے کام کے لیے جاتا تھا لیکن ان شاندار عمارتوں نے تو ان رین بیروں کو ہی اجاڑ دیا۔ اب اس جگہ یہ اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ شین۔ کاف نظام کے خیالات میں گہرائی ہے اور زندگی کا فلسفہ بھی شامل ہے۔ لیکن کہیں کہیں زبان و بیان کے اظہار میں ان کی شاعری بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی زبان ان کے خیالات کا ساتھ نہیں دے پاتی اور ان کے احساسات، تجربات اور زبان و بیان کے اظہار میں ایک توازن قائم نہیں رہ پاتا۔ یہ ایک ضمنی بات ہے، اصل مسئلہ ان کے یہاں شخصی تجربات کا ہے۔ جن کو انھوں نے اپنی زندگی، اپنے زمانے اور عصری ذہن سے اخذ کیا ہے۔ وہ تنہا ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادی حسیت پر ان کی توجہ زیادہ رہتی ہے۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

آزادی کے بعد حمدیہ شاعری اور ارشدؔ مینا نگری

حافظ محمد ثاقبؔ ضیاء

اردو معلم (ہائی اسکول) دربھنگہ

ارشدؔ مینا نگری کا تعلق مینا نگری، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر سے ہے، آپ کی تاریخ پیدائش ۳ مارچ ۱۹۴۲ء ہے۔ ابھی چند ماہ قبل 25 فروری 2024ء کو آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اللہ پاک جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے (آمین)۔

موصوف بنیادی طور پر درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ رہ کر پچاس برسوں تک معلّمی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ان کی شخصیت مختلف الجہات تھی، عصر حاضر میں ارشدؔ مینا نگری کا شمار کہنہ مشق اور اساتذہ شعرا میں ہوتا ہے۔ موصوف نے اردو زبان کے علاوہ ہندی اور مراٹھی زبانوں میں بھی ہمہ گیر شاعری کی مثال قائم کی اور مقبولیت پائی تقریباً ہر صنف سخن میں شعر و ادب کی مقصدی عظمت کو برقرار رکھا۔

پیش نظر مقالہ میں مجھے آزادی کے بعد ''یک موضوعی'' شاعری کے تحت ارشدؔ مینا نگری کی حمدیہ شاعری کا جائزہ لینا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اپنے اصل موضوع پر روشنی ڈالوں موصوف کے حوالے سے تعارفاً دو چند باتیں تحریر کرتا چلوں کہ موصوف کے تقریباً بیس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں **''یک موضوعی''** شعری مجموعوں کی تعداد نو (9) ہے، جو ایک خاص موضوع پر مشتمل ہے۔ طرۂ امتیاز یہ کہ ان کے سارے یک موضوعی شعری مجموعے سو دو سو صفحات پر مشتمل نہیں ہوتے بلکہ تین سو چار سو صفحات پر مشتمل ہیں۔

ان کا اولیں شعری مجموعہ ''عید'' کے عنوان سے 2010ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح سے یک موضوعی شاعری کے تحت ''سہروں کے چہرے''، تہنیتی نظم سہروں پر اردو ادب میں موصوف کا اولین شعری مجموعہ ہے جو 2021ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں تقریباً 70 اصناف شاعری کی ہیئتوں میں سہروں پر شاعری کی گئی ہے۔ سال 2002ء میں ''ماں'' کے عنوان پر جہان اردو میں اولین ضخیم شعری مجموعہ منظر عام پر آیا جو 32 شعری ہیئتوں پر مبنی ہے۔ اسی طرح سے نعتیہ شعری مجموعہ ''رحمت للعالمین'' منظر عام پر آیا جو 400 صفحات پر مشتمل ہے۔ قومی یکجہتی موضوع پر مشتمل پہلا ضخیم شعری مجموعہ 2015ء میں شائع ہوا یہ مجموعہ بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ''ہم سب ایک ہیں'' کہ نام سے اسی طرح سے قومی یکجہتی کی نظمیں اور گیت پر مشتمل شعری مجموعہ ''پیارا ہندوستان'' شائع ہوا۔ ''دل'' کے موضوع پر 352 صفحات پر مشتمل شعری مجموعہ 2017ء میں شائع ہوا۔ ''اردو'' موضوع پر مشتمل شعری مجموعہ 2017ء میں شائع ہوا۔ ''سلام مصطفیٰ'' کے نام سے سلاموں کا مجموعہ 336 صفحات پر مشتمل شائع ہو چکا ہے۔ آخر الذکر **''یک موضوعی''** شاعری کے تحت آپ کا حمدیہ شعری مجموعہ ''ربِّ کائنات'' ہے جو تقریباً 400 صفحات پر مشتمل 2023ء میں شائع ہوا۔ میری معلومات کے مطابق یہ آپ کی آخری تخلیق ہے۔ کیا ہی خوبصورت ان کی زندگی کا اختتامیہ ہے کہ جناب ارشدؔ ''رب کائنات'' پیش کر کے خود رب کائنات کی بارگاہ میں چلے گئے اللہ کریم ان کے اس حمدیہ مجموعہ کو جو ان کے اظہار عبدیت اور اپنے محبوب اعلیٰ رب اکبر کی شان کبریائی میں ایک مومن کامل کا نذرانہ خلوص ہے شرف قبولیت بخش کر۔ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

الحمدللہ عصر حاضر میں اردو کا منظر نامہ اپنی ہمہ رنگی کی وجہ سے مرکز نگاہ بنا ہوا ہے۔ فی زمانہ نامور اساتذہ شعرا سے لے کر نئی نسل کے شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے۔ شعراء کی اس لمبی فہرست میں جناب ارشدؔ مینا نگری کی شاعری مینارۂ نور بن کر اپنی یک موضوعی شاعری کی انفرادیت کی وجہ سے محبان اردو کو اپنی جانب توجہ مبذول کراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یک موضوعی شاعری کی وجہ سے میری نظر میں ان کی ادبی وشاعرانہ عظمت ان کے ہم عصروں میں بہت ہی منفرد و ممتاز نظر آتی ہے۔ بلکہ یوں کہہ لیا جائے کہ ان کی شاعری عصر حاضر کی روایتی شاعری سے ممتاز و منفرد ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

انسان کے اندر شعری اظہار کا وسیلہ یہ اپنے آپ میں اللہ تبارک وتعالی کی ودیعت کردہ نعمت عظمیٰ ہے، جسے ہم ایک الہامی کیفیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ سونے پر

 ISBN: 978-93-344-4743-9

سہاگہ یہ کہ ارشدؔ میناگری جواختراعی ذہن کے مالک تھے ان کی طبیعت میں غضب کی جدت اور موضوعیت تھی موصوف کی شناخت ادبی منظرنامے پر جہاں ایک مشاق شاعر کی حیثیت سے ہے۔ وہیں ان کی شاعری کی ایک بڑی انفرادیت یہ ہے کہ موصوف نے''**یک موضوعی شاعری**'' کو اپنا خاص میدان عمل بنایا ہندوستان و پاکستان کے تناظر میں اگر ان کی شاعری کا بنظرعمیق تحقیقی انداز میں جائزہ لیا جائے تو موصوف اپنے ہم عصروں سے میری نظر میں ممتاز و منفرد اس لیے نظر آتے ہیں کہ انہوں نے''**یک موضوعی شاعری**''پر تین سے چار سو صفحات پر مشتمل متعدد''یک موضوعی'' کتاب لکھ کر دامن اردو کو وسعت عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کی''یک موضوعی'' شاعری کا اعلیٰ نمونہ حمدیہ مجموعہ''**رب کائنات**'' کے نام سے منظر عال پر آیا جو کہ کافی ضخیم ہے اور 376 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کی بھی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں آپ نے 70 اصناف سخن پر مشتمل طبع آزمائی کی ہے۔ عام طور پر غیرملکی وہ اصناف جس پر ہمارے شعراءکم توجہ اور کم طبع آزمائی کرتے ہیں ان تمام اصناف پر آپ نے اپنی اس حمدیہ شاعری میں اپنی عقیدت، رب سے محبت، اور جذبات کا اظہار کیا ہے۔

اردو میں حمدیہ شاعری کی روایت

اللہ پاک قران کریم میں ارشاد فرماتا ہے **یُسبِح لِلہ مافِی السَّماوات والارض** (جو کچھ زمین وآسمان میں ہیں سب کے سب اللہ کی تسبیح وتحلیل کرتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آسمان وزمین میں بسنے والی جتنی مخلوقات ہیں خواہ وہ درند، پرند، اور چرند ہی کیوں نہ ہوں سب کے سب اپنے اپنے انداز میں مالک کون ومکاں کی تسبیح وتوصیف میں ہمہ وقت مشغول ہیں۔ یہ اور سی بات ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت انسان کو اشرف المخلوقات بنایا لہٰذا اللہ کی تعریف وتوصیف اشرف مخلوق حضرت انسان اپنی عبادت و ریاضت سمیت اپنی زندگی کے بےشمار مرحلوں میں رب کی تسبیح وتحلیل کرنے کے ساتھ ساتھ لفظی و ادبی طور پر بھی اللہ کی تعریف و توصیف کا اظہار فنی و ادبی طور پر محامد یعنی حمدیہ شاعری سے کرتی ہے۔ خلاصہءکلام یہ کہ ابتدائے آفرینش سے ہی مخلوق خدا اپنے خالق کی حمد وشکر کرتے ہوئے آرہی ہے۔

ڈاکٹر محمد آصف ملک (اسسٹنٹ پروفیسر) اپنے مضمون حمدیہ شاعری میں لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اردو شعر وسخن میں حمدیہ شاعری کی روایت کی موجودگی کی بات ہے تو اس میں زمانہ قدیم خسروؔ، نصرتیؔ، وجہیؔ، قلیؔ قطب شاہ سے ہوتی ہوئی ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، دردؔ، اور سوزؔ تک پھیلی ہوئی ہے۔ لکھنوی دبستان شاعری میں خاص طور پر میرؔ حسن، نسیمؔ، آتشؔ، مصحفیؔ کے یہاں اور دبستان دہلی میں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ سے لے کر جدید شعراء، مابعد جدید شعرا اور تا حال جدید شعرا کے یہاں حمد گوئی کا سلسلہ دراز ہے لیکن زمانہء قدیم، کلاسیکی شعرا اور جدید شعرا میں قریب قریب ماسوائے بعض سب کے یہاں خالص حمد سے زیادہ فلسفیانہ حمدیہ شعر ملتے ہیں جن پر بحث کار دراز ہے۔''

آزادی سے قبل اردو میں حمدیہ شاعری

اردو زبان کی برکت اور خوبی ہے کہ اردو ادب میں حمدیہ شاعری کے عنوان کے تحت متعدد یک موضوعی حمدیہ مجموعے آزادی سے قبل بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اردو شاعری کا پہلا حمدیہ مجموعہ ہندوستان کی آزادی سے قبل غلام سرورؔ لاہوری کا ہے جو''**دیوان حمد ایزدی**'' کے نام سے 1881ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اسی طرح حمدیہ شاعری کا دوسرا مجموعہ افتخار حسین مضطرؔ خیرآبادی کا''**نذر خدا**'' کے نام سے 1913ء میں شائع ہوا۔ اس کے سر ورق پر یہ شعر درج ہے۔

مبارک اے زباں دنیا میں جو کچھ بھی کہا تو نے
وہ میں نے لکھ لیا اور کر دیا نظر خدا تو نے

آزادی کے بعد اردو میں حمدیہ شاعری

آزادی کے بعد حمدیہ شاعری کے متعدد یک موضوعی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں سے مشت نمونہ ازخروارے کے طور پر یہاں چند حمدیہ شعری مجموعوں کے نام مع سال اشاعت ذکر کیے جاتے ہیں۔

''**پتھر کی آگ**'' ۔عبدالسلام طور لاہور 1980ء

ISBN: 978-93-344-4743-9

1984ء "**الحمد**"۔مظفر وارثی لاہور

1987ء "**حرف تمام**"۔منیر احمد جامی۔کرناٹک

1994ء "**خالق ذوالجلال**"۔ابرار کرت پوری

2004ء "**قسام ازل**"۔ (مجموعہ محامد) ابرار کرت پوری

2008ء "**حمد کہوں تو ہو اجیارا**"۔ابرار کرت پوری 2017ء وللہ الحمد۔غیر منقوطہ حمدیہ شعری مجموعہ۔خورشید ناظر۔اردو مجلس بہاولپور سے شائع ہوا۔

2021ء "**اللہ اکبر**"۔شوکت محمود شوکت

2021ء "**باغ حمد**"۔(حمدیہ مجموعہ) محمد نعیم انصاری . ناشر نیاز مندان کراچی

2023ء "**رب کائنات**"۔حمدیہ شعری مجموعہ۔ارشد مینانگری

مذکورہ بالا تمام شعری حمدیہ مجموعے کی ادبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔قطع نظران کے جب ہم حمدیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو میری نگاہ نامور شاعر ارشد مینانگری پر جا ٹھہرتی ہے۔جنہوں نے "رب کائنات" کے نام سے حمدیہ شعری مجموعہ تخلیق کی جو 2023ء میں منظر عام پر آیا۔اس کتاب میں حمدیہ شاعری کو موصوف نے ستر (70) اصناف سخن پر مشتمل تحریر کر کے جہان ادب میں ایک مثال پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ارشد مینانگری اپنے اس حمدیہ مجموعہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "رب کائنات" میں ندرت شعری کے علاوہ 70 اصناف سخن کا جمال بھی اہل ادب کی نظروں کو نذر کیا ہوں جو طلبہ و طالبات کو نہیں بلکہ اساتذہ کرام کے علوم میں اضافہ کا باعث بنے گا۔ادبی رنگا رنگی کی جاذبیت کا دلکش منظر نامہ تسلیم کیا جائے گا۔حصول شعر و سخن کی دلنوازی کا سبب بنے گا۔جس کی ہمہ گیری، ہمہ جہتی، ہمہ دانی، فکر و شعور و ذوق و شوق کی شائستگی کو ضوبار کرے گی"۔
>
> (رب کائنات۔ارشد مینانگری، صفحہ۔15)

ارشد مینانگری کی حمدیہ شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہندوستان و پاکستان کے درجن بھر ناقدین ادب نے بڑے خلوص سے کیا ہے۔دانشوران علم و ادب کے تاثرات پیش کرنے سے قبل میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ارشد مینانگری کے حمدیہ شاعری کے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

زمیں فلک تارے گلشن سب کا سب ہے تو
بشر ملک حور و غلماں سب کا رب ہے تو
اول سے ہی تیرا ہے ہر جانب جلوہ
کل بھی ہوگا ایسا ہی جیسا ہے تو
میرا خامہ اور میں بھی تجھ سے وابستہ
ارشد کے فکر و فن میں روز و شب ہے تو

حمدیہ اشعار میں عموماً ہمارے شعراء اپنے رب کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے اس کی خوشنودی و رضا اور جنت کے حصول کی باتیں کرتے ہیں۔مگر ارشد مینانگری اپنی حمدیہ شاعری میں روایتی شاعری کی طرح صرف اپنے لئے ہی دعا نہیں مانگتے بلکہ ان کی شاعری عوام کی زبان بن جاتی ہے۔ان کی حمدیہ شاعری میں ایک الگ رنگ و آہنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر دل کو دلدار بنا دے یا اللہ
نفرت کو بھی پیار بنا دے یا اللہ
گلزاروں میں گل تو مہکے ہیں لیکن

ISBN: 978-93-344-4743-9

صحرا بھی گلزار بنا دے یا اللہ

مذکورہ بالا اشعار میں شاعر صرف اپنی ذاتی اغراض و مقاصد رب کی بارگاہ میں پیش نہیں کرتا بلکہ وہ کائنات اور انسانیت کی زبان بن کر بارگاہ رب العزت میں فریاد کر رہا ہے۔اسی قبیل کا مزید ایک شعر دیکھیں۔

رہتے ہیں جو شہروں میں فٹ پاتھوں پر
ان کا بھی گھر دار بنا دے یا اللہ

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ ''رب کائنات'' میں ارشدؔ مینا نگری ستر مختلف اصنافِ شاعری میں حمدیہ ترانے لکھے ہیں۔ان میں حمد، حمدیہ غزلیات، حمدیہ نظمیں، حمدیہ گیت، حمدیہ قطعات، حمدیہ مناجات، حمدیہ ثلاثی، حمدیہ رباعی، حمدیہ دوہا، حمدیہ دو سخنے، حمدیہ کجری، حمدیہ چوکا، حمدیہ تروینی، حمدیہ ماہیا، جیسی تقریبا 70 اصناف شاعری پر حمدیہ شاعری پیش کی ہے، یہی موصوف کی انفرادیت ہے، اس مختصر سے مقالے میں سبھوں کا احاطہ مشکل ہے۔

ارشدؔ مینا نگری نے بڑی ہی عقیدت و محبت کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں اپنے عقیدت کا اظہار شاعری کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔اشعار دیکھیں۔

رحمت سے معمور فضا میں لطف و راحت گھول
اللہ اللہ بول رے بندے اللہ اللہ بول
دنیا روشن ہو جائے گی عقبیٰ بھی ضوبار
بند رہے چہرے کی آنکھیں دل کی انکھیں کھول
ساری دنیا کی دولت بھی اس کے آگے ہیچ
ارشدؔ ہر ذکر اللہ کا بول بول انمول

یہ تلخ حقیقت ہے اور قرآن پاک کا اعلان بھی کہ دنیا کی ساری مخلوقات اللہ کی تعریف و توصیف بیان کرنے کے لیے سارے درختوں کو قلم اور سارے سمندر کے پانی کو سیاہی بنا کر لکھنا شروع کر دے پھر بھی وہ ناکافی ہے۔ارشد مینا نگری کو بھی اس بات کا بخوبی احساس ہے موصوف نے انہیں باتوں کا اظہار درجہ ذیل چار مصرعے میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

رہ کے اوجھل ہے ہر طرف ظاہر
اس کی قدرت بیان سے قاصر
وہ بہر پہلو بے گمان نادر
وہ تو ہے کائنات پر قادر

درج بالا حمدیہ شاعری کے چند نمونے کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ارشدؔ مینا نگری اللہ کی محبت میں ڈوب کر کس طرح اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ارشدؔ مینا نگری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف یوں تو سینکڑوں شعراء نے کیا ہے ساتھ ہی ان کی حمدیہ شاعری کی انفرادیت کا اظہار درجنوں ناقدین ادب نے اپنے مقالات میں بہت کُھل کر کیا ہے۔

مشہور ادیب سعید رحمانیؔ اڑیسہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''خصوصاً موضوعاتی شاعری میں ان کی کاوش اپنی مثال آپ ہے اس زمرے میں ان کے متعدد مجموعوں کا نام لیا جا سکتا ہے مثلاً دل، عید، ماں، اردو، سلامِ مصطفٰی، سہروں کے چہرے، ہم سب ایک، ہیں وغیرہ وغیرہ موضوعاتی شاعری کے عمدہ نمونے ہیں اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ کوئی بھی ایسی صنف باقی نہ رہی جس پر انہوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو''۔

(رب کائنات۔ارشدؔ مینا نگری۔صفحہ 18)

 ISBN: 978-93-344-4743-9

مشہور ادیب و ناقد ڈاکٹر سیفی سرونجی لکھتے ہیں:

''ارشد مینا نگری دنیائے ادب کے وہ واحد شاعر ہیں جن کی رگ رگ میں عشق رسولؐ اور خدا کی عظمت سمائی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا زیادہ تر کلام عشقِ رسولؐ اور خدا کی وحدانیت سے لبریز ہے وہ نعت، حمد، سلام کے کئی مجموعے پیش کر چکے ہیں اور اب تازہ مجموعہ بھی خدا کے حضور ''رب کائنات'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے''۔

(رب کائنات۔ارشد مینا نگری۔صفحہ 17)

پاکستان کے مشہور ناقد و ادیب جبار مرزا اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''یوں تو جناب ارشد مینا نگری نے موضوعاتی شاعری کے علاوہ غزل، نظم، گیت، قومی نغمے، عید، بقر عید، دوہے، مرثیہ، سلام، تصوف اور نعت میں خراج تحسین پایا ہی ہے لیکن ان کا زیر نظر ''ربّ کائنات'' حمدیہ کلام بھی عقیدت و جانثاری کے علاوہ زبان و بیان کی معراج کو پہنچا ہوا ہے نور لم یزل سے مکالمہ تک ایک ایک لفظ ایمان افروز اور روح میں اتر جانے والا ہے''۔

(رب کائنات۔ارشد مینا نگری۔صفحہ 27)

نسیم سحر پاکستان، ''رب کائنات'' کے حوالے سے لکھتی ہیں اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''رب کائنات'' میں جناب ارشد مینا نگری نے 70 اصناف شعری کی صورت میں حمد نگاری کی ایک ایسی کائنات مہیا کر دی ہے جس کی ہر صنف اور ہر سطر میں قاری کو اللہ کی کبریائی اور انسان کی عبدگی کا اعتراف موجزن ملتا ہے ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دیگر مما لک میں رہنے والے قلم کار بھی جب حمد و نعت لکھتے ہیں تو زیادہ تر غزلیہ انداز میں ہی لکھتے ہیں بہت کم ایسے شعراء ملیں گے جنہوں نے نظمیہ حمدیں لکھی ہوں اور نظم کے علاوہ دیگر اصناف شعری میں لکھنے والے تو شاید ڈھونڈ نے سے بھی نہیں ملیں گے ایسے میں مہاراشٹر کے شہر مالیگاؤں میں جو اردو کے حوالے سے نسبتاً کم معروف ہے جناب ارشد مینا نگری نے 70 شعری اصناف میں حمد کہہ کر مجموعی طور پر اردو شاعری کے عالمی مراکز کو بھی انگشت بدنداں کر دیا ہے تو کیا عجیب ہے''۔

(رب کائنات۔ارشد مینا نگری۔صفحہ 33)

خلاصہ کلام یہ کہ اردو زبان و ادب میں ''حمدیہ شاعری'' کی روایت آزادی سے قبل بھی تھی اور آزادی کے بعد سے تا حال جاری و ساری ہے۔عصر حاضر میں اردو زبان و ادب میں ''یک موضوعی'' شاعری کے تحت شاعری کرنے والوں میں یقیناً ایک بڑا ہی اہم ممتاز و منفرد نام جناب ارشد مینا نگری کا ہے جن کے یک موضوعی شاعری پر باضابطہ نو (9) مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ان میں آخر الذکر ''رب کائنات'' ہے جو ان کا حمدیہ شعری مجموعہ ہے۔یہ مجموعہ اپنی انفرادیت کی وجہ سے اپنے مختلف و گونا گوں اوصاف و کمالات کی وجہ سے جہان اردو ادب میں بہت ہی مقبول ہوا ہے۔مذکورہ یک موضوعی حمدیہ شعری مجموعہ بھی ان کے دیگر یک موضوعی شعری مجموعہ کی طرح ہی اردو شاعری میں ایک انمول و بیش بہا تحفہ ہے۔

رب کریم ارشد مینا نگری کو اپنے محبوبؐ کے نعلین کے صدقے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔مجھے امید قوی ہے کہ ''رب کائنات'' بھی ان کی دیگر تصانیف کی طرح اہل علم و دانش کی نگاہ میں محبوبیت اور مقبولیت حاصل کر فروغ اردو کا ایک اہم ذریعہ اور نمونہ ثابت ہوگا۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

بشرنواز: شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر وحیدہ بیگم یوسف خان

صدر شعبۂ اردو

سوامی رامانند تیرتھ مہاودیالیہ امباجوگائی، ضلع بیڑ (مہاراشٹر)

بشرنواز کی شخصیت کسی طرح سے محتاج تعارف نہیں ہے گزشتہ نصف صدی شعری دبستان اورنگ آباد کی صدی کہلاتی ہے۔بشرنواز اس صدی کے علمبردار شاعروں میں سرفہرست ہے۔بشرنواز کی ولادت ۱۸/ اگست ۱۹۳۵ء میں شہراورنگ آباد میں ہوئی۔ان کے والد کا نام امیرنواز خان تھا۔جو پیشہ درس وتدرس سے وابستہ تھے بشرنواز کی والدہ محترمہ کو پیشہ درس وتدریس سے کافی دلچسپی تھی۔چنانچہ وہ اپنے محلے کی لڑکیوں کو دینی تعلیم دیتی تھی۔امیرنواز خان صاحب کو چارلڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔

بشارت نواز نے زمانے طالب علمی سے ہی شعرگوئی کا آغاز کردیا تھا، انھیں ملٹی پرپس ہائی میں حضرت یعقوب عثمانی نے انھیں اردو پڑھایا تھااور وہ اپنی ہائی اسکول کی جماعتوں میں وہ بہت اچھے اشعار کہنے لگ گئے تھے۔اسی وجہ سے حضرت یعقوب عثمانی ان سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے،حضرت یعقوب عثمانی نے بشرنواز کی تخلیقی صلاحیتوں کوسنوارنے میں کلیدی کرداراداکیااس کا اعتراف بشرنواز نے ہمیشہ کیا۔

۱۹۵۰ءاور۱۹۵۳ء کے درمیان شاعری کا آغاز کردیا۔اس طرح انہوں نے قافیہ کی تنگ گلیوں کی گداگری کو اپنا شیوہ بنالیا۔اس کے علاوہ ان کی دلچسپیاں اس وقت سیاست میں بھی کافی بڑھی ہوئی تھیں۔اس طرح ان کی زندگی کے 10 سال عوامی خدمات میں اور شہری سیاست میں گزرگئے بلدیہ اورنگ اباد میں بحیثیت رکن کام کرتے ہوئے بشرنواز نے اورنگ آباد کے ادبی حلقے سے اپنی انتہائی قریبی روابط برقراررکھےملٹی پرپس ہائی اسکول میں حضرت یعقوب عثمانی نے ان کواردو پڑھایا تھا اور ہائی اسکول کی جماعتوں میں ہی بشرنماز بہت اچھے اشعار کہنے لگے تھے اسی وجہ سے یعقوب عثمانی ان سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے حضرت یعقوب عثمانی نے بشر نواز کی تخلیقی صلاحیتوں کوسوارنے میں کلیدی کردارادا کیااس کا اعتراف ہمیشہ بشرنواز کرتے رہیں۔

۱۹۵۰ء میں اورنگ آبادشہر کا ادبی ماحول عروج پر تھا۔اس شہر کے ادبی ماحول کو بابائے اردو مولوی عبدالق نے کافی بلند کردیا تھا۔مولوی عبدالحق کے ساتھی شیخ چاند نے بھی اورنگ آباد میں غیرمعمولی تحقیقی کام کیے۔اورنگ آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا سینٹر قائم ہو چکا تھا جس کی وجہ سے اردوزبان وادب کی قدآور علمی وادبی شخصیتیں اورنگ آبادآ چکی تھیں اوراورنگ آباد میں بڑے بڑے کل ہند مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔حضرت یعقوب عثمانی کے ساتھ ساتھ حضرت دردکاکوروی،سکندرعلی وجد، مولانا محمد عمر صدیقی اطہر، اخترالزماں ناصر، حبیب رحمانی، کوکب، اخترنظمی، راہی قریشی یہ سب اورنگ آباد کے سینئر شاعر تھے۔ان کے علاوہ قاضی سلیم، وحیداختر، احسن یوسف زئی، عروج احمد عروج (جو بعد میں پاکستان چلے گئے) اورقاضی سلیم یہ اس زمانے کے مشہور نوجوان تھے۔ان کی صحبتوں میں رہ کر بشرنواز نے شاعری شروع کی۔ اللہ تعالی نے بشرنواز کوموزوں طبع عطاء کی تھی وہ بہت جلداورنگ آباد کے شاعرانہ ماحول میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔بشرنواز خودفرماتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء میں اورنگ آباد میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں بشرنواز نے پہلی بارغزل سنائی تھی۔اس غزل پر یعقوب عثمانی کی اصلاح تھی کیونکہ اس غزل کو حضرت یعقوب عثمانی نے بہت پسند کیا تھا۔اس غزل کے دوشعر بہت مشہور ہیں۔

جب شب کے بھیانک سناٹے میں سارا عالم سوتا ہے
دل یار میں بیتے لمحوں کی بے چین ہمارا ہوتا ہے
جب نور کا عالم ہوتا ہے، جب کیف کی بارش ہوتی ہے
اے حسن و طرب کے مالک سن یک درد کا مارا روتا ہے

ISBN: 978-93-344-4743-9

۱۹۵۳ء میں ہی اورنگ آباد کے شاہ گنج محلّہ کے وسیع میدان میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں حیدرآباد کے سلیمان اریب، ممبئی کے عزیز قیسی اور وحید اختر وغیرہ مدعو تھے۔اس مشاعرے میں بشر نواز نے اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا:

یہ اہتمامِ چراغاں بجا سہی لیکن
سحر تو ہو نہیں سکتی دیئے جلانے سے

تو،اس شعر کے لہجے اور تیکھے تیور نے سبھی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔اس غزل سے ہی بشر نواز کی اپنی شناخت بن گئی اور بشر نواز کو ممبئی اور حیدرآباد کے ادبی حلقے میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور پھر ان کو مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا۔ چنانچہ جب ان کو حیدرآباد کے مشاعروں مدعو کیا گیا تو وہاں ان کی دوستی شاذ تمکنت،سلیمان اریب اور مغنی تبسم سے ہوگئی۔ یہ سب شعراء اس زمانے کے قدآور شعراء تھے اور اورنگ آباد کے قاضی سلیم اور وحید اختر نے بھی اپنی ملک گیر شناخت بنالی تھی۔ان کی دوستی اور ان کی صحبتوں نے بشر نواز کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارا۔

1960 کے بعد وہ ادب کے جدید گروہ میں شامل ہوگئے باقر مہدی،خلیل الرحمٰن اعظمی ،راہی معصوم رضا،محمد علوی وغیرہ کے یہاں جدید رجحانات کافی زور پکڑ چکے تھے،ندا فاضلی ،قاضی سلیم اور بشر نواز کی تخلیقات میں بھی جدید رجحانات کثرت سے پائے جانے لگے،ان قلم کاروں کی سرپرستی چند ادبی رسائل کررہے تھے،سلیمان عریب کی ادارت میں نکلنے والا حیدرآباد کا ''صبا'' بنگلور سے ''سوغات'' کراچی کا ''سات رنگ'' لاہور کا ''سویرا'' اور دہلی کا ''محور'' ان ادبی رسائل میں جدید قلم کاروں کی تخلیقات کثرت سے شائع ہورہی تھی جدید شعراء میں خلیل الرحمٰن اعظمی ،زبیر رضوی،محمد علوی،شہر یار،شاذ تمکنت،قاضی سلیم اور بشر نواز بحیثیت جدید شاعر ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے علاقہ مراٹھواڑا سے ایک نسوانی آواز شفیق فاطمہ شعراء نے ادب میں بلند مقام حاصل کرلیا تھا۔مراٹھواڑہ کے اور تین شاعر احسن یوسف زئی،میر ہاشمی اور قمر اقبال بھی اپنے متوازن جدید لب ولہجے سے پہچانے جانے لگے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بشر نواز کا لہجہ بشر نواز کی اٹھان قابل رزق تھی ہندو پاک کے تقریباً تمام اہم ادبی رسائل میں بشر نواز کی تخلیقات شائع ہورہی تھی۔

بشر نواز کا پہلا شعری مجموعہ 1972ء میں شائع ہوا۔اس شعری مجموعہ کا نام رائیگاں ہے۔اس شعری مجموعہ میں کئی نظمیں ہیں اور ان نظموں میں سے بعض نظمیں ہندو پاک کے میعاری،ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوچکی تھیں۔بشر نواز کی ان نظموں میں اپنے عہد کی روح نظر آتی ہے۔بشر نواز نے اپنی آنکھوں سے جس قتل وغارت گیری اور ظلم،ستم کا مشاہدہ کیا تھا اس کو اپنی ابتدائی نظموں میں اس طرح قید کرلیا ہے۔

ہم تو اپنے دور کی بے رنگیوں، بد عہدیوں اور نفرتوں
مردہ تفصیلات کی زندہ کہانی اپنے خون سے لکھ گئے
ہم کیا کریں کہ اپنا خوں
کالے بد بو دار قاتل زہر کی لہر تھا
ہمارے پیرہن آگ سے کترے گئے تھے
اور جو تھا کھال کے اندر پگھل کر بہہ گیا تھا

"رائیگاں" کی ابتدائی چار پانچ نظموں میں آزادی سے قبل کی قتل وغارت گری،خون ریزی اور عام بے چینی اور اضطراب کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔آزادی کے بعد بھی قتل وغارت گری کا ننگا ناچ یہاں کھیلا گیا اس نے ہر حساس ذہن کو تکلیف پہنچائی۔بشر نواز نے بھی اس ذہنی اذیت کا اظہار اپنی اِن نظموں میں کیا ہیں:

1۔رائیگاں،2۔مسیحا، 3۔ازل تا ابد،4۔تنہا رات سمندر،5۔آدم واہن،6۔پشیمان۔ ان نظموں میں بشر نواز نے اپنے عہد کی سلگتی ہوئی روح کو لفظوں میں قید کرلیا ہے پھر اس کے بعد بشر نواز کی نظموں میں سے چند نظمیں بڑی خوبصورت رومانوی نظمیں ہیں۔ان نظموں میں جدید رومانی حسیت نظر آتی ہے۔ہمزاد، اندھیروں کا راہی،ٹوٹتے خواب،تو ایسا کیوں نہیں کرتے، فاصلہ،اور مجھے کہنا ہے، یہ تمام نظمیں ایسی ہیں جو اردو ادب کی جدید نظم کے سرمائے میں ایک صحت منداور خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جدید اردو نظم کو ایک وقار بخشتی ہیں۔

ISBN: 978-93-344-4743-9

رایئگاں میں نظموں کے بعد تقریبا 21 غزلیں شامل ہیں شاعری کی دنیا میں یہ تمام غزلیں مشہور ہیں اور اپنے متوازن جدید لہجے کی وجہ سے ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

آنکھوں کی لو ،دلوں کی ضیاء لے گئی ہوا
چہروں سے اب کے رنگ وفا لے گئی ہوا
پیاسی زمیں ترستی رہی بوند بوندکو
گھنگھور بادلوں کو اُڑا لے گئی ہوا
چپ چاپ سلگتا ہے دیاتم بھی تودیکھو
کس درد کہتے ہیں وفا تم بھی تو دیکھو
کس طرح کناروں کو ہے سینے سے لگائے
بہتے ہوئے پانی کی ادا تم بھی تو دیکھوں
ہر چہرہ مصلحت کی نقابوں میں کھوگیا
مل بیٹھے کس کے ساتھ کوئی آشنا تو ہو
خاموش پتھروں کی طرح کیوں ہے اپنا شہر
دھڑکن دلوں کی گر نہیں آوازِ پاتو ہو

بشر نواز نے رایئگاں کے علاوہ دوسرا شعری مجموعہ اجنبی سمندر ہے جس پر میں پھر کبھی بات کروں گی۔ بہرکیف بشر نواز صاحب تقریبا ۶۵ سالوں سے شعر کہہ رہے تھے۔اس طویل مدت میں ادب میں کئی انقلابات آئے۔شاعری میں کئی تبدیلیاں آئیں،کئی نئے رجحانات نے سر اٹھایا لیکن بشر نواز نے جس راہ کو اپنایا تھا اس پر وہ تاعمر قائم و برقرار ہیں۔درج بالا بشر نواز کے چند اشعار میں مابعد الجدیدیت کی ترجمانی کرنے والے کچھ اشعار کوٹ ہوتے ہیں۔لیکن ان اشعار میں بشر نواز کا اپنا رنگ تغزل آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔بشر نواز بنیادی طور پر رومانی اور کلاسیکل مزاج کے شاعر تھے۔اُن کے پہلی مشہور غزل کا مطلع رومانوی تھا۔

جب چھائی گھٹا لہرائی دھنک، اک حسن مکمل یاد آیا
ان ہاتھوں کی مہندی یاد آئی، ان آنکھوں کا کا جل یاد آیا

اور ۲۰۱۰ء کے بعد انہوں نے غزلیں کہیں اُن میں بھی ان کا رومانوی انداز اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

☆☆☆

اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے رجحانات

ڈاکٹر عائشہ عبدالعزیز پٹھان
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، پنیہ شلوک اہلیہ دیوی ہولکر سولا پور یونیورسٹی، سولا پور

تمہید :۔

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے ہمیں جہاں سیاسی طور پر محکوم بنا دیا یا اس کے راہیں ہموار کیں وہاں ادبی طور پر ۱۸۵۷ء ایک کامیاب انقلاب کی صورت میں سامنے آیا۔ ہمارے ادبی اقدار جو ایک گہرے جمود کا شکار تھے اور جن کے دامن میں ایک مخصوص قسم کے پھول تھے، جن کی یک رنگی ذہنی نگاہ کو مسرور کرنے کے بجائے بد مزگی کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس انقلاب نے اسے بدلا اور از سر نو غور و فکر کی دعوت دی۔ اس کامیاب ادبی انقلاب نے ان تمام شعری رجحان کو بدل ڈالا اور اس میں نئے رجحانات شامل کئے جو اردو نظم کے رگ و پے میں دوڑ رہے تھے۔ کیونکہ بقول عبادت بریلوی :

> ادب اور شاعری میں جدید رجحانات کے چراغ اس وقت روشن ہوتے ہیں جب زندگی کے افق پر انقلابات کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں جب زندگی اپنے دائرے کو وسیع کر کے نئے نئے افکار و خیالات اور نئے نئے مسائل و مقتضیات کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔ جب تک سماجی زندگی میں مادی، ذہنی اور فکری تبدیلیاں نہیں ہوتیں ادب و شعر کے لئے نئے راستے تعمیر نہیں ہوتے۔ اور یہ تبدیلیاں ظاہر ہے کہ اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہو سکتیں جب تک کہ کسی بڑے اہم واقعہ سے زندگی کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں خلفشار نہ پیدا ہو جائے اور جس کے نتیجے میں بہت سے مروجہ افکار، خیالات اور اقدار، تصورات کی عمارتیں زمین پر نہ آتیں اور روایات کی کوئی بڑی تعداد خس و خاشاک کی طرح بہہ نہ نکلے۔'' (۱) (جدید شاعری۔ صفحہ ۶۹)

اور ہوا بھی یہی کہ غزل کی روایات جو اپنے بوسیدہ موضوعات کے دیدہ لبادے کو اوڑھے چلی جا رہی تھی اور جس پر لفظوں کے پیوند لگا کر معنی کی عریانیت کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش کی جا رہی تھی، اس کو اتارنے اور نئے لباس کی تعمیر کی جدوجہد شروع ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ دوسری اصناف جو نظم کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کے موضوعات بھی چھین کر انہیں جدید موضوعات سے آراستہ کیا گیا۔ غرض جدید رجحانات کا سنگ بنیاد ۱۸۵۷ء میں رکھا جا چکا تھا۔ اور ۱۹۳۶ء تک آتے آتے وہ مستقل رجحان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے جو رجحانات سامنے آئے ان میں وہ رجحان بھی شامل تھے جو ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے شعر و ادب میں پرورش پا رہے تھے۔ ویسے یہ تحریک بنیادی طور پر اشتراکی رجحان کو لے کر اردو ادب میں داخل ہوئی، جو سر تا پا سیاسی تھا۔ لیکن اس سیاسی رجحان کو مستحکم بنانے اور عوام میں مقبولیت بخشنے کے لیے ان رجحانات کا سہارا لینا پڑا جو اس سے قبل ہماری سماجی، سیاسی، ادبی زندگی میں پرورش پا رہے تھے۔ ہاں اس تحریک نے اتنا ضرور کیا کہ اس سے قبل کے رجحانات میں ایک مصلحت کوشی یا یوں کہا جائے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا طرز عمل تھا۔ اسے رد کر کے پر جوش اور پر خطر انداز دیا۔ غرض ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک جو رجحانات اردو شاعری خصوصاً اردو نظم میں وارد ہوئے وہ حسب ذیل ہیں :

۱۔ اشتراکی رجحان (جس میں تقریباً وہ رجحانات شامل ہیں جو اس سے قبل الگ حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ مثلاً قومی اصلاح کا رجحان سماجی اصلاح کا رجحان۔)

۲۔ رومانی رجحان (جو اس تحریک سے قبل خالص رومانی تھا لیکن اب ذہنی بیداری نے اس میں رومانیت کے ساتھ ساتھ سیاست بھی بھر دی ہے۔)

۳۔ جنسی رجحان (اس رجحان کا تعلق ان شعراء سے ہے جو نظریاتی طور پر اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے اور ذہنی طور پر مغربی مفکر و شاعر فرائڈ۔ ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ سے متاثر تھے۔)

اس کے علاوہ اور بھی رویئے اس دوران اردو نظموں میں نظر آتے ہیں جو گرچہ مستقل رجحان نہ بن پاتے ۔مثلاً آزادی اور قومی یک جہتی کے موضوعات ۔

ا۔ اشترا کی رجحان:۔

ان دس برسوں میں سب سے غالب رجحان اشترا کی رہا ہے۔اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ یہ رجحان ایک باضابطہ تحریک کی دین ہے۔جس کے پیچھے ایک منظم گروہ پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ کام کر رہا تھا۔جس کا ذہن نہ تو مانگے کی روشنی سے منور تھا اور جہاں نہ کوئی تقلیدی عمل کارفرما تھا۔اس گروہ کے نوجوان ہندوستان کے ان چند خوش نصیب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لئے مغربی ممالک میں جاتے تھے۔ساتھ ہی ساتھ جن کو علم وفضل کی دولت بھی ورثہ میں ملی تھی ۔یہ نوجوان (سجاد ظہیر،ڈاکٹر ملک راج آنند،ڈاکٹر جیوتی گھوش،ڈاکٹر ایس سنہا،ڈاکٹر محمد تاثیر وغیرہ) گرچہ حصول علم کے لئے مغربی ممالک میں رہے لیکن اپنے ملک کی حالتِ زار سے بے خبر نہیں تھے۔ایک طرف اگر انہیں اپنے ملک کے سیاسی سماجی اور ادبی ماحول کی خستگی کا احساس تھا تو دوسری طرف عالمی سیاست کے بدلتے ہوئے تیور پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔انھوں نے دیکھا تھا کہ فسطائی طاقتیں کس طرح جمہوری نظام کو کچلنے پر تلی ہوئی ہیں اور جب ۱۹۳۶ء میں پیرس کانفرنس نے فسطائی طاقت کے خلاف آواز بلند کی تو انھوں نے بھی لبیک کہا اور محسوس کیا کہ ہندوستان میں بھی جمہوری نظام کے قیام کے لئے اشترا کی نظریۂ حیات یہ سہارا لینا ضروری ہے اور ان تمام ادبی اقدار کو بدلنا بھی ضروری ہے جو اس نظریئے کی اشاعت میں معاون ثابت نہ ہوں کیونکہ ان کا منشا تھا کہ:

> ادب کو محض جذبات نگاری وفن کاری کے لئے وقف نہ کیا جائے بلکہ زندگی کے قریب تر کر دیا جائے ۔مزدور کاشتکار،مفلس،مظلوم کی سرگذشت بیان کر کے دنیا کو ان کا ہمدرد بنایا جائے اور ان کی اہمیت بتا کر خود ان کو ابھارا جائے تا کہ اپنی حالت درست کر سکیں۔اسی کے خلاف سرمایہ داری ،توہمات،ظلم و جبر واستبداد، فاشیت،نازیت وغیرہ کے خلاف نظم ونثر میں مضامین لکھے جائیں۔ ہر چیز کو کارآمد طریقہ سے اس (۳) کے اصل مفہوم میں پیش کیا جائے ۔(۲) (نئے ادبی رجحانات ۔صفحہ ۴۴)

اور جب اس تحریک کی بنیاد انجمن کی صورت میں مستحکم ہوتی گئی تو دوسرے ہندوستانی ادیب وشاعر بھی اس میں شامل ہونے لگے۔اور اپنے قلم سے انھیں خیالات کا اظہار کرنے لگے۔جس کا تقاضا یہ تحریک کر رہی تھی۔اس تحریک سے وابستہ نظم نگاروں میں سردار جعفری،فیض احمد فیض، مجاز، جوش، جاں نثار اختر،مخدوم اور پرویز شاہدی سرفہرست تھے۔لیکن تحریک کی دوسری صنف میں خلیل الرحمٰن اعظمی ،جذبی وغیرہ اہم ہیں۔ان شعراء نے تقریباً ان تمام موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔جوان کے اشترا کی نظریئے کے دائرے میں آتے ہیں یا میہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے انسانیت کی بنیادی قدروں کو حقیقت کا روپ دے کر شاعری کا حق ادا کیا۔البتہ شاعر کی فطری صلاحیت اور طبیعت کی موانست کی وجہ سے لہجہ میں فرق ضرور محسوس ہوتا ہے۔ان شعراء کی نظموں میں خصوصاً اس دور کی نظموں میں اشتراجی رجحان کے علاوہ ،وہ رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔جس کی پرورش اس رجحان کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔مثلاً انقلابی رجحان میں جس میں رومانی رجحان اور بغاوت کا رجحان بھی شامل ہے۔ اس رومانی اقلابیت میں انقلاب سے ذہنی وابستگی نظر نہیں آتی اور نہ انقلاب کے ادراک کا ہی پتہ چلتا ہے ۔ بلکہ انقلاب سے جذباتی وابستگی اور ہیروازم کے میلان کا احساس ہوتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن رائے بڑی معقول ہے:

> انقلاب آہنگ کے دوروپ ہوتے ہیں۔ایک تجربہ کا رجزو بن کر گہری انقلابی بصیرت کی شکل اختیار کر لیتا ہے،دوسرا انقلاب کو تجربہ یا شخصیت نہیں بناتا صرف نعرہ بنالیتا ہے۔انقلاب اس کے لئے فیشن یا فارمولا بن جاتا ہے۔(۳) (دیار سحر، مطبع ۱۹۶۰ء)

انقلاب کے اس رومانی رجحان کے علاوہ اس دور کی نظموں میں ایک اور رجحان کا پتہ چلتا ہے وہ ہے ''انقلابی بغاوت'' کا رجحان۔انقلابی بغاوت سے مراد یہاں اس انقلاب سے جو پر تشدد طریقہ کار سے لایا جائے۔جس میں دہشت پسندی ہو اور ہر تعمیر سے پہلے تخریب سے گزرنا ضروری خیال کرتا ہو۔اس رجحان کو فروغ دینے میں ترقی پسندوں کے سب سے بڑے شاعر جوش ملیح آبادی کا ہاتھ ہے۔جوش نے اپنے پر جوش خطلیبانہ انداز بیان سے نوجوان شعراء کو اس طرف راغب کیا اور کچھ ہی دنوں میں ایسی فضا پیدا کر دی کہ تقریباً ہر شاعر قلم اٹھانے کے بجائے شمشیر بکف نظر آنے لگا۔کہیں مجاز مزدوروں کا جوش انتقام کے پردے میں سرمایہ داری کے نظام کو خون کو ہولی کھیل کر ڈھانا چاہتے ہیں۔

گر پڑیں گے خوف سے ایوان عشرت کے ستون

خون بن جائے گی شیشوں میں شراب ِ لالہ گوں
خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
جھونپڑوں میں خوں محل میں خون، شبستانوں میں خوں
دشت میں خون، وادیوں میں خون، بیابانوں میں خوں
(انقلاب)

اور جب اس رجحان میں کافی شدت آ گئی اور یہ احساس ہونے لگا کہ کہیں اس تشدد پسندی کا سطحی اظہار صالح انقلابی رجحان کی راہ میں رکاوٹ بن جائے اور منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں قافلہ منتشر نہ ہو جائے تو سجاد ظہیر نے اسے روکنے کے لئے اس رجحان کی خامیوں کو پیش کیا اور یہ باور کرنے کی کوشش کی کہ یہ طرز اظہار ایک اشتراکی شاعر کو کسی بھی طرح زیب نہیں دیتا اس لئے اس سے دامن بچانا ضروری ہے۔ غرض اس رجحان (۴) سے اشتراکی شعراء نے دامن بچانا شروع کیا اور کچھ ہی دنوں میں اس ادبی دہشت انگیزی پر غلبہ پا لیا۔

رومانی اور جنسی رجحان :۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں (۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۲ء تک) اشتراکی، انقلابی اور رومانی انقلابیت کے رجحان کے ساتھ ساتھ رومانی اور جنسی رجحان بھی پرورش پا رہا تھا۔ ان رجحانات کے علمبرداروں کا باضابطہ تعلق اس تحریک سے نہیں تھا، لیکن انھیں ابھی ترقی پسند کہا جاتا تھا۔ غالباً اس لئے کہ وہ بھی اردو نظم کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کرا رہے تھے لیکن حالات نے دونوں کے درمیان فرق واضح کر دیا اور انھیں نئے ادب کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ ان شاعروں نے بھی جو حالات کا مشاہدہ کیا تھا اور ان کی نظریں بھی عالمی مسائل اور فسطائی قوتوں کی جبر و استبداد پر تھیں لیکن ان کی دور بینی نے یہ محسوس کیا تھا کہ ان قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے جو راہیں اختیار کی گئی ہیں وہ منزل پر نہیں لے جائیں گی۔ اور جس اشتراکی طرز فکر کو نجات کا ذریعہ بنایا گیا ہے وہ اس سر زمین کے لئے موافق نہیں ہے اور پھر بقول عبادت بریلوی:

''وہ تحریکیں یا وہ افراد جو ان حالات کو بہتر بنانے کا دعویٰ کرتے تھے ان کے یہاں خود خلوص نہیں تھا۔'' (۴) (جدید شاعری۔ ص۔۹۵)

اس لئے ان کی نظر میں نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ ان تمام سماجی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اقدار کو چور چور کر دیا جائے جن سے ہماری زندگی وابستہ ہے اور اپنے خود میں پناہ ڈھونڈی جائے۔ ان کی یہ قنوطیت، کلبیت، تخریبی طرز فکر ایک مستقل رجحان کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر جس طرح ترقی پسندوں کی نظریں مارکس، ہیگل اور لینن پر تھیں، اسی طرح ان کی نظر کے سامنے بھی فرائڈ، بوڈلیر تھے۔ کیونکہ عالمی طور پر اشتراکیت کے دوش بدوش یہ رجحان بھی پرورش پا رہا تھا اور عالمی ادب جہاں اشتراکیت سے متاثر ہو رہا تھا۔ وہاں فرائڈ کی تحلیل نفسی اور بوڈلیر اور مالرمے کی انفرادیت پسندی اور علامت نگاری کا اثر بھی قبول کر رہا تھا۔

اس دوران میں ان رجحانات کے علاوہ نظموں میں اور دوسرے موضوعات بھی شامل رہے ہیں جیسے قومی یک جہتی کا موضوع، حصول آزادی کا موضوع، گویا موضوعات کبھی مستقل رجحان کی صورت اختیار نہیں کر سکے اور نہ کبھی ان موضوعات سے شاعر کی داخلی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہو گی کہ ان موضوعات میں قومی یک جہتی کا موضوع اردو شاعری کی ابتداء سے اس کی خمیر میں شامل رہا ہے اور قلی قطب شاہ سے لے کر اقبال اور اقبال سے لے کر موجودہ دور کے شعراء تک سب نے وقتاً فوقتاً اس موضوع پر نظمیں کہی ہیں۔

اس کے باوجود قومی یک جہتی کا موضوع ایک رجحان کی صورت کبھی بھی اختیار نہ کر سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستان میں اگر آریوں سے قبل ایک قوم کا تصور رہا ہو تو لیکن آریوں کی آمد کے بعد سے لے کر اب تک یہ قومی تصور جامع صورت میں کبھی نہیں رہا۔ ہاں وقتاً فوقتاً جب بھی ملک پر کوئی مصیبت آن پڑی اور ہندوستانیوں کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تو سب اس آفتِ ناگہانی سے نپٹنے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔۔۔۔ لیکن جونہی اس مصیبت سے نجات ملی اپنے سابقہ نظریئے کے خول میں محصور ہونے لگے۔ اس کی وجہ بقول حامد حسین:

قبیلہ پرستی ان پر اس قدر مسلط تھی کہ قومیت کا احساس تو درکنار، طبقے اور ذات کی عصبیت بھی مٹ گئی تھی یہی قبائلی روح عام سماج میں

سرایت کر گئی تھی اور اس نے چار ذاتوں کو بے شمار ذیلی ذاتوں میں تقسیم کر کے قومی وحدت کا تصور تک مٹا دیا تھا۔(۵) (قومی تہذیب کا مسئلہ۔ص۔۷۷)

لیکن اس کے باوجود بھی ہر زمانے میں ایک مخصوص طبقہ جو مختلف مذہبی، لسانی اور سماجی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جن میں صوفی، سنت اور فقیر سے لے کر شاعر، ادیب اور بادشاہ تک سبھی شامل تھے اور جو اپنے گیتوں، دعائیہ نظموں، اپدیشوں اور فرمانوں سے اس موضوع کو پروان چڑھانے اور ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک قومیت کا تصور جگانے میں ہمیشہ کوشاں رہے اور پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک بھی یہ موضوع دوسرے تمام رجحانات اور موضوعات کے ساتھ اردو نظموں میں رہے اور پھر ہر مکتبہ فکر کے افراد نے جب بھی اپنے نظریئے کی اشاعت میں اجتماعیت کی ضرورت محسوس کی تو قومی یک جہتی کا دامن پکڑ لیا۔

لہٰذا جب وطنیت کا جذبہ اچھی طرح دل میں پیدا ہو گیا ویسے اس جذبے کو انگریزوں نے اپنے طرزِ عمل سے مزید تقویت پہنچائی۔ ان کے جا بجا ظلم وستم نے انھیں ایک جابر حکمراں تصور کرنے پر مجبور کیا اور جب ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہم ایک ظالم حکومت کے زیر سایہ جی رہے ہیں تو اس سایہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ جسے دوسرے لفظوں میں آزادی کی تحریک کہہ سکتے ہیں۔ اور اردو کے شعراء نے اپنی پر اثر نظموں سے ان کے اس جذبہ میں وجدانی کیفیت اور والہانہ پن پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اس موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں ملتی ہیں اور اردو کے تقریباً ہر شاعر خواہ اس کا سیاسی نظریہ اور سیاسی مسلک کچھ بھی ہو اس موضوع پر نظمیں کہنا اپنا سب سے بڑا منصب سمجھا۔ ایک طرف اگر ظفر علی خاں، نوید آزادی ہند، اس طرح ڈہے رہے تھے۔

وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستان ہو گا
مبارک باداس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا
علم لہرا رہا ہوگا ہمارا رائے سینا پر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اور پھر ترقی پسند نوجوان شعراء نے اپنی شعلہ نوائی سے تو پورے ماحول میں جذبے کی گرمی بھر دی اور ان کا لہو شریانوں سے پھٹ نکلنے کو بے تاب نظر آنے لگا۔ اس بے تابی کا مظاہرہ مخدوم یوں بیان کرتے ہیں:

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردار آزادی
وطن کے پاسباں وہ تیغ جو ہردار آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمع زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے

غرض حصول آزادی کا موضوع اس دوران بھی دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو نظموں میں جگہ پاتا رہا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس دوران ایک وقت ایسا آیا یعنی دوسری جنگ کے دوران اس موضوع کو دوسرے تمام موضوعات اور رجحانات پر فوقیت حاصل ہوگئی اور ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے شعراء نے اس موضوع کو گلے لگایا۔ کیونکہ مقتضائے وقت یہی تھا کہ اور پھر دوسرے رجحانات کی پرورش بھی اس وقت ممکن نہیں تھی جب تک وہ ذہنی طور پر آزادی حاصل نہ ہو جائے۔ بہر کیف اردو نظموں میں آزادی کا یہ موضوع حصول آزادی کے بعد چند برسوں تک واضح صورت میں شامل رہا ہے۔ کیونکہ آزادی کا جو تصور شعراء کے ذہن میں تھا او رجس کی تمنا انھوں نے کی تھی وہ آزادی انھیں نصیب نہ ہو سکی۔ آزادی کا جو 'اجالا' سامنے آیا تھا وہ 'داغدار' تھا اور جو سحر نمودار ہوئی تھی وہ 'شب گزیدہ' تھی۔

اردو شاعری کی تاریخ میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء کا عرصہ' جو در اصل ترقی پسند تحریک اور نظم دونوں کا دور شباب ہے' نظم کو اس دوران زبر دست مقبولیت حاصل ہوئی اور نظم کے موضوعات ومواد میں تنوع کے علاوہ تکنیک اور اسلوب میں بھی کافی تجربے کئے گئے اور نئے اسلوب بیان اور نئی ہیئت کی تلاش کی گئی۔ اس تلاش میں ترقی پسند شعراء سے کہیں زیادہ وہ شعراء ہے جن کا ذہنی جھکاؤ اشتراکیت کے بجائے مغربی مکاتب ادب کی طرف تھا اور جو ادب میں مقصدیت کے قائل نہیں تھے اور نہ جن کے

سامنے کوئی سیاسی نظریہ حیات تھا۔

غرض نظم کو نئے اسلوب و ہیئت اور نئی تکنیک سے آشنا کرانے میں یہ دونوں مکتبہ فکر سے متعلق شعراء اگر دوش بدوش نہیں تو آگے پیچھے ضرور رہے ہیں۔اور انہی دونوں حلقوں کی کم وبیش کاوشوں کو نتیجہ ہے کہ اردو نظم نے موضوع کے ساتھ ساتھ تکنیکی طور پر بھی ایک حیثیت بنالی تھی۔ آزادی کے بعد اردو نظم کو جو ترقی نصیب ہوئی اور غزل کے احیاء کے باوجود اسے ایک کامیاب اور کارآمد ذریعہ اظہار کا جس طرح وسیلہ بنایا گیا۔وہ شاعری کی کسی دوسری صنف کو نصیب نہیں ہوئی۔

اس طرح نظم اپنے ہیئتی نقائص کی وجہ سے وہ عوامی مقبولت حاصل نہیں کرسکی جو غزل کو حاصل رہی ہے گو ترقی پسند تحریک کے شروع کے چند برسوں میں نظم عوام میں کافی مقبول رہی لیکن چند ہی برسوں کے بعد اولاً ترقی پسند تحریک کی یکسانیت غزل کی احیاء نظم کی مقبولیت کو ضرب لگائے بغیر نہیں رہ سکی۔

حوالہ جات :

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	صفحہ نمبر
۱۔	جدید شاعری	عبادت بریلوی	ص۔۶۹
۲۔	نئے ادبی رجحانات		ص۔۴۴
۳۔	دیارسحر، مطبع ۱۹۶۰ء	ڈاکٹر محمد حسن رائے	
۴۔	جدید شاعری	عبادت بریلوی	ص۔۹۵
۵۔	قومی تہذیب کا مسئلہ	حامد حسین	ص۔۷۷

☆☆☆

سکندر علی وجدؔ کی نظم نگاری

ڈاکٹر اسود گوہر
اسسٹنٹ پروفیسر، ایم جی ایم یونیورسٹی، چھترپتی سمبھا جی نگر، مہاراشٹر

ترے جگنو گرا دیتے ہیں قیمت ماہتابوں کی
تری مٹی کے ذرّوں میں چمک ہے آفتابوں کی
ترے ہی ساز پر میں نے سنے نغمے جوانی کے
ترے ماحول میں سیکھے ہیں گُر جادو بیانی کے
ترے در پر بہار نوجوانی چھوڑ آیا ہوں
نیاز و ناز کی پہلی کہانی چھوڑ آیا ہوں
(اورنگ آباد دکن)

مجھ کو جو کچھ ہے سلیقہ سخن آرائی کا
یہ نتیجہ ہے تری حوصلہ افزائی کا

شاعری ایسا فن ہے جو اصولوں کا پابند نہیں۔فن کار اپنے جذبات واحساسات کو الفاظ کے پیکر میں اس خوبصورتی سے ڈالتا ہے کہ سمندر کو ایک بوند پانی میں اسیر کر لیتا ہے۔اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ادب کے اس وسیع وعریض سمندر میں نئی راہوں، تجربوں اور دریافت کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہر نیا رجحان دوسرے کی نفی کرتا ہے۔لیکن اس نفی میں موجود تضاد ایک نئے رجحان کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔

سکندر علی وجدؔ ۱۹۱۴ء میں تعلقہ ویجاپور ضلع اورنگ آباد مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں مکمل کی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کا رخ کیا۔ یہاں سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۷ء میں سول سرویس کا امتحان پاس کیا۔اسی بناء پر ان کا تقرر محکمۂ انصاف یعنی عدلیہ میں ہوا۔انہوں نے سیشن جج اور کمپشنس کمیشنر کی حیثیت سے عرصۂ دراز تک خدمات انجام دیں اور ۱۹۶۴ء میں اپنے فرائض سے قبل از وقت سبکدوش ہوگئے۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۶ء کی مدت کے لئے انہیں پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) کا ممبر بھی نامزد کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں حکومت مہاراشٹر نے اردو اکیڈمی کی قائم کی اور انھیں اس کا نائب صدر مقرر کیا۔ ۱۹۸۱ء میں انہیں اردو زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کے ادارے ترقی اردو بورڈ کا وائس چیرمین بھی مقرر کیا گیا۔

بیسویں صدی کے نصف میں ابھرنے والے اہم شعراء میں سکندر علی وجدؔ اہم مقام رکھتے ہیں۔شاعری کی ابتداء وجدؔ نے اس وقت کی جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔وجدؔ نے اپنا پہلا مشاعرہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ۱۹۳۰ء میں اورنگ آباد میں مہاراجہ کرشن پرساد صدر اعظم سلطنتِ آصفیہ کے سامنے غزل پڑھی تھے جس کے اشعار اس طرح تھے:

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند
گوہرِ نایاب بن کر رہ گئی

ISBN: 978-93-344-4743-9

اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے
ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی
وجدؔ کیا معلوم کیا بنتی وہ شئے
جو شراب ناب بن کر رہ گئی

مہاراجہ کرشن پرساد کو یہ غزل اتنی پسند آئی کہ انھوں نے غزل کے ہر شعر پر ایک ایک اشرفی انعام میں عطا کیں۔ وجدؔ نے روایتی غزل پر طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی انداز میں نظمیں کہیں ہیں۔ بہ حیثیت شاعر وجدؔ غزل اور نظم پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ لیکن ان کا رجحان نظم کی جانب نسبتاً زیادہ تھا۔ ان کی نظموں میں رنگینی اور غنایت کا رنگ شامل ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات قدیم و جدید موضوعات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ تازگی و شگفتگی سے بھی ان کی نظموں کے موضوعات کسان، پنکھا قلی، نوجوان سے خطاب اور وقت کی آواز وغیرہ ہیں۔ یہ نظمیں کافی مشہور ہوئیں لیکن جن نظموں نے وجدؔ کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا وہ اجنتا اور ایلورہ ہے۔ نظم اجنتا اور ایلورہ کے متعلق سید شہاب الدین دسنوی نے اپنے مضمون ''جانے والوں کی یاد آتی ہے'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کے تاثرات اس طرح بیان کیا ہے کہ ''اجنتا حسین اور ایلورہ عظیم نظم ہے۔'' نظم اجنتا میں انھوں اجنتا کے شاہکاروں کو الفاظ کا پیراہن عطا کیا ہے۔ اس نظم کو تحریر کرنے سے پہلے انھوں نے دو سال تک اجنتا کا مطالعہ کیا اس کے تاریخی اور مذہبی پہلوؤں کی روشنی لاثانی سنگ تراشی اور مصوری کے شاندار نمونوں کا عالمی عجوبے کی حیثیت سے کیا۔ یہ نظم اجنتا کی خوبصورتی کا بے مثل شعری پیکر ہے۔ جس طرح اجنتا کی پہاڑی کے پتھروں میں انسانی پیکر متناسب انداز میں ڈھل گئے ہیں اور سنگ تراش کی رعنائی خیال کا خوبصورت نمونہ ہیں ویسی ہی رعنائی وجدؔ نے اس نظم میں ان پیکروں کو عطا کی ہے۔ اس نظم سے درج ذیل مصرعے ملاحظہ کیجیے:

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہل ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکس خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے
شراب و شعر کی تاثیر ٹھنڈی ہے ہواؤں میں
بہار زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی لرزاں ہے جھرنوں کی صداؤں میں
یہاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رائج پر سکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شان جمالی ہے
تجلی زار عرفاں شاہکار اِبنِ آدم ہے
سر فطرت عمل کی بارگاہِ حسن میں خم ہے
تمدن منعکس ہو جس میں ایسا ساغرِ جم ہے
جمالِ زندگی رہنِ جلالِ عزمِ گوتم ہے
امید جان تازہ پھر دلِ بسمل میں آئی تھی

ISBN: 978-93-344-4743-9

تلاشِ امن میں تہذیب اس منزل میں آئی تھی

اس نظم کا بنیادی وصف کام کی عظمت و بلندی اور اہمیت کا فلسفہ ہے۔ اس نظم کے آخری بند میں بھی شاعر نے کام کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر
صف آرا تھے شکستِ گردشِ ایام کی خاطر
جھکایا سر نہ اپنا شہرت و انعام کی خاطر
جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

تاریخ کا یہ تصور اپنی تمام تر صحت مندی کے ایک شاعرانہ بانکپن سمیٹے ہوئے ہیں۔

ان کی دوسری کامیاب نظم ''ایلورہ'' ہے جو غالباً انہوں نے ''اجنتا'' کی تخلیق کے بعد ''تکمیلِ فرض'' کی خاطر کہی اور اس کی تخلیق میں بھی اپنے کمال شعری اور وجدان کا مظاہرہ کیا۔ ایلورہ بھی اجنتا کی طرح غاروں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان غاروں میں سنگ تراشی کا جو فن تراشی کے خوبصورت نمونے ہیں۔ ایلورہ کی فنی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے اور شاید اسی احساس عظمت نے ''اجنتا'' کے تکمیل کے طور پر وجد سے ایلورہ کے جمال وجلال اور اس کی فسوں کاری کی تعریف الفاظ کے پیرائے میں اسی طرح کی جو پتھروں کے سینے میں محفوظ ہوگئی تھی۔ ایلورہ کی فنکاری میں دستِ عقیدت کی جلوہ باری ہے اور اس کی تعمیر میں خیال کی دنیا آباد ہوگئی ہے۔ فنکار اپنے عظیم فن کا مظاہرہ کر کے چلے گئے ہیں جن کا اب نام باقی ہے نہ نشان۔ انسانی زندگی میں سب سے اہم چیز کام ہی ہے جو تاریخی اور تہذیبی تسلسل کی ضمانت دیتا ہے اور عظمتِ آدم کا امانت دار بھی ہوتا ہے۔ فن کے جمالیاتی پہلو اور مذہبی جلال و تقدس جس میں انسان کی فطری جبلتیں بھی اپنے آپ کو آشکار کرنے کی کوشش میں مصروفِ کار رہتی ہے۔ یہ سارے پہلو نظم کے محرک ہیں اور اس پس منظر میں اس نظم کا مطالعہ شاعر کی تاریخی بصیرت اور فکر رسا کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ نظم بھی اجنتا کی طرح فکر بلند اور نادر تشبیہات واستعارات کی ایک دلفریب وادی ہے۔ سنگ تراشی اور بت گری کے مسحور کن فنی کمال کی اس وادی کیطرح صدیوں سے خاموش کھڑے ہیں۔

مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں
دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپائے نورِ ازل بت ہیں آستینوں میں
حیاتِ جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں
یہاں جو سیر کو فکرِ رسا نکلتی ہے
وفورِ شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے
عیاں ہے عرصۂ ہستی کے سب نشیب و فراز
ہوئی ہے روئے حقیقت سے دور گرد مجاز
ملی جو ذوقِ عمل کو خیال کی پرواز
نشاطِ کار نے کردی حیاتِ کار دراز
کمند گردش ایام کے اسیر نہیں
نقوشِ دستِ عقیدت فنا پذیر نہیں

ISBN: 978-93-344-4743-9

عظیم عزم تھے جانباز نقش کاروں کے
خزاں کی فکر نہ ارمان تھے بہاروں کے
دلوں میں خواب تھے بیدار کوہساروں کے
نظر عقاب کی تیشے تھے برق پاروں کے
تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

نظمیں ''اجنتا'' اور ''ایلورہ'' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وجؔد نے پندرہ سال تک ان دونوں نظموں پر محنت کی جس کی وجہ سے ان دونوں نظموں کا شمار دنیائے شاعری کی نوادرات میں ہوتا ہے۔تاریخی پس منظر میں لکھی ان نظموں سے شاعر کے مطالعے اور مشاہدے، تاریخی حقائق سے گہری واقفیت اور جزئی تفصیلات، بیان کا فنکارانہ انداز، حسنِ تخیل اور زبان میں نئی تشبیہات اور استعارات کا اضافہ کرنے کی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔وجؔد کے کلام کا اگر ہم جمالیاتی حس کے تحت جائزہ لیتے ہے تو ان کی اہم نظموں میں ''اجنتا''، ''ایلورہ''، ''تاج محل'' اور ''رقاصہ'' کو شامل کر سکتے ہیں۔نادر تشبیہات سے سجی نظم ''رقاصہ'' میں انھوں نے اس کے رقص میں پوشیدہ شراب و شعر اور جلال و جمال کی چلتی پھرتی اور ناچتی گنگناتی ہوئی زندگی سے ہمکنار کیا ہے۔اس نظم میں رقاصہ کی ہر ادا ایک جہانِ معنی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اسی طرح نظم ''تاج محل'' میں بھی انھوں نے پیار و محبت کی اس نشانی کو اپنے مخصوص انداز میں فن کی کسوٹی سے گزار کر عمارت کی دلفریبی اور حسن و جمال کی آراستگی کا پیمانہ کہا ہے۔ وجؔد کی نظم کلاسیکی اصول کی پابند نظر آتی ہے ساتھ ہی ان نظموں میں غزل کا سوزِ دروں اور اشاراتی انداز پوشیدہ ہوتا ہے۔نغمگی، خیال آفرینی، امیجری اور منفرد لب ولہجہ وجؔد کی انفرادیت ظاہر کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی چند غزلوں کو نظم کے پیرائے میں اور غزل کے پیرائے دونوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ان کی نظموں میں غزل کی تمام ترفنی روایات کی نقیب بھی ہے اور اشاراتی اور علاماتی لہجے کے لحاظ سے تغزل سے عبارت کیا جا سکتا ہے۔وجؔد کی شاعری کے متعلق سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''وجؔد کی شاعری کا خمیر عصری حسیت اور لطیف انسانی جذبات کے امتزاج سے اٹھا ہے۔ان کے یہاں فن کا جو مخصوص تصور ملتا ہے وہ اپنے عہد کے مسائل کی آ گہی، ادبی محاسن اور شعری لطافتوں کے شعور سے مرکب ہے۔وجؔد نے فنون لطیفہ کو شاعری میں جس طرح اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ان کے مختلف موضوعات پر اپنی تخلیقی شخصیت کے تاثرات کا جس طرح اظہار کیا ہے اس کی مثال ان کے ہمعصر شعراء کی شعری کاوشوں میں بہت کم نظر آتی ہے۔''

(وجؔد۔جلال و جمال کا شاعر از ڈاکٹر سیدہ جعفر مشمولہ یادِ وجؔد مرتب عنایت علی ص ۱۴۸)

نظم نگاری کے فن کے متعلق وجؔد کا اپنا ایک مخصوص نظریہ ہے۔انھوں نے اس فن کو وارفتگی شوق، جوش تخلیق، ریاض اور جاں سوزی سے عبارت کیا ہے۔ان کا ماننا تھا کہ جس میں اعلیٰ اقدار سے وابستگی کا احساس، انسانی فطرت کی نبض شناسی اور زندگی کی کسک موجود ہو وہی کلام عمدہ فن پارہ کہلانے کے قابل ہے۔ان کی دانست میں فن، زندگی کی ایک صحت مند علامت ہے۔ان کی نظر میں فن جلال و جمال کا مظہر ہے۔ان کی شاعری کا بنیادی وصف شعلہ وشبنم انداز ہے۔ان کے کلام میں جذبات کی لطافت اور خنکی، گرد و پیش کی مہک کے ساتھ نظر آتی ہے۔ان کے کلام میں اپنے عہد کے مسائل مثلاً آزادی کے آدرش، مستقبل کے خواب، جہد مسلسل پر ایقان، مروجہ سماجی نظام سے بیزاری اور نئے افق کی تلاش وغیرہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ گرمئی گفتار اور ولولہ انگیزی بھی ان کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔خطابت کا انداز بھی وجؔد کے کلام میں موجود ہے۔ملاحظہ کیجیے:

موسم نہیں ہے دوست یہ چنگ و رباب کا
لہرا رہا ہے سر پہ علم انقلاب کا
اب کام آئے گا نہ یہ مسلک حباب کا
اس وقت امتحان ہے تیرے شباب کا

طوفان آ گیا ہے مجسم چٹان بن
ہستی کو جس پہ ناز ہو ایسا جوان بن

خارجی زندگی کی ابھرتی اور ڈوبتی چاپ سے وجدؔ بے بہرہ نہیں تھے انھیں اپنے عہد کے مزاج اور اس کی حسیت سے مکمل آگہی تھی۔ یہی وجہ رہی کہ ان کی موضوعاتی نظمیں گہرائی و تہہ داری کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ان کی نظمیں فرزندانِ جامعہ، ترانۂ دکن، اورنگ آباد، ولی دکنی، علی ساگر، عبدالرزاق لاری، شیخ چاند اور مزدور کا پیغام فنی رچاؤ اور پختگی، جگر کاری کا عمدہ نمونہ نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش پر ایک طویل نظم ''کاروانِ زندگی'' بھی لکھی ہے۔جس میں انھوں نے کائنات کے آغاز سے لے کر انسان کے چاند پر اترنے تک کے ذہنی ترقی اور فکری نشو ونما کا جائزہ لیا ہے۔

وجدؔ کی نظم نگاری کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ ان کی نظم نگاری میں امیجری اور اظہار کے ساتھ ان کے ابلاغ میں قوت نمو، بالیدگی اور خوب تر نقطے کی سمت حرکت کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ان کی لفظیات، اسلوب کی گھلاوٹ، اندازِ بیان کی روانی انھیں دیگر شعراء سے ممتاز کرتے ہیں۔

☆☆☆

 ISBN: 978-93-344-4743-9

حمایت علی شاعر: اورنگ آباد کی ادبی زمین کا روشن ستارہ

ڈاکٹر نازنین سلطانہ آصف احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
چشتیہ کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس خلدآباد

شہر اورنگ آباد خجستہ بنیاد ماضی سے لے کر آج تک مختلف علوم وفنون کا گہوارہ اور شعراء واُدبا کا پسندیدہ مسکن رہا ہے۔اس شہر نے ماضی سے لے کر آج تک ہر شعبہ حیات میں اپنی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھا ہے۔شہر اورنگ آباد ہمیشہ سے اُردو کی زرخیز زمین رہا ہے جس کی وجہ سے اس شہر کو ''اُردو کا آنگن'' بھی کہا جاتا ہے۔اورنگ آباد ابتداء سے ہی علم وفن کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں تک بات آتی ہے شاعری کی تو سراؔج اور ولؔی نے اورنگ آباد کو اپنی شاعری سے نہ صرف سیراب کیا بلکہ اپنے کلام سے دوسروں کو بھی متاثر کیا یہاں میری مراد شمالی ہند کے شعراء سے ہے۔ولؔی اور سراج اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔سراج کی وفات کے بعد بھی دکن میں شاعری کی روایت رہی جو ادب کا بیشتر سرمایہ تھا۔اس دور کے طویل عرصے کے بعد اورنگ آباد کی سرزمین سے ایک شاعر اُٹھا اور اس نے ولؔی اور سراؔج کے بعد اپنے آپ کو پیش کیا وہ ہے سکندر علی وجد۔یہ شعر ملاحظہ فرمائیں جو وجد کی آمد کی عکاسی کرتا ہے کہ:

دوسو برس میں وجؔد سراج و ولؔی کے بعد
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم

بہر حال اورنگ آباد کبھی بھی ادیبوں اور شاعروں سے خالی نہیں رہا۔ ہر دور میں ادب نے ترقی کیں اور انشاءاللہ آگے بھی ہمارے شہر اورنگ آباد سے نئے ادیب، نئے فلکار، شاعر، تنقید نگار سامنے آئیگے۔اس سرزمین اورنگ آباد سے ایک جانا مانا نام ''حمایت علی شاعر'' کا بھی ہے۔حمایت علی شاعر ۱۴/ جولائی ۱۹۲۶ء اورنگ آباد مہاراشٹر میں ان کی ولادت ہوئی۔ان کا تعلق سادات گھرانے سے تھا۔ان کے گھر کا ماحول دینی ماحول تھا حمایت علی شاعر کے خاندان کو انعامدار خاندان کہا جاتا تھا کیونکہ ان کے آباواجداد کو بادشاہ کے دور میں کچھ زمینیں بطور انعام میسر ہوئی تھی۔کیونکہ ان کا ماحول دینی و مذہبی تھا اس کا اندازہ حمایت علی شاعر کے اس شعر سے ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

میں جس گھرانے کا ہوں ، مذہبی تھا بہت
طریقتی بھی تھا لیکن شریعتی تھا بہت

انسان کو شروعات سے ہی کسی نہ کسی شعبہ میں دلچسپی ہوتی ہے چاہیے وہ میدان پڑھائی کا ہو یا کھیل کود کا ویسے ہی حمایت علی شاعر کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا ہو سکتا ہے یہ شوق دوستی سے ہوا ہو؟ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ان کے جو دوست واحباب تھے انھیں بھی شاعری کا شوق تھا شاعری ایک الگ چیز ہے اور پڑھائی ایک الگ شاید یہی وجہ رہی ہونگی حمایت علی شاعر کی جو وہ میٹرک کے امتحان میں ناکام ہوئے کیونکہ شاعری پر اُن کی توجہ مرکوز تھی۔حمایت علی شاعر کی ادبی زندگی کا آغاز کے تعلق سے وہ کہتے ہے کہ:

''میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ پہلے مضامین اور افسانے لکھے اور بعد میں شاعری کی۔'' [1] میں اور میرا فن

حمایت علی شاعر کی ابتدائی تعلیم مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ، اورنگ آباد سے ہوئی، اورنگ آباد سے آگے کی تعلیم مکمل کی۔بی۔اے انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے کیا۔کہتے ہے کہ حمایت علی شاعر ایک ضدی مزاج کے مالک تھے اور بغاوت بھی ان کے اندر موجود تھی ان کی ضد اور بغاوت کا ہی نتیجہ تھا کہ اُن کی شادی معراج نسیم سے ہوئی۔حمایت علی شاعر جو تعلیم سے زیادہ منسلک نہیں ہو پائے لیکن انھوں نے اپنی اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔وہ کہتے ہے کہ:

بس ایک کام کیا ہم نے زندگی بھر میں
تمام بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

حمایت علی شاعر کی تصانیف میں ''آگ کا پھول''، ''شکست آرزو''، ''مٹی کا قرض''، ''تشنگی کا سفر''، ''حرف حرف روشنی''، ''دو چراغ محفل'' (مختلف شعرا کے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

کلام کا مجموعہ)، ''عقیدت کا سفر''، ''آئینہ در آئینہ'' (سوانح عمری) ''ہارون کی آواز''، ''تجھ کو معلوم نہیں'' (فلمی نغمات)، '' کھلتے کنول سے لوگ'' (دکنی شعراء کا تذکرہ) اور ''محبتوں کے سفیر'' وغیرہ شامل ہیں۔حمایت علی شاعر کے تعلق سے ڈاکٹر قاضی نوید رقمطراز ہے کہ:

''حمایت علی شاعر کی زندگی پر کارل مارکس کے نظریات کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ترقی پسندی نے ان کے مزاج میں باغیانہ عناصر کو فروغ دیا۔'' ۲؎

حمایت علی شاعر حیات اور شاعری: ڈاکٹر قاضی نوید: ص ۴۸

حمایت علی شاعر مذہبی آدمی نہیں تھے مگر کہا جاتا ہے کہ وہ مذہب سے دور بھی نہیں تھے۔ہمدردی، دردمندی، دوستوں سے محبت، اُن کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھنا، بزرگوں کا احترام، مہمانوں کا اکرام وغیرہ ان میں موجود تھا۔ایک اور خوبی اُن کی یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنے افکار کو شخصیات میں نہیں الجھایا۔ان کی طبعیت میں صبر و تحمل بھی موجود تھا۔ان کی شخصیت کے تعلق سے ان کی بیگم معراج نسیم کہتی ہے کہ:

''بعض اوقات پہلی نظر میں کوئی شخصیت بڑی پُرکشش نظر آتی ہے مگر دوبارہ ملنے پر اس کا سحر ٹوٹ جاتا ہے مگر شاعر صاحب کی شخصیت ایسی نہیں ہے۔وہ بہت اچھے باپ ہیں۔وہ بہت اچھے شوہر بھی ہیں۔شاعر صاحب بڑی گمبھیر شخصیت کے مالک ہیں۔'' ۳؎ بیگم حمایت علی شاعر سے ایک گفتگو: شائستہ فرحت: روزنامہ مشرق، کراچی، ۳۰/اپریل ۱۹۷۵ء

حمایت علی شاعر نے جہاں اپنی شاعری میں کلاسیکیت کو اپنایا ہے تو وہاں انھوں نے جدیدیت کو بھی ترجیح دی ہے۔'' آگ کا پھول'' حمایت علی شاعر کا پہلا شعری مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعہ کو انھوں نے اپنے والد صاحب سید تراب علی کے نام کیا ہے انتساب میں انھوں نے اس شعر کے ذریعے اپنے درد کو بیان کرنے کی کوشش کیں وہ لکھتے ہے کہ:

اس ابر کو بھی اڑالے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا دستِ مہرباں کی طرح

'' آگ کا پھول'' عنوان سے واضح ہوتا ہے شاعر کس قدر غمگین ہے اور ان اشعار کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاید حمایت علی شاعر کو زندگی سے کئی شکاتیں ہے پہلی شکایت تو فکر معاش کی ظاہر ہوتی ہے۔فکر معاش کے بارے میں ابتدائی شعر سے ظاہر ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

فکر معاش کھا گئی دل کی ہر اک اُمنگ کو
جائیں تو لے کے جائیں کیا حسن کی بارگاہ میں

حمایت علی شاعر کی نظموں میں شدید تنہائی کی کیفیت بھی جھلکتی ہے اکیلے پن کا احساس انسان کو مایوس کر دیتا ہے۔ان کی شاعری کا جائزہ لیں تو یہ بھی اندازہ ہوتا ہے۔فکر معاش کے ساتھ ساتھ جو جذبہ محبت پر حاوی ہو جاتا ہے اس عہد کی عکاسی بھی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔انھوں نہ صرف یہ بلکہ سیاسی مسائل کو بھی اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔'' آگ کا پھول'' کی اکثر نظموں میں گہرائی کے ساتھ گیرائی بھی پائی جاتی ہے۔اس مجموعہ میں شاعر نے اُمید کی کرنوں کی بھی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔

'' آگ کا پھول'' کا پہلا حصّہ ''حرف دل'' سے آشنا ہے تو وہی دوسرا حصّہ ''حرف لب'' یعنی اس میں شاعر نے حالات کے عکاسی کی ہے تو اس کا تیسرا حصّہ ''حرف جاں'' پر منحصر ہے۔بحر حال حمایت علی شاعر چونکہ تنہائی کی زندگی سے وابستہ تھے اس لیے محبوب کے ملنے کے بعد بھی انھیں اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے وہ بھول نہیں پاتے ہے اپنی ابتدائی زندگی جس وقت وہ دو یا تین سال کے تھے تب ان کی والدہ اللہ کو پیاری ہوگئی اور وہ تنہائی کا شکار ہوگئے والدہ کے بعد دادی نے ماں کا فریضہ انجام دیا ابھی وہ ماں کے جانے کے غم سے اُبھرے بھی نہیں تھے تو اس کی بڑی بہن بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔اس کرب کی جھلکیاں اُن کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔اس شعر سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ:

کوئی ہمدم نہیں، مونس نہیں، دم ساز نہیں
اپنا غم کس سے کہوں کوئی بھی ہمراز نہیں

حمایت علی شاعر چونکہ باغیانہ کیفیت ان پر طاری ہو چکی تھی وہ سماج کے اصولوں س ء بیزار ہو گئے تھے۔یہاں تک کہ اتنی بیزارگی تھی کہ وہ تو اپنے نام سے بھی بیزار نظر آتے تھے اس تعلق سے قاضی نوید احمد رقمطراز ہے کہ

ISBN: 978-93-344-4743-9

''وہ سماج کے اصولوں اور روایتوں پر بیزار تھے۔انھیں اپنے نام پر بھی اعتراض تھا۔وہ ولی عہد میر حمایت علی خاں اور اپنا موازانہ کرتے اور سو چتے کہ آخر اس میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔اگر امتیاز ہے تو بس اتنا کہ وہ امیر ہے اور میں غریب ہوں لیکن غریب تو سب انسان دوست ہو تے ہیں اور امیر انسانیت کا روگ۔''۴ حمایت علی شاعر حیات اور شاعری:ڈاکٹر قاضی نوید: ص ۳۶ تا ۳۷

''مٹی کا قرض'' یہ حمایت علی شاعر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔اس میں کچھ تاریخ کی جھلکیاں ملتی ہے تو کہی حب الوطنی کا جذبہ ملتا ہے تو کہی وہ اپنا مٹی کا قرض ادا کرتے نظر آتے ہیں۔اپنے وطن کی مٹی کے قرض کے بارے میں وہ کہتے ہے کہ:

میں ہو اپنی روح پر لا دے ہو ئے مٹی کا قرض
کو ئی شاعر کہہ رہا ہے ، کو ئی پیغمبر مجھے

حمایت علی شاعر کا کہنا یہ بھی ہے کہ''زہر وہی پیتا ہے جسے اپنی مٹی عزیز ہوتی ہے۔''''مٹی کا قرض''اس شعری مجموعہ میں اُن کے نظموں سے ہمیں اُن کی داخلی کیفیت کا اظہار ملتا ہے تو کہی اُن کے درد وکرب کی شدت ملتی ہے تو کہی وہ دنیا پر اعتراض کرتے ہوئے نظر آتے ہے تو کہی وہ تاریخ کے جھروکوں سے آشنا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''تشنگی کا سفر'' یہ طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کا مجموعہ ہے۔جسے شاعر نے اپنی شریک حیات معراج نسیم کے نام کیا ہے۔اس میں چار طویل نظمیں جن میں ''شکست کی آواز''،''بدلتے زوایئے''،''شعلۂ بے دود''اور''بنگال سے کوریا تک'' شامل ہیں۔پہلی نظم''شکست کی آواز'' ایک ڈرامائی نظم ہیاور اس کا کردار خیالی ہے۔اس نظم میں بھی شاعر بیزارگی،اظہار غصہ،جھنجھلاہٹ،زندگی کی الجھنیں اور محرومیاں نظر آتی ہے۔''شعلۂ بے دود'' میں ایک متوسط طبقہ کے نوجوان کی کہانی پیش کی۔اور''بنگال سے کوریا تک''اس نظم میں دوسری جنگ عظیم سے کوریا یعنی تیسری جنگ عظیم پر منحصر ہے۔

''حرف حرف روشنی'' یہ اُن کی سوانحی پر مشتمل ہے۔اس کتاب کو انھوں نے اپنی والدہ کے نام کیا۔جو تین حصّوں پر ہے پہلا حصّے میں ان کے تینوں شعری مجموعے شا مل ہیں۔دوسرے حصّے میں ان کی غزلیں شامل ہے ان کی غزلوں میں رومان بھی ہے،سیاست بھی،تخیل بھی،جذبہ فکر بھی اور تصور بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔اور تیسرا حصّے میں ان کی نظموں کا شمار ہے۔جو انھوں نے نئی نسل کے بچوں پر کہی ہے۔بہر حال انھوں نے سماج کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے معصوم عوام کے استحصال سے بہ خوبی واقیف تھے شا ید یہی وجہ تھی جو انھوں نے ہجرت اختیار کی وہ خود کہتے ہیں کہ:

مجھے جو غم ہے تو اتنا کہ اپنے ہی گھر میں
تہما را ورثہ ہے، میرا عذاب ہجر ت بھی

حمایت علی شاعر نے اپنی زندگی اور شاعری دونوں میں اعتماد اور یقین کو ملحوظ خاطر رکھا اور زندگی کے ہر رنگ و روپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا،حالات کا مقابلہ بھی کیا۔اختر الزماں ناصر نے حرف حرف روشنی کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں:

''حرف حرف روشنی اگر ایک طرف کلاسیکی درو بست کے باعث اردو کی شعری لفظیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے تو دوسری طرف نئی نسل کے نام ایک ایسا زندہ اور زندگی بخش پیام ہے جو اردو کے فکری سرمائے کو کبھی گھٹنے یا لٹنے نہیں دے گا''۵ حمایت علی شاعر حیات اور شاعری:ڈاکٹر قاضی نوید: ص ۱۳۹

حمایت علی شاعر فطری شاعر تھے۔انکی شاعری میں اپنے زمانے کی عکاسی بھی ملتی ہے اور ان کی شاعری داخلیت کی بھی آئینہ دار نظر آتی ہیں۔اُنھوں نے شاعر ی کو زندگی کی تفسیر بھی کہا ہے۔آخر کار یہ شاعر ۱۵ جولائی ۲۰۱۹ء کینڈا میں اس درے فانی سے کوچ کر گئے۔میں اپنی بات ان ہی اس شعر پر ختم کرتی ہوں۔

میں کہ میر ی خا ک کی لو سے ہوا میرا ظہور
کاش ڈھو نڈ ے کو ئی میر ی خا ک کے اندر مجھے

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

ابنِ انشا کی شاعری کے بدلتے رجحانات

ڈاکٹر نور جہاں بیگم شیخ عبدالغنی
اسسٹنٹ پروفیسر، چشتیہ کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، خلدآباد

آزادی کے بعد اردو شاعری نے ایک نئے شعری دور کی شروعات کی، جس میں سیاسی بیداری، سماجی شعور، داخلی کرب، جدید حسیت اور انفرادی تجربات نمایاں ہوئے۔ اس دور کے بڑے شعرا میں فراق گورکھپوری، ناصر کاظمی، منیر نیازی، جون ایلیا، بانو قدسیہ، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، پروین شاکر، ابن انشا وغیرہ کے نام نمایاں ہے۔ فراق گورکھپوری نے رومانوی جمالیات، انسان دوستی اور حسنِ کائنات کو جدید لہجے میں پیش کیا۔ ناصر کاظمی نئی غزل کے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھوں نے سادگی، نرمی اور درد کو اپنی شاعری میں مخصوص موسیقیت کے ساتھ پیش کیا۔ فیض احمد فیض آزادی کے بعد جدید اردو شاعری کے سب سے بڑے نام ہیں جنھوں نے انقلاب، ظلم کے خلاف مزاحمت اور محبت کے موضوعات کو نئی معنویت بخشی۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی نے کلاسیکی روایات اور جدید احساسات کو یکجا کرتے ہوئے نظم وغزل دونوں میں اہم مقام حاصل کیا۔

اس دور کے ایک اور بڑے شاعر منیر نیازی ہیں جو داخلی خوف، تنہائی اور علامتی انداز کے ذریعے اپنی الگ فضا قائم کرتے ہیں۔ جون ایلیا اپنے وجودی احساسات، بے باکی اور فکری بغاوت کی وجہ سے نوجوان نسل میں بے مثال مقبولیت رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد کی شاعرات میں بانو قدسیہ بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنی نثری شہرت کے باوجود چند خوبصورت نظموں میں جذبات، روحانیت اور داخلی لطافت کو بیان کیا۔ پروین شاکر نے محبت، شناخت اور نسائی تجربات کو نہایت لطیف اور جدید انداز میں پیش کر کے اردو شاعری میں نئی جہت پیدا کی۔

اردو شاعری میں تبدیلی کے کئی ادوار دیکھنے کو ملتے ہیں، مگر چند شاعر ایسے ہیں جنھوں نے اپنے لہجے اور انداز سے ایک نئی جہت پیدا کی۔ ابن انشا بھی انہی میں شامل ہیں۔ اُن کا شمار جدید اردو شاعری کے منفرد لہجے والے شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایک طرف دلکش طنز و مزاح کے شاعر ہیں تو دوسری جانب گہری رومانویت اور داخلی کرب کے ترجمان بھی۔ انشا کی شاعری کے بدلتے رجحانات کا مطالعہ نہ صرف اُن کی شخصیت بلکہ اُن کے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا بھی آئینہ ہے۔

ابنِ انشا کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ نمایاں تبدیلیاں اور متنوع رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں جو اُن کی شخصیت، تجربات، سفر، حالاتِ زمانہ اور داخلی کیفیتوں کا آئینہ ہیں۔ ابتدا میں اُن کی غزل و نظم میں ایک نرم رومانویت، سادگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے، جو محبت، جدائی اور معصوم جذبات کو نہایت سادہ مگر دلکش انداز میں پیش کرتی ہے۔ بعد کے دور میں انشا نے طنز و مزاح کو اپنے مخصوص شگفتہ لہجے کی بنیاد بنایا اور سماجی رویّوں، سیاسی حالات اور انسانی کمزوریوں پر ہلکے پھلکے مگر کاری انداز میں تنقید کی، جس نے اُنھیں جدید اردو غزل کا منفرد شاعر بنا دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی شاعری میں داخلی کرب، تنہائی، وجودی سوالات اور زندگی کی بے معنویت جیسے عناصر ابھرنے لگے، جو ان کے تجربات اور مشاہدات کے گہرے اثرات کی علامت ہیں۔ اس کے ساتھ انشا کی سفرنامہ نگاری نے بھی ان کی شاعری کو ایک عالمی وسعت عطا کی، جہاں انسان دوستی، کائناتی شعور اور دنیا بینی کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ یوں ابنِ انشا کی شاعری رومان سے طنز، مزاح سے داخلی انتشار اور ذاتی احساس سے عالمی شعور تک ایک بھرپور ارتقائی سفر طے کرتی ہے، جو انہیں آزادی کے بعد کی اردو شاعری کے منفرد اور ہمہ جہت شاعر کے طور پر پیش کرتا ہے۔

ابن انشا اردو ادب کے ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری مختلف رجحانات اور اسالیب سے عبارت ہے۔ ان کی غزل و نظم میں رومانوی لہجہ، طنز و مزاح، سماجی شعور، سیاسی طنز، داخلی کرب، وجودی احساسات اور سفرنامہ نگاری سے پیدا ہونے والی کائناتی وسعت جیسے عناصر نمایاں ہیں۔ یہ مقالہ انشا کی شاعری کے ارتقائی مراحل کو اُن کے اسلوب، زبان اور موضوعات کے حوالے سے تحقیقی طور پر واضح کرتا ہے۔

ابنِ انشا کی شاعری کے ابتدائی دور میں رومان، سادگی اور نرم لہجے کی خوبصورت آمیزش نمایاں نظر آتی ہے۔ اس مرحلے کی شاعری میں سادگی، موسیقیت اور نرم رومانوی احساس غالب رہتا ہے۔ انشا کے کلام میں میر اور نظیر کی روایات کا ہلکا سا اثر بھی محسوس ہوتا ہے، جو ان کی غزل میں لطافت اور کلاسیکی رنگ پیدا کرتا ہے۔ جذبات کا بیان نہایت سادہ، سیدھا اور بے ساختہ ہے، جس سے قاری کے دل پر فوری اثر ہوتا ہے۔ اس دور کی نمائندہ مثال ان کی مشہور غزل "انشا جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں دل کو لگانا کیا" ہے، جس میں رومان، ہجر اور ہلکی سی اداسی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مجموعی طور پر، اس پورے مرحلے میں انشا کی زبان سہل، نرم اور ترنم سے

بھرپور ہے، جس میں ایک معصومانہ پن اور جذباتی پاکیزگی جھلکتی ہے، جو ان کی ابتدائی شاعری کی انفرادیت کو مزید نمایاں کرتی ہے۔ انشا کی غزل میں جدت اور سادہ مگر بامعنی اظہار کی تصدیق کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر جدید اردو غزل کے تناظر میں ابنِ انشا کے مقام کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابنِ انشا جدید اردو شاعری کے ان منفرد شاعروں میں ہیں جنہوں نے غزل کو شگفتگی، سادگی اور تہہ دار معنویت عطا کی۔''

(سلیم اختر، جدید اردو غزل، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص 176)

دوسرے دور میں ابنِ انشا کے ہاں طنز، مزاح اور سماجی شعور نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس مرحلے میں انشا کا اصل لہجہ پوری قوت سے جلوہ گر ہوتا ہے، جس میں ہلکے پھلکے طنز کے ساتھ گہری سماجی تنقید بھی شامل ہے۔ ان کی شاعری میں روزمرہ کی زبان، عوامی محاورات، اور عام لوگوں کے تجربات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس دور کی خصوصیات میں معاشرتی رویّوں پر طنز، سیاسی حالات پر مؤثر تبصرہ، اور عوامی کرداروں کی پیشکش نمایاں ہیں۔ سماج کے غیر منصفانہ رویّوں اور بدلتی اقدار کا عکس پیش کرتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انشا کی شعری پختگی واضح ہونے لگتی ہے۔ وہ طنز کے پردے میں سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں مگر تلخی کو زاح کی نرمی میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں، جو ان کے فن کی خاص پہچان بن جاتی ہے۔

ابنِ انشا کی شاعری کا تیسرا دور داخلی کرب، تنہائی اور وجودی رجحانات کا دور ہے، جس میں زندگی کے تلخ تجربات، سیاسی ناکامیاں اور ذاتی تنہائی نے ان کے لہجے کو ایک گہری فکری سمت عطا کی۔ اس مرحلے میں انشا کی شاعری میں خود کلامی، وقت اور زندگی سے متعلق بنیادی سوالات، محبت کے بجائے تنہائی کا شدید احساس اور انسان کی بے ثباتی کا شعور نمایاں ہوجاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات کا بیان پہلے سے کہیں زیادہ گہرا اور سنجیدہ نظر آتا ہے۔۔ اس دور میں انشا اپنے مخصوص طنزیہ لہجے کو پس منظر میں رکھ کر زندگی کی سخت حقیقتوں، انسان کے داخلی انتشار اور وجودی سوالات کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں، جس سے ان کی شاعری نہ صرف زیادہ سنجیدہ بلکہ زیادہ فکری اور گہرے شعور کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ گوپی چند نارنگ انشا کی شاعری کو ہمہ جہت تجربہ قرار دیتے ہیں:

''ابنِ انشا کی شاعری میں طنز، رومان اور داخلیت اس طرح باہم پیوست ہیں کہ ایک نئی شعری فضا قائم ہوجاتی ہے۔''

(گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور اردو شاعری، مکتبہ جامعہ، دہلی، ص 317)

ابنِ انشا کی شاعری کا چوتھا دور اُن کے وسیع سفری تجربات، عالمی مشاہدات اور انسان دوستی کے گہرے احساس کا دور ہے۔ چونکہ وہ ایک ممتاز سفرنامہ نگار بھی تھے اور دنیا کے متعدد ممالک کا سفر کر چکے تھے، اس لیے مختلف تہذیبوں، معاشرتی رویّوں اور انسانی رویّوں کا گہرا مشاہدہ ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ اس مرحلے میں ان کی شاعری ایک مقامی شاعر کے احساس سے نکل کر عالمی انسانی تجربے کا آئینہ بن جاتی ہے۔ ان کے کلام میں عالمی تناظر، انسان دوستی، تہذیبی اقدار کا تقابل اور زندگی کو کائناتی زاویے سے دیکھنے کا رجحان نمایاں ہوجاتا ہے۔ ان کا معروف مصرع "چلتے ہو تو چین کو چلئے" نہ صرف سفر کی دعوت ہے بلکہ دنیا کو دیکھنے، سمجھنے اور مختلف تہذیبوں سے سیکھنے کے رویّے کی علامت بھی ہے۔ اس دور کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ سفر نے انشا کی شاعری کو نہ صرف وسعت دی بلکہ اس میں ایک بین الاقوامی، تہذیبی اور انسان دوست رنگ بھی شامل کیا، جس کے باعث ان کی تخلیقات عالمی انسانی تجربے سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی غزل کے ارتقا میں انشا کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انشا نے غزل کو رسمی سنجیدگی کے بوجھ سے آزاد کر کے زندگی کے قریب تر کر دیا۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، اردو غزل کے اہم موڑ، شب خون، الہٰ آباد، ص 141)

ابنِ انشا کی شاعری میں زبان و بیان میں واضح ارتقا دیکھا جاسکتا ہے، جو ان کے تخلیقی سفر کا عکاس ہے۔ ابتدائی دور میں ان کی زبان سادہ، نرم اور رومانوی ہوتی ہے، جس میں تراکیب کی سادگی اور رویّے میں شگفتگی نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ دور ان کی غزل و نظم کی معصومانہ فضا اور دلکشی کا عکاس ہے۔ درمیانی دور میں ان کی زبان محاوراتی، عوامی اور زیادہ سادہ ہوجاتی ہے، اور وہ نئی و انوکھی ترکیبوں اور کردار سازی کے ذریعے طنز و مزاح اور سماجی موضوعات کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ آخری دور میں ان کی زبان علامتی اور فلسفیانہ ہوجاتی ہے، جس میں گہرا داخلی اظہار اور وجودی احساسات جھلکتے ہیں۔ یوں ہر مرحلے پر انشا نے اپنے اسلوب اور زبان کو نئے زاویوں سے ڈھالا، جو ان کے تخلیقی ارتقا اور شعری پختگی کا واضح ثبوت ہے۔ ابنِ انشا کی اسلوبی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی زبان و بیان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ابنِ انشا کی شاعری کی سب سے بڑی فنی خوبی زبان کی سادگی اور لہجے کی شگفتگی ہے۔''

(عبادت بریلوی، اردو شاعری کے جدید رجحانات، مکتبہ جامعہ، دہلی، ص 233)

احمد ندیم قاسمی انشا کی شاعری کے مجموعی تاثر کو جامع انداز میں پیش کرتے ہوئے انشا کے اسلوب کو نہایت سادہ مگر گہرا قرار دیتے ہیں:

''ابنِ انشا ہنستے ہنستے دل کی بات کہہ جانے والے شاعر ہیں۔''

(احمد ندیم قاسمی، مقالاتِ قاسمی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص198)

شاعری میں موضوعات کا پھیلاؤ ایک واضح ارتقائی سلسلے کو ظاہر کرتا ہے، جو ابتدائی دور میں محبت سے شروع ہو کر معاشرت، سیاست، وجودی سوالات اور بالآخر عالمی انسانی تجربے تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح ان کا اسلوب بھی وقت کے ساتھ بدلتا گیا۔ ابتدائی نرمی سے لے کر شگفتگی، طنز اور آخر کار داخلی گہرائی تک پہنچا، اور لہجہ رومانوی رنگ سے طنزیہ لہجے اور پھر اداس وفلسفیانہ کیفیت تک ارتقا پذیر ہوا۔ ان کی انفرادیت اس بات میں بھی ہے کہ انہوں نے طنز اور مزاح کو شاعری میں خوش اسلوبی سے سمو دیا، روزمرہ زبان میں فلسفیانہ باتیں بیان کیں، غزل کو جدید لہجہ عطا کیا، اور نئے استعارات وتجربات پیش کر کے اردو شاعری کو نئے زاویے دیے۔ نتیجتاً، ابنِ انشا محض طنزیہ شاعر نہیں بلکہ ایک حساس، باشعور، انسان دوست اور گہری سوچ رکھنے والے فنکار ہیں، جن کی شاعری رومان سے طنز، مزاح سے داخلی کرب، اور ذاتی تجربے سے عالمی شعور تک ایک مسلسل ارتقائی سفر کی عکاس ہے، جو اردو ادب میں ایک منفرد تخلیقی ترقی کی مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔

ابنِ انشا کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔ وہ 15 جون 1927 کو جالندھر، بھارت میں پیدا ہوئے۔ وہ راجپوت مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انشا جی نے اپنی اعلیٰ تعلیم پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے (اردو) میں مکمل کی۔ وہ اپنی نثر وشاعری، مزاحیہ اور سنجیدہ تحریروں کے لیے مشہور ہیں اور اُن کا اسلوب منفرد اور دلنشین ہے۔ ابنِ انشا شاعر، مزاح نگار، سفرنامہ نگار اور مترجم کے طور پر اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں 'اردو کی آخری کتاب'، 'چلتے ہو تو چین کو چلیے' اور 'آوارہ گرد کی ڈائری' شامل ہیں۔ ابنِ انشا نے اردو ادب میں نئی جہتیں پیدا کیں اور کئی زبانوں سے تراجم بھی کیے۔ وہ 11 جنوری 1978 کو اس دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن ان کا لکھا آج بھی زندہ ہے۔ ابن انشا کی نظمی مہارت کے چند نمونے:

اپنے ہمراہ جو آتے ہو، ادھر سے پہلے
دشت پڑتا ہے میاں عشق میں گھر سے پہلے

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ھے کچھ نے کہا چہرا تیرا
ہم بھی وہیں موجودتھیہم سیبھی سب نپوچھا کیے
ہم ہنس دیئے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ تیرا
اس شہرمیں کس سیملیں ہم سیتو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے ، ہر شخص دیوانہ تیرا

اب نگاہوں میں نہ خواہش ہے نہ حسرت نہ ملال
اب یہاں لب پہ کہاں حرفِ سوال آتا ہے
ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا لیکن
دل ہے پتھر تو نہیں اسمیں تو بال آتا ہے
اب ہمیں کس کی محبت کا یقین آئے گا
اُن کی بے زار نگاہوں کا خیال آتا ہے

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

آزادی کے بعد شاعری میں جدید رجحانات
شیخ علیم اسرار: شخصیت وفن

فہیم خاتون غلام غوث خان ناندیڑ

شاعری الفاظ کا وہ استعمال ہے، جس میں ایک طرف معانی کی وسعت و گہرائی ذہن کو تسخیر کرے تو دوسری جانب نغمگی کی تاثیر دل کو جکڑ لے۔ گویا ایک اچھا شعر بشر کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔

شعر کا پہلا عنصر وزن ہے اور دوسرا عنصر خیال حقیقت کو وزن اور خیال کے سانچے میں ڈھالنا کمال سخنوری ہے۔ شاعری بشر کے لیے اپنے احساسات و جذبات اور مشاہدات و تجربات کی عکاسی کا نام ہے۔ کوئی بھی انسان ہو وہ ہر وقت تخلیقات قدرت کے مشاہدے میں اور خود کے جذبات و احساسات پر غور و خوص میں مصروف رہتا ہے۔ ہر انسان اپنے نظریے سے سوچتا ہے لیکن حساس افراد کا مشاہدہ گہرائی لئے ہوتا ہے۔

لیکن اِن مشاہدات و خیالات اور تجربات کے اظہار کرنے کا طریقہ سب کا الگ الگ ہوتا ہے کچھ لوگ اس کو عام باتوں کی طرح سے یعنی گفتگو سے ظاہر کرتے ہیں کچھ لوگ اس کو لکھ کر یعنی نثر کی صورت میں بیان کرتے ہیں جن کو مضمون، ناول نگاری، افسانوں اور کہانیوں کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ اور کچھ لوگ مختلف فنون جیسے مجسمہ سازی، سنگ تراشی، نقش نگاری اور فنِ مصوری کے ذریعے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگوں کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ شاعری ہوتا ہے۔ شاعری کا تعلق حساس لوگوں کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے شاعری بہت سی زبانوں میں کی جاتی ہے ہر زبان کے اپنے اصول وضوابط ہوتے ہیں۔

لفظ شاعری صرف اُردو زبان کے لیے مخصوص ہے شاعر اپنے خیالات و مشاہدات اور احساسات و تجربات کو اپنے تخیل کے سانچے میں ڈھال کر اُسے ایک تخلیق کی صورت میں اخذ کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنی سوچ لوگوں تک ہو بہو اسی طرح پہنچا دے جس طرح وہ سوچتا ہے۔ اس طرح تخلیق کار کو اطمینان ملتا ہے صدیوں سے لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔

آج بھی تاریخی عمارات ومقامات پہ بنے نقش ونگار آثار قدیمہ سے ملنے والی اشیا سے گذشتہ زمانوں کے لوگوں کے خیالات اور حالات وواقعات کی عکاسی ملتی ہے۔ جس سے موجودہ زمانے کے لوگ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اُس دور میں لوگوں کے حالات زندگی اور اُنکا رہن سہن کیسا تھا یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے شعراء کی تحاریر سے ان کے زمانے کے حالات وواقعات کی عکاسی ملتی ہے۔

شاعری کی بہت سی اقسام ہیں۔ صنف غزل قدیم اصناف سخن میں سے ایک ہے اور یہ ایک مخصوص اندازِ تحریر ہے جو شاعری کے ساتھ منسوب ہے لفظ غزل صرف اردو شاعری کے لئے مخصوص ہے شاعری کی مشہور اصناف میں حمد، نعت، مثنوی، مسدس، نظم، پابند نظم، آزاد نظم، قصیدہ، رباعی، سلام، گیت، سرِ فہرست ہیں۔ اُردو شاعری کے بڑے بڑے شعراء تاریخ میں برصغیر ہندوستان میں ملتے ہیں۔ جن میں میر تقی میر، مرزا اسداللہ خاں غالب، داغ دہلوی اور بہادر شاہ ظفر کے نام سرِ فہرست ملتے ہیں۔

آزادی کے بعد شاعری میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جیسے شاعری کی صنف غزل جو حسن وعشق کی داستان، سوز وگداز نغمگی وشیرینی جہاں ہر خاص وعام کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتی تھی آزادی کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنا رنگ وروپ بدلنا شروع کیا۔ شعراء نے غزل کی ترجیحات کو بڑی حد تک تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ غزل میں حسن وعشق کے علاوہ دوسرے مضامین نیز زندگی کے دیگر مسائل کو بھی شامل کیا جانے لگا۔ لیکن نقادوں کے زبردست اعتراضات نے غزل کو ایک ایسی محدود صنف سخن ٹھہرایا جس میں ایک شاعر ملکی، سیاسی، سماجی، معاشی، مسائل کھل کر بیان نہیں کر سکتا اس لئے شاعری کی صنف نظم کو ترجیح دی جانے لگی۔

1980 کے بعد شعروادب میں جدید رجحان کے پیشِ نظر اردو داں طبقے میں یہ رجحان عام ہوا کہ اپنے تہذیبی تشخص کو بچانے کے لئے شاعری میں ایسے عناصر

شامل ہونے چاہئیں جن سیان کی شناخت اورانفرادیت باقی رہ سکے۔۔اردوشعراء نے زندگی کے ہر پہلو اور موضوعات کو زبان دی اور ملکی وملی مسائل کو نہ صرف اپنے کلام میں شامل کیا بلکہ ان مسائل کے حل کے لئے اپنی دلچسپی دکھائی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ''جدید شاعری'' میں اس کے خدوخال کے بارے لکھتے ہیں:''جو شاعری روایت کی بنی بنائی ڈگر سے تھوڑا ہٹ کر چلتی ہے۔اور جس کی رفتار میں تجربہ کا آہنگ ہوتا ہے اس کو ادبی اصلاح میں جدید کہتے ہیں اور یہ صورت حال کسی خاص دور کی شاعری میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب احساس بدلتا ہے۔ زندگی کے نئے تقاضے جب نئے شعور کو بیدار کرتے ہیں' جب سوچنے کے انداز میں تبدیلی ہوتی ہے' جب غور کرنے کا آہنگ ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے' جب تصورات کے چراغ جلتے ہیں' نئے خیالات کی شمعیں فروزاں ہوتی ہیں' نئے نقطہ نظر کا آفتاب طلوع ہوتا ہے' نئے معیار بنتے ہیں' نئی قدروں کی تشکیل ہوتی ہے۔اوران حالات کے سائے میں زندگی اور ادب کا قافلہ نئی راہوں پر گامزن ہوجاتا ہے۔اس عالم میں شاعری' ایک نیا روپ' ایک نیا انداز ہور ایک نیا آہنگ اختیار کرتی ہے۔اسی کو جدید شاعری کہتے ہیں۔

غزل اردو شاعری میں اپنا اہم مقام رکھتی ہے۔کلاسیکی شعرانے اسے خون سے سینچا ہے۔میر' غالب اوراقبالؒ نے اسے جوفنی اور فکری معراج عطا کی ہے وہ جدید میں مختلف رنگوں میں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔جدید دور روایتی غزل سے نکل کر جدید موضوعات کا متقاضی ہے۔اور جدید اردو غزل نے معاشرتی مسائل سے نکل کر آفاقی مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

فارسی میں غزل عربی قصیدے اور اردو میں فارسی سے آئی۔ایران سے نکل کر اس صنف نے بہت زیادہ ترقی کی' خاص کر کے برصغیر پاک و ہند میں پھیلی۔اردو شعرا کے سامنے فارسی شاعری کے نمونے تھے جن سے اردو شعرا نے فیض اٹھایا اور فارسی تراکیب' تشبیہات واستعارات کو قبول کیا۔

تو مالک و مختار ہے تو سب کا خدا ہے
اے خالقِ کل تیرے لیے حمد ثنا ہے
مظہر تری ہی کن کے ہیں یہ ارض سماوات
یکتا ہے خدا تو کہ تری ذات ورا ہے
سورج یہ ستارے یہ زمیں چاند کی گردش
ہر چیز جہاں کی ترے ہونے کا پتہ ہے
(شیخ علیم اسرار)

ضلع ناندیڑ دکن کے شہروں میں سے ایک اور بھارت کے صوبہ مہاراشٹر میں واقع ہے۔یہ شہر اپنی ادبی وتہذیبی روایتوں کے لیے مشہور ہے۔ہمارے اس شہر ناندیڑ میں ک ءشعراء نے جنم لیا جنھوں نے اردو کی آن بان شان میں اضافہ کیا۔ان عاشقان اردو نے تہذیب وثقافتی ورثے کی حفاظت کی۔ان ہی شعراء کرام میں ایک نامور مفکرانہ شخصیت ہیں علیم اسرار۔

شیخ علیم اسرار سادگی پسند، سنجیدہ، خوش گفتار، فراخ دل، فراخ ذہن، نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، تخلیق کار بھی، اداکار بھی، نفیس رہن سہن اور وضعدار، امنگ و حوصلہ مند، اردو کے معلم، لیلیٰ غزل کے جاں نثار، اپنے سے چھوٹوں کے لیے مشفق، بڑوں کے لیے عزت شناس، متبسم ومترنم، آواز کے دھنی،، اعلیٰ پایہ کے شاعر، اچھے ناظمِ مشاعرہ۔انشائیہ نگار، مضمون نگار، یہ ہے شیخ علیم اسرار کا مختصر خاکہ۔

وہ اپنی نظموں اور غزلوں کے اشعار کے آبشار میں بھی جس شاعر کے نئے نئے تخیلات اور احساسات کی پیاس نہیں بجھتی علیم اسرار اسی سلسلے کے ایک منفرد شاعر ہیں، ان کی فکر، دلی تڑپ اور ذہنی سوچ ان کے ہر شعر میں جھلکتی ہے۔شاعری کے مشہور اصناف حمد، نعت، مثنوی، مسدس، نظم، پابند نظم، آزاد نظم، قصیدہ، رباعی، سلام، گیت، سبھی میں موصوف نے طبع آزمائی کی ہے اور

اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔اردو زبان پر ان کی گہری پکڑ ہے۔

علیم اسرار کے کلام میں ایک تڑپ ہے، تمنا ایک صحت مند معاشرے کی، حالات سے نبرد آزما ہونے کی، ملت کی سرخروئی کی، یہ ایک حساس اچھے اور دردمند شاعر کی آرزو ہے جو علیم اسرار کے کلام میں یہ جا بجا ملتی ہے۔ بزم سخنوران حیدرآباد میں شیخ علیم اسرار نے اپنا تعارف کچھ یوں پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''نام سے آپ واقف ہیں میں ہوں 'شیخ علیم' میری پسندیدہ شخصیت مفسر قرآن ڈاکٹر اسرار احمد ہیں تو ان سے متاثر ہو کر اپنا تخلص اسرار رکھ لیا''۔

سنجیدگی، سادگی، شائستگی اگرچہ ان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کہیں ان کی تحریر میں شگفتگی و بذلہ سنجی کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے جیسا کہ بزم سخنوران حیدرآباد میں اپنی تعارفی تحریر کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک اور بھی ہے جس کو لگتا ہے کہ یہ تخلص اس کے نام پر رکھا گیا چلو یہ خوش فہمی اتنی کام آئی کہ شاعری کرنے کے لیے لگی بندش کچھ حد تک ختم ہوئی آپ کہیں گے شاعری پر روک ٹوک یا پابندی کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہوتی ہے جناب کچھ تو شعراء حضرات کے احوال حال مزاج اور بھی بہت کچھ بس سمجھ جائیے کہ کسی کو پسند نہیں کہ میں شاعر کہلاؤں نام شہرت کماؤں پھر یوں ہوا کہ معاملہ طے پایا کہ میں صرف لکھوں گا مشاعرے نہیں پڑھوں گا کیونکہ قوی امکان تھا کہ اپنوں کی پہنچ سے دور نکل جاؤں گا مطلب شہرت مرے پیچھے آئے گی اور بہت سے اسٹیج کے شعرا کی طرح ان کے خیال میں بہک جاؤں گا''

حقیقت تو یہ ہے کہ جتنا راقمہ الحروف علیم اسرار سے واقف ہوں وہ سستی شہرت سے کوسوں دور رہیں نام و نمود کے برعکس عجز و انکساری ان کی فطرت کا خاصہ رہی ہے۔

نوجوان نسل کے اس ابھرتے ہوئے شاعر کی پیدائش 5 مئی 1976 کو شہر ناندیڑ کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد شیخ چھوٹو میاں، محکمہ آبپاشی میں ملازم تھے۔ تعلیم کا آغاز ننہال میں ہوا۔ جہاں ان کی ہر قدم ایک نئے قاعدے قانون کے ساتھ تربیت ہوئی۔ گویا اصول پسندی ان کے ننہالی گھرانے میں تھی۔

وہاں سے میٹرک کامیاب ہونے بعد والدین کے پاس اپنے گھر واپس آئے۔ انٹر گھر پر رہ کر کیا، اس کے بعد ایجوکیشن میں ڈپلوما (D.Ed) کے لیے داخلہ لیا۔ پھر گھر چھوڑ کر ہاسٹل جانا پڑا۔ جہاں تھوڑی من مرضی کی ابن صفی (اسرار احمد ناروی) کو پڑھا۔ گانے سنے، فلمیں دیکھیں، جی بھر کے کرکٹ کھیلا، مگر دل میں احساس بھی تھا کہ اچھے نمبر سے کامیاب ہونا ہے۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنی ہے۔ یہ آزادی زیادہ دن نہیں چلی والد صاحب کا اپنے کام کے دوران کنال حادثے میں انتقال ہو گیا۔ سر پر ذمہ داری کا بوجھ پڑا ہی تھا کہ اللہ کے کرم سے ایک سرکاری ادارے میں بحیثیت معلم تقرر ہوا۔ لیکن اس بار کوکن کے دور دراز ساحلی علاقے رتناگری میں تدریسی خدمات انجام دیے۔

قدرتی دولت سے مالا مال اونچے سرسبز پہاڑ لال مٹی دور تک سمندر کا کنارہ بہت خوبصورت آب و ہوا کا یہ علاقہ جہاں انہیں اردو کی تدریس کرنی تھی۔ اور وہاں اردو زبان و ادب کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ دوران ملازمت ہی انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ فاصلاتی طور پر جاری رکھا گریجویشن مکمل کیا۔ بچوں کیلئے ڈرامے افسانے مضامین لکھنا پینٹنگ کرنا، تبصرے لکھنا ان کی مصروفیات تھیں۔ تعلیمی ثقافتی اور دینی مجالس کی نظامت کے ذریعے میری اچھی پہچان بن گئی تھی۔ ان کی نظامت اور شعر کہنے کے انداز سے سامعین کافی محظوظ ہوتے بارہ سال کوکن کے علاقے میں قیام کے بعد وہ کسی طرح اپنے وطن تبادلہ کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنا شہر اپنے لوگوں کے درمیان اردو کی محفلوں نے انہیں اپنی طرف کھینچنا شروع کیا اور شعر کہنے کی طرف مائل ہونے لگے۔ اسکول تک پہنچنے کے لیے دیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے جانا پڑتا اسطرح تین سے چار گھنٹے مشق سخن کو ملنے لگے۔ مختلف سماجی ثقافتی تعلیمی شعر و ادب کی محفلوں کی نظامت کے مواقع ملے۔

مشاعروں میں اشعار سنا کر خوب داد حاصل کرتے مگر انہیں اندازہ تھا کہ یہ خام خام شاعری ہے استاد شاعر فیروز رشید صاحب نے علیم اسرار کو شعر کہتے سنا تو انہیں علم عروض سیکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ 2005 سے باضابطہ شعر گوئی کی جانب راغب ہوئے نہیں محسوس ہوا کہ مستند شاعر ہونے کے لیے کسی استاد کی ضرورت ہے ابتدائی مراحل میں صابر شاہ صابر بلڈانوی سے اپنے کلام پر اصلاح لینی شروع کی۔ ساتھ ہی ساتھ علم عروض کی باریکیوں پر اپنی توجہ مرکوز کی۔

تعلیم کا سلسلہ پھر ایک بار شروع ہوا بی ایڈ مانو حیدرآباد سے کیا۔ اس دوران کئی اہل علم و ادب سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ شعر گوئی کو لے کر سنجیدہ ہوئے۔ اسی دوران منظور بھائی (بزم سخنوران حیدرآباد) نے 2015 میں انہیں اپنے گروپ میں شامل کیا جہاں پر نیم طرحی اور بزم قطعات کا سلسلہ جاری تھا منظور بھائی سے حوصلہ ملا

ISBN: 978-93-344-4743-9

۔امین حسن پوری صاحب جیسے قابل قدر استاد شعرا کی رہنمائی حاصل ہوتی رہی یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اس کا فائدہ مجھے تعلیمی میدان میں بھی ہوا انہوں نے بچوں کی مراٹھی نظموں کے ترجمے کیئے۔ جو نصاب کی ہم نصابی سرگرمیوں کی کتب میں شامل ہیں۔

اطفال ادب پر کام کیا، تبصرہ نگاری کی ریاستی تعلیمی شعبے میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ترجمہ نگار کی حیثیت سے کام کیا ریاستی ضلعی سطح پر تسہیل کار کے امور انجام دیے۔ مختلف ادبی تنظیموں میں اردو کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ فروغ اردو فورم کے معتمد ہیں۔ اور ادارہ ادب اسلامی ناندیڑ کے فعال رکن ہیں ادبی اور سماجی سطح پر علیم اسرار کو کئ اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

علیم اسرار کے کلام میں جدید شاعری کے رجحان ملتے ہیں ان کی غزلوں میں بڑی حد تک لچک موجود ہے۔ سادگی، زبان و بیان، ایجاز و اختصار/صناع بدائع کا استعمال، روانی و آہنگ/درد و سوز/بے ساختگی/تشبیہ/استعارہ کے حسن کے علاوہ تغزل کی موجودگی ان کی غزلوں کے اشعار کی نمایاں صفات ہیں۔ غزل کے ہر شعر میں ادراک/احساس اور انسانی تجربہ موجود ہوتا ہے۔ ایک غزل کے متنوع شعر ہر رنگ کے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ علیم اسرار کی غزلوں میں رومانیت، عشق، واردات قلب، حساسیت ملاحظہ فرمائیں:

اساس جاں کی محبت کا پاس کھو بیٹھا
کوئی تمہارے جنوں میں حواس کھو بیٹھا

ترے خیال میں کھوکر پتہ بھی ہے تجھ کو
میں تیرے جیسے کئی غم شناس کھو بیٹھا

زمانے سے کوئی مطلب نہ فکر ہے خود کی
عجیب شخص ہے؛ امید و یاس کھو بیٹھا

لفظوں میں گریہ مری آنکھوں کے نم سے آیا
شعر کہنا تری یادوں کے ردھم سے آیا
عشق کے باب نے کتنے ہی شبستاں بدلے
نقش کاغذ پہ ابھر کر ترے غم سے آیا
میری غزلوں میں تغزل ہو کہ جدت کی نمو
بانکپن سارا تری زلفوں کے خم سے آیا
یوں لگا جب بھی تری یاد کا جگنو چمکا
میرے پہلو میں ستارہ کوئی چھم سے آیا
لوگ کہتے ہیں ستم جس کو نوازش ہیتری
میرے لہجے میں اثر تیرے بھرم سے آیا
خوبصورت سا تصور حسیں مہکا تو لگا
دشت میں جھونکا کوئی باغِ ارم سے آیا

 ISBN: 978-93-344-4743-9

زندہ اسرار وفا کی ہے امانت مجھ میں
یہ بھی فیضان کسی چشم کرم سے آیا

ان کی غزلیں اپنی مقصدیت اور خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے اور سننے والوں کو اپنے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے۔

لہو لہو سی ہے اسرار کربلا کی زمیں
فریب کاری کا کرب نہاں سفر میں ہے

غزل

اک نقش جاودانی مرے ہاتھ میں نہیں
رفتار زندگی کی مرے ہاتھ میں نہیں
کہنے کو کل جہان ہتھیلی میں ہے مگر
من چاہے چار پل بھی مرے ہاتھ میں نہیں
کل رات چاند نے یہ ستاروں سے کہہ دیا
ڈوری کوئی زمیں کی مرے ہاتھ میں نہیں
ویسے تو سارے خواب تھے تعبیر کے لئے
لیکن ذرا سی کل بھی مرے ہاتھ میں نہیں
سب دائرے جدا ہیں الگ سب کی گردشیں
کہتے ہیں سب کہ کچھ بھی مرے ہاتھ میں نہیں
ناکام چاہتوں کا یہ قصہ ہے مختصر
قسمت کی ڈور تیری مرے ہاتھ میں نہیں
مدت سے سر پٹکتی ہے بے کل سی آرزو
من چاہی چیز کوئی مرے ہاتھ میں نہیں
اسرار سارا کھیل مقدر کا ہے رچا
اسباب و ریز گاری مرے ہاتھ میں نہیں

زندگی کے حقائق سے قریب تر یہ غزل کسی بھی حساس قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیکہ شاعر نے غزل کو حسن و عشق کی روایات سے نکال کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترجیحات میں تبدیلی کی ہے۔ جہاں ان کی غزلوں میں حساسیت، روحانی شادابی فکر کی سچائی، بلندی اور گہرائی ملتی ہے وہیں ان کی آزاد و پابند نظموں نے معاشرتی، سماجی مسائل سے نکل کر آفاقی مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ نظموں میں ملکی غیر ملکی حالات، سیاسی حالات، خواتین کے لئے عقیدت، عظیم شخصیات کے لئے خراج عقیدت، امت مسلمہ کے لئے درد، ان موضوعات کو لفظوں کی موتیوں میں پرو کر سادہ سلیس، رواں، عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ عورت کو نظم جہاں میں ضبط کی تنویر بے بہا کہنے والے اس شاعر کی نظم کے چند قطعات ملاحظہ ہوں:

عورت ترے مقامِ تقدس کو ہے سلام
رب کی نوازشات میں پہلی ہے تو عطا

ISBN: 978-93-344-4743-9

نازک سا آبگینہ تو الفت کی انتہا
تیری ہی گود بچے کی پہلی ہے درس گاہ
ایثار تیرا وصف ہے بے لوث تیری چاہ
کتنے ہی زاویوں کو بدلتی ہے اک نگاہ
مشکل میں زندگی کی منوّر کرے تو راہ
توہمنوا رفیق ہے تو مہربان غمگسار
عظمت نشان جیسے مچلتا ہے آبشار
جھونکا ہوا کا مست ہے تو موسمِ بہار
انسانیت کے روپ کا دم سے ترے نکھار
ضامن ہے تو نجات کی ممتا کا آسماں
تو پیکرِ خلوص محبت کی کہکشاں
دریا کی موج تو ہے توکشتی کا بادباں
عورت ترے مقامِ تقدس کو ہے سلام

برما کے حالات اور روہنگی مسلمان پر اپنے درد و کرب کا اظہار کرتی علیم اسرار کی شاہکار نظمیں ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ہیں۔موضوعاتی نظم میں شکستہ ان کی شاہکار نظم ہے محبتوں کی راہ کا میرا سفر شکستہ ہے۔ چند اشعار آپ کی باذوق سماعتوں کے نذر ہے۔

دلوں کے درمیاں تھا جو در شکستہ ہے
شکست خوردہ منزلیں ہیں رہ گزر شکستہ ہے
جنوں کی راہ میں کہیں بھٹک رہے ہیں کارواں
ابھی شکستہ کشتیوں کے ہیں شکستہ بادباں
ابھی تلک شکستہ ہیں مرے زمین و آسماں
زمانے بھر کے لب پہ ہے ابھی شکستہ داستاں
محبتوں کی راہ کا مرا سفر شکستہ ہے
بہار کا حسین خواب ' دل 'جگر شکستہ ہے

علیم اسرار کی شاعرانہ خوبی یہ ہے کہ وہ فی البدیہہ قادر الکلام شاعر ہیں کم سے کم وقت میں وہ کسی بھی موضوع کو اشعار کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ہمارے شہر ناندیڑ کے خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک علیم اسرار جن کی سینکڑوں غزلیں نظمیں اشعار قطعات رباعیات ہمارے مطالعہ میں آچکی ہیں۔بچوں کے لئے ان کی نظموں گیتوں کا مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔جلد ہی ان کے مجموعہ کلام **بازیچہ سخن** اور **منظوم توضیحات** نیز دیگر چار شعری کتب جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔تیاری مکمل ہو چکی ہے

منظوم توضیحات تقریباً 256 صفحات پر مشتمل نظموں کا مجموعہ ہے۔جس میں علیم اسرار صاحب نے علمی، ادبی،، شعراء، ادباء، سماجی خدمتگار، اردو ماہنامے و رسائل، ماہناموں کے مدیر، اساتذہ، ان شخصیات پر توصیفی و حوصلہ افزاء نظمیں شامل کی ہیں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال، مرزا غالب، سے لیکر محمود علی سحر تک پروفیسر نور الحسنین صاحب، ارتکاز افضل صاحب، ایڈوکیٹ بہاؤالدین، فہیم احمد فہیم صدیقی، خواجہ کوثر حیات، عبدالملک نظامی، فیروز رشید، اسد صادق، اطہر کلیم، ماہنامہ اقرأ، ماہنامہ ندائے

نسواں، اور بہت سی قابلِ ذکر شخصیات زبان وملت کے درخشندہ ستاروں پر، جامع اور معیاری نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں اپنے پڑھنے والوں کے تخیل میں ان شخصیات سے روبرو کروا دیتی ہیں۔

علیم اسرار کی **منظوم توضیحات** میں شروعات انہوں نے **حمد بارۂ تعالیٰ** سے کی ہے بعد از ا**ں نعت پاک ﷺ** کا ہر شعر گویا **عشق رسول ﷺ** میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔

وہ ہیں مزمل وہ ہیں مدثر وہ ہیں خدا کی دلیل روشن
وہ خوبصورت حسین تر ہیں ہے جن کا حسن جمیل روشن
وہ مجتبیٰ ﷺ ہیں وہ مصطفیٰ ﷺ وہ مراد قلب خلیل روشن
وہ غمزدوں کی امید بن کر ہیں روز محشر سبیل روشن
مقام محمود جیسے اعلیٰ مقام والیشفیع محشر
سراپا عظمت نشان محمد ﷺ مدینے والے جہاں کے سرور

میری ماں ممتا کی گھٹا

ماں کی محبت سے سرشار، محبت کی چاشنی میں ڈوبا ایک ایک لفظ نظم کی مٹھاس محسوس کرواتا ہے۔

میری دنیا ہے میری ماں تو ہی میرا جہاں
تیرے قدموں تلے موجود ہے جنت کا نشاں

باپ کی عظمت کی معترف ہوتے ہوئے بہت ہی پیارے انداز میں اپنی نظم **باپ جنت کا دروازہ** میں عقیدت کو لفظوں کی خوشبو میں سمویا ہے۔

میں نظم کوئی باپ کی عظمت پہ کیا لکھوں
دو چار بند ان کی شفقت پہ کیا لکھوں
میں چشم دوربین بصارت پہ کیا لکھوں
بابا تمہارے ذوق جسارت پہ کیا لکھوں

ایک سچے محبتی ہمسفر کی عکاسی کرتی ہوئی اپنی شریک حیات پر لکھی نظم **رنگ حیات تم** شاہکار نظم ہے جس میں انہوں نے شریک حیات کو رنگ بہار، اور کل کائنات سے تعبیر کیا ہے۔ **منظوم توضیحات** میں ان کی ہر نظم کا انداز منفرد اور جداگانہ نیز دل کو چھوتا ہوا ہے۔

غرض ایک بہترین شخصیت، اور نوجوان نسل کے نمائندہ منفرد شاعر پر مقالہ لکھتے ہوئے خوشی وطمانیت کا احساس ہوا لیکن پھر بھی ایسا لگتا ہے گویا میں علیم اسرار کی شخصیت اور فن کو مفصل بیان کرنے کا حق ادا نہیں کر پائی۔۔ ہمیں فخر ہے اس انمول شاعر پر اور اس بات پر کہ ان کا تعلق ہماری سرزمین ناندیڑ سے ہے۔

☆☆☆

آزادی کے بعد مراٹھواڑہ میں اُردو غزل

پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال جاوید شیخ ابراہیم
نگراں محقق، پروفیسر و صدر شعبہ اردو
شیواجی کالج ہنگولی، مہاراشٹر

ہمارے ادب میں اردو غزل کو جو اہمیت اور مقام حاصل ہے وہ کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ادب کی اس صنف میں فکر بھی اور فن بھی موجود ہے۔ ہم تمام ہی اس سے واقف ہیں کہ غزل کے معنی حسن وعشق کی باتیں کرنا۔ عورتوں سے باتیں کرنا۔ عورتوں کی باتیں کرنا بیان کئے جاتے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی کے خیالات بھی قابل توجہ ہیں۔

''وہ غزل کی مروجہ تعریف ''سخن از زنان گفتن'' کا ترجمہ عورتوں سے باتیں کرنے کے بجائے عورتوں کی باتیں کرنا بہتر سمجھتے ہیں اور اس طرح فارسی اہل زبان کے محاورے کی تطبیق کے علاوہ غزل کے معنی میں ایک غیر محدود وسعت اور رومانیت پیدا کر دیتے ہیں۔'' (اردو غزل کے ۵۰ سال، صفحہ ۳۴)

حدائق الشعرا اور المعجم کے اقتباسات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

''لفظ غزل کے معنی عورتوں کا ذکر کرنا، ان کے عشق کا دم بھرنا اور ان کی محبت میں مرنا بعض اہل معنی نسیب اور غزل میں فرق کرتے ہیں اور زیادہ تر باکمال شعراء جمال معشوق کا ذکر اور احوال عشق و محبت باہمی کے بیان کو غزل کہتے ہیں۔ اور ان غزلوں کو جن میں کوئی اور حال بیان کیا جائے یا جو کسی مدح کا مقدمہ ہوں، نسیب کہتے ہیں۔ اس بیان سے رشید واطواط کی تائید ہوتی ہے۔ اور اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے بعض بڑے شاعر مضامین کے اعتبار سے غزل اور نسیب میں فرق کرتے تھے مگر وہ بھی نسیب کو غزل ہی کی ایک قسم سمجھتے تھے۔''

(اردو غزل کے ۵۰ سال، صفحہ ۳۴)

غزل کے اس تعارف کے بعد ہم اپنی گفتگو کا رخ مراٹھواڑہ میں اردو غزل آزادی کے بعد اس کی طرف کرتے ہیں مراٹھواڑہ میں اردو غزل کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کے اردو غزل کی تاریخ لیکن ہمیں یہاں ہمیں صرف آزادی کے بعد اردو غزل کی سمت و رفتار سے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ چونکہ غزل ہمارے تہذیبی و سماجی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ گویا وہ ہمارے تہذیب اور سماج کی آئینہ دار ہے۔ روز اوّل سے آج تک غزل نے ہمارے ادبی، لسانی و جمالیاتی، تہذیبی و تمدنی تمام تقاضوں کو پورا کرنے قریضہ بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی سے لے کر تمام موضوعات چاہے وہ سیاسی، سماجی، مذہبی ہو۔ تمام کو اپنے دامن میں سمویا ہے۔ یوں کہا جائے کہ غزل ہماری تہذیبی وسماجی زندگی کا پرتو ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

چونکہ آزادی کے فوری بعد تقسیم کا مرحلہ درپیش آیا تھا۔ جس میں لاکھوں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ عصمتیں تار تار کی گئیں۔ آزادی کے بعد کا منظر نامہ غزل کے لئے ساز گار نہیں تھا۔ اس وقت کے سارے حالات اور انتشار کی کیفیت ہمیں غزل میں دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں تک مراٹھواڑہ میں اُردو غزل کی بات ہے، یہاں اس کا منتظر قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ غزل یہاں اپنے ابتدائی زمانے سے رہی ہے۔ ولی اورنگ آبادی سے اسکی روایت شروع ہوتی ہے۔ مراٹھواڑہ کے غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ہر دور میں ہر رنگ سے متاثر شعراء اپنی اپنی شعری کائنات آباد کئے نظر آتے ہیں۔ جن میں یعقوب عثمانی، صدق جائسی، متین سروش اور درد کاکوروی، ہریشچند ردکھی جالنوی، محمد شرف الدین فیضی اور اظہر جالنوی جبکہ ترقی پسند تحریک کے علمبردار لالہ بندہ پرساد سریواستو خیال اور امام الدین یقین نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی کلاسیکی شعراء کی حیثیت سے اختر الزماں ناصر اور سکندر علی وجد کے نام قابل ذکر ہیں۔

جوں جوں یہ قافلہ آگے بڑھتا ہے اس کی تابناکی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ایک ایسا نام ہمارے سامنے آتا ہے جسے بشر نواز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بشر نواز

کی غزل میں روایت ارضیت اور تاریخ وثقافت کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔انہوں نے ترقی پسند تحریک سے لے کر جدیدیت کی تحریک تمام تحریکات کا زمانہ دیکھا لیکن اپنے آپ کو کسی تحریک سے وابستہ نہیں کیا۔اپنی انفرادی شناخت بنائی اور اسے برقرار رکھا۔

دوسرا اہم نام حمایت علی شاعر کا ہے جو بے پناہ تخلیقی سوتوں کے مالک ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیقات کو پیش کرنے کے لئے بیش تر شعری ونثری اصناف کو برتا ہے۔

میر ہاشم بھی ابتداء میں ترقی پسند رہے اور ایک عرصہ تک اس کے زلف کے اسیر رہے۔''بھٹک گیا انقلاب یارو'' کا نعرہ لگانے والے مراٹھواڑہ کے پہلے شاعر ہیں۔

وحید اختر مراٹھواڑہ میں جدید غزل کے اہم نمائندہ ہیں۔اور ان کے ہم عصر شعراء میں احسن یوسف زئی،محمود عشقی اور عروج احمد بھی اپنی غزل میں ندرت خیال اور عزت اظہار کی خوبصورت مثالوں کے طور پر سامنے آتے ہیں۔اور اسی دہائی میں اختر الزماں ناصر اور سکندر علی وجد جو آزادی سے قبل ہی بحیثیت شاعر اپنے آپ کو منوا چکے تھے۔کلاسیکی غزل کی شمع جلائے نظر آتے ہیں۔ساٹھ کی دہائی میں منظر عام پر آنے والے نئے لکھنے والوں میں جے پی سعید،مقتدر نجم اور ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ بھی ان دونوں کے ہمراہ کلاسیکی غزل کے قافلے میں شامل نظر آتے ہیں۔

بشر نواز کی غزل روایت کے وقار اور جدت کے اعتبار کی جاندار علامت ہے۔یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا وہ مراٹھواڑہ کی غزل کے اہم نمائندہ ہیں۔غزل اور نظم دونوں میں انھیں یکساں مہارت حاصل ہے۔کمیونسٹ پارٹی سے عملاً وابستگی کے باوجود انھوں نے ترقی پسند تحریک کے اثر سے اپنے شعروادب کو پاک رکھا۔بشر نواز کی غزل ہی موجودہ نسل تک شعروادب پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

آتے ہیں غول غول سلگتے ہوئے خیال
ہم ہی اسیر لذت طرز ادا کے ہیں

بشر نواز کے جغرافیائی اعتبار سے مراٹھواڑہ کی حد تک سمٹ دینا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ان کا شمار رجحان ساز شاعر ونقاد کا ہے۔ترقی پسند تحریک سے جدیدیت تک اور جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک بشر نواز نے تمام تحریکات کے عروج وزوال کا مشاہدہ کیا ہے۔اور وہ کسی بھی تحریک سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنی انفرادی شناخت بنائی۔

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے
رستوں کے سب نشان اڑا لے گئی ہے
عمر یوں گزری ہے جیسے سر سے
سنسناتا ہوا پتھر گزرے
آنکھ کے سچ کا یقیں کیجئے تو کیسے کیجئے
اپنی پرچھائیں خود اپنے سے بڑی دیکھتی ہے

بشر نواز کا رہنما صرف اور صرف ان کا یقین تھا اور ہم سفر ان کا ضمیر جو سائے کی مانند ان کے ساتھ تھا۔

مہتاب بکف رات کے ڈھونڈ رہی ہے
کچھ دور چلو آؤ ذرا تم بھی تو دیکھو

حمایت علی شاعر مراٹھواڑہ کی غزل کی ترقی پسند آواز ہیں۔بقول ڈاکٹر ارنگار افضل:-

''حمایت علی کے شعری سفر کی شناخت وہ مشترک ورثہ ہے جس نے پوری ایک نسل کے شعور کی تربیت کی اور جس کی جڑیں ہجرت کی زمین میں پیوست ہیں۔شاعر اسی نسل کے شعور اور کرب شعور کی نمائندگی کرتا ہے جس نے ایک زمین سے کٹ کر دوسری زمین سے درد کا رشتہ باندھا ہے اور جس کی اکائی ذوالارضی تجربہ سے تشکیل پائی۔''

(مراٹھواڑہ میں اردو غزل،از: ڈاکٹر سلیم محی الدین،ص۱۲۲)

اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک پوری نسل کے اجتماعی تاریخی تجربے اور تہذیبی شکست اور ریخت کی نمائندگی کرتی ہے۔اپنی زمین سے کٹ جانا اپنے

آپ میں ایک بڑا ذہنی نفسیاتی اورتہذیبی صدمہ ہے۔اس عمل کے دوران شاعر نے دراصل اپنے عہد کی ایک پوری نسل کو زندگی کرنے کے حوصلے سے نوازا ہے۔

اے رہ گزار سندھ، ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اس کی چاہ میں ارض دکن سے ہم

احسن یوسف زئی مراٹھورہ کے وہ شاعر ہیں جو پہلے تجربہ پسند اور تحریکی شاعر ہیں۔وہ جدیدیت کی تحریک سے وابستہ رہے۔فکر کی گہرائی اور اظہار کی سادگی کا ایسا انوکھا امتزاج اردو غزل میں شاید ہی کسی اور کے حصّے میں آیا ہو۔

اس کے چہرے کی دھنک جھوٹی ہوئی
جھیل کے پانی میں کنکر سچ ہوا
شب رنگ پرندے رگ در یشے میں اتر جائیں
کہسار اگر میری جگہ ہوں تو بکھر جائیں

میر ہاشم کی غزل وؔلی، سراؔج اور وجدؔ کی روایت کی توسیع بلکہ اضافہ ہے۔وہ اس سلسلے کی درمیانی اور اہم کڑی ہیں۔ان کا ذہنی تقلید سے انکار کرتا ہے اور اجتہاد کا قائل معلوم ہوتا ہے۔

کچھ اور تقاضے ہیں اب دست جنوں کے
کافی نہیں یہ جیب و گریبان گزشتہ

داخلیت اور خارجیت کا یہ خوبصورت امتزاج دراصل میر ہاشم کی شخصیت اور مزاج کے توازن باعث ہے۔عشق میر ہاشم کی غزل کا محور ہے۔ان کے پاس عشق کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ خوبصورت۔

ایک تم ہی نہیں سارا جہاں ہے میرا
اب مری ذات سے رشتہ ہی کہاں ہے میرا

آ گئی ساعت دیدار جمال محبوب
ابر کی اوٹ سے مہتاب چھلکتا ہے ابھی

قاضی غوث محی الدین صدیقی عرف جیلانی پاشا عرف جے۔پی۔سعید مراٹھواڑہ میں غزل کے حوالے سے اہم نام ہے۔وہ روایت پسندی اور کلاسیکیت کے پرستار ہیں۔

جدیدیت کا زمانہ ہے اے سعیدؔ مگر
ہے رنگ اوروں کا کچھ آپ کی صدا ہے الگ

بقول حمایت علی شاعر

’’جے پی سعید کی شاعری کا خمیر روایت سے اٹھا ہے۔وہ غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں غزل ان کے مزاج سے ہم آہنگ بھی ہے۔وہ زندگی جس قرینے سے گزار رہے ہیں غزل میں بھی وہی قرینہ برتتے دکھائی دیتے ہیں۔الفاظ کے دروبست سے لیکر مضامین غزل تک ان کی شاعری میں روایت کا فیضان جاری ہے۔‘‘

(مراٹھواڑہ میں اردو غزل،از: ڈاکٹر سلیم محی الدین،صفحہ ۱۵۷)

ان کے بعد ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کا اسم گرامی آتا ہے۔جو ایک نقاد اور ماہر لسانیات کے کافی مشہور و مقبول ہیں۔لیکن ان کے اندر ایک اچھا شاعر بھی موجود تھا۔انہیں کئی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔’’اکیلا درخت‘‘ ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ان کی غزلوں میں واردات قلبی اور عصری احساسات کا حسین امتزاج پایا جاتا

ISBN: 978-93-344-4743-9

ہے۔وہ کہتے ہیں۔

راز دل کھل کر سنانے سے جو خوف آنے لگا
چھوڑ کر اصناف دگر ہم غزل کہنے لگے

تم کو ہوجائے اگر عشق تو مجبوری ہے
شوق سے اپنے مگر روگ یہ پالا نہ کرو

ڈاکٹرعصمت جاوید کی غزل کا انداز واسلوب روایتی ہے لیکن موضوعات عصری ہیں۔ ہمہ گیر موضوعات کا احاطہ ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔

تم مجھ کو قتل نہ کر سکو گے یہ سوچ لو
لوگو صدائے حق ہے، سردار میں نہیں
شیشے کا سارا شہر تھا کتنا شکستنی
لیکن میں احتجاج کا پتھر نہ بن سکا

درمیان میں اور بہت سارے شعراء مطلع غزل کے افق پر نمودار ہوتے ہیں اور اپنے حصے کا کام کر کے رخصت ہوجاتے ہیں۔ ان میں عبدالرؤف عروج، مقتدر نجم، عروج احمد عروج وغیرہ اپنی اپنی شناخت بنا کر غزل کے گیسو سنوارنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

عرفان پربھنوی کی شکل میں کلاسیکی اقدار کے حامل اپنے عہد کے مزاج داں، اپنے عہد کی روایت کا عکس ہمیں ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ بقول بشر نواز

''ان کے یہاں غزل گوئی کی فنی روایت کو بحسن وخوبی برتنے کا خاص التزام ملتا ہے۔ چھوٹی بحریں بڑی بات کہنا عرفان صاحب کا ہی حق ہے۔''

(مراٹھواڑہ میں اردو غزل، از: ڈاکٹر سلیم محی الدین، صفحہ ۱۶۶)

سادگی اور پرکاری ان کے غزل کا خاصہ ہے۔ انسانی زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے حادثات، تجربات اور واقعات کو نہایت سادگی اور سلاست کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔

گھر کا بٹوارہ کیا ہوگیا
ہر خوشی در بدر ہوگئی
اور تو کوئی مل نہ سکا
مفلسی ہمسفر ہوگئی

نیزان کے کلام میں زندگی کا گہرا فلسفہ بھی ملتا ہے۔

حرف حق کہئے مگر یوں کہ ہو امرت جیسے
اپنے شکوے کا بھی معیار نہ گرنے پائے

زمانے کے تغیر اقدار میں انقلابی تبدیلی اور جہاں صرف سنبھل سنبھل کر ہی چلنے میں عافیت ہے۔ اس کا احساس ان کی غزل میں ہوتا ہے۔

وہ زمانے تھے الگ قدر تھی سچ کی جن میں
آج سچ کہنے میں رسوائی ہی رسوائی ہے

ستر کی دہائی کے آتے آتے اردو غزل کی دنیا ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں سب کچھ بدلا ہوا ہے۔ دنیائے غزل نئے نئے رنگ وآہنگ سے واقف ہوتی ہے۔ جہاں تک مراٹھواڑہ کا تعلق ہے، ستر کی دہائی کی غزل قمر اقبال سے منسوب ہے۔ ولی، سراج، وجد اور بشر نواز کے بعد غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ایک

ISBN: 978-93-344-4743-9

ایسا نام ہمارے ادب کے افق پر طلوع ہوتا ہے جو قمر اقبال کے نام سے جانا ہے۔ روایت پسندی کے ساتھ نئی جہت کی تلاش میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

قمر اقبال کو اردو شاعری میں استاذی کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ جن میں فاروق شمیم، قمر اعجاز، رزاق رہبر، شیام کمار ندیم، وحید کلیم، وارث عادل، جاوید امان، شمیم جوہر، انور رفیق اور سلیم محی الدین کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے دو شعری مجموعہ ''تتلیاں'' اور ''موم کا شہر'' ہیں۔

قمر اقبال جدیدیت کے قائل ہیں لیکن تقلیدی جدیدیت کے نہیں بلکہ تخلیقی جدیدیت کے حامی ہیں۔

ہم کو لوٹا دے ہمارا وہ پرانا چہرہ
زندگی تیرے لیئے روپ کہاں تک دھاریں

ملی ہے راہ میں اس طرح زندگی ہم سے
اڑا کے گرد جیسے کوئی شہسوار گیا

قمر اقبال نے زندگی کو ہر رنگ سے جانا، بوجھا اور برتا ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ ایک حساس فنکار ہیں۔

احساس کا یہ کرب نہ بینائی چھین لے
آنکھوں پہ مری قرض کئی منظروں کا ہے

سیاسی وسماجی عدم مساوات کی وجہ سے معاشرہ میں فساد برپا ہوتا ہے اور جسکے نتیجے میں تعصب کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور تعصب کا احساس بھی ان کے کلام میں جھلکتا ہے۔

وگھروں میں آسکیں مکتب سے بچے
کم از کم شہر میں تب تک اماں رکھ

بجھاتے کیوں ہو جلتی مشعلوں کو
ابھی بستی میں اک گھر رہ گیا ہے

بہر حال انھیں اس بات کا احساس اور افسوس رہا ہے کہ انھیں ان کے شایانِ شان قدر نہیں کی گئی، وہ خود کہتے ہیں۔

غزل کو اک نیا لہجہ دیا ہے
غزل نے مجھ کو لیکن کیا دیا ہے

بہر حال ایک طویل سلسلہ ہے مراٹھواڑہ میں اردو غزل کو آزادی کے بعد نشو ونما دینے میں اسے نیا لب لہجہ، رنگ آہنگ میں اسلوب عطا کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہیں جن میں قابل ذکر رؤف انجم، شاہ حسن نہری، سحر سعیدی، اسلم مرزا، صغیر کوثر، یوسف عثمانی، یونس فہمی، سہیل احمد رضوی، رئیس احمد خان شاکر، جاوید ناصر، عتیق اللہ صادق، فہیم احمد صدیقی، عارف خورشید، رؤف صادق، عبدالرحیم کوثر، عظیم الدین ساحل کلمنوری، فاروق شمیم وحید کلیم، سجاد اختر، فیروز رشید، جاوید امان، شمیم جوہر، سلیم محی الدین وغیرہ،

مراٹھواڑہ میں اردو غزل کی اپنی روایت رہی ہے جو اردو شعر وادب کی دیرینہ روایتوں میں سے ایک اور جس کے آغاز کے نشانات سولھویں صدی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مراٹھواڑہ کی جدید ترین روایت میں تسلسل اور ارتقاء کا عمل بتدریج جاری ہے۔ اور مزید ترقی وتوسیع کے امکانات روشن وتابناک ہیں۔ بقول ولی اورنگ آبادی۔

راہِ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن

☆☆☆

پروین شاکر کی شاعری: ایک تنقیدی جائزہ

قاضی واسعہ تقویم قاضی مخدوم
اسٹنٹ ٹیچر ملیہ گرلز ہائی اسکول بیڑ

ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے جب کاغذ کی مہک نشہ بن کر اہل علم کے تسکین کا سامان بنا کرتی تھی۔ صفحات کے کونے جا بجا مڑے ہوئے پائے جاتے تھے۔ گھر کی بیٹھکوں میں چائے کے دور کے ساتھ ننھی منی شعری محفلیں سجا کرتی تھیں، سوکھے گلاب' مور کے پنکھ نشانیاں بن کر اچانک کسی کتاب سے گود میں آ گرتے تھے۔ کتابیں صرف شیلف میں نہیں بلکہ تپائی پر بھی دھری ہوئی پائی جاتی تھی۔

نوجوانوں کے پاس سے ابن صفی اور لڑکیوں کے تکیوں کے نیچے سے پروین شاکر کی ''خوشبو' برآمد ہوا کرتی تھی۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح مری پذیرائی کی

پروین شاکر اردو شاعری کا وہ نام' وہ آواز' وہ لہجہ' وہ پکار' جس نے غزل کی سرگوشیوں، نظموں کی گنگناہٹوں' نسوانیت کے اظہار کو ایک دائرہ کی قید سے نکال کر انسانی کائنات کی طرح وسیع کر دیا۔

محض ۲۵ سال کی عمر میں جب کہ قلم کا را بھی نو آموز ہی سمجھا جاتا ہے پروین کے پہلے مجموعہ کلام ''خوشبو' نے اردو شاعری کے در و بام پر کچھ اتنی زوردار دستک دی کہ قدیم روایتوں کے بے شمار بت پاش پاش کر دیے۔ عہد آفریں کی ایک ایسی چونکا دینے والی نسوانی آواز گونجی جس نے اردو شاعری کے افق پر ہلچل مچادی۔

تیری خوشبو کا پتہ کرتی ہے
مجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے
دل کو اس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے
زندگی میری تھی لیکن اب تو
تیرے کہنے میں رہا کرتی ہے

پروین شاکر ایک ایسا نام جس نے اپنے ہر احساس کا باوقار اظہار کیا۔ ان کی شاعری نہ تو آہ و زاری والی روایتی عشقیہ شاعری ہے، نہ غم و یاسیت کا نام ہے۔ جذبہ و احساس کی شدت کو غنائیت کے ملبوس میں اجاگر کرنے کا نام پروین شاکر ہے۔ قیامت کے دن حضرت محمدؐ کی شفاعت کے یقین کا تذکرہ ان کے قلم میں ملاحظہ ہو۔

سنا ہے جب سے شفاعت کو آپ آئینگے
تو جیسے بوجھ سا اک ہٹ گیا ہے سینوں سے

ان کی شاعری ہجر و وصال کی کشاکش کی شاعری ہے۔ جس میں نہ ہجر مکمل ہے نہ وصل۔ جذبہ کی صداقت، رکھ رکھاؤ کی نفاست اور لفظیات کی لطافت کے ساتھ انہوں نے اردو کی نسائی شاعری میں اک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

بقول گوپی چند نارنگ ''نئی شاعری کا منظر نامہ پروین شاکر کے دستخط کے بغیر نامکمل ہے۔''

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
میں تو اس دن سے ہراساں ہوں کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی

پروین شاکر اپنے شروعاتی دور میں ہی مقبولیت کی انتہا کو چھو چکی تھی پہلے ہی مجموعہ کلام محض ۲۵ سال کی عمر میں ہر سب سے بڑا آدم جی ایوارڈ تفویض ہونا ان کے معراج فن کی دلیل ہے۔۹ سال کالج میں لیکچرر شپ کی۔ہارورڈ یونیورسٹی سے M.A کیا پھر سول امتحان کامیاب کر کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر تعینات ہوئی۔ لیکن ان تمام جد وجہد بھری مصروفیات کے باجود بھی قلم کا دامن نہیں چھوڑا۔

انہوں نے اپنے اشعار کی ایسی کہکشاں سجائی جسکا جھرمٹ دور ہی سے ان کی انفرادیت ظاہر کر دیتا تھا۔لڑکیوں کے نازک احساسات، سہمے ہوئے خواب، روندی ہوئی خواہشیں، کچلے ہوئے جذبات جس کا اظہار لڑکیاں خواب میں بھی کرتے ہوئے جھجکتی ہے پروین کا قلم ان تمام پلکوں سے نوچے ہوئے احساسات کو جرات کے ساتھ سپرد قلم کر دیتا ہے۔

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہیے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتی
بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے
انگلیوں کو تراش دیں پھر بھی
عادتاً اس کا نام لکھیں گی
تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر
وہ کہیں پر بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی
کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

پروین شاکر نے نظمیں بھی خوب کہیں ہیں جن میں ان کی طلسم کاری نے اردو شاعری کو سچے جذبوں کی قوس وقزح کی بارشوں میں نہلایا ہے۔ان کی شاعری میں صرف جذبوں کا اظہار ہی نہیں ہے نئی نسل، کچے عمر کی خواب دیکھنے والی لڑکیوں کو ایک شعوری پیغام دینے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔محتاط پیغام، ایک تنبیہ، ایک مشورہ نظموں میں غزلوں میں سرگوشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مشورہ:
ننھی لڑکی
ساحل کے اتنے نزدیک
ریت سے اپنے گھر نہ بنا

کوئی سرکش موج ادھر آئی تو
تیرے گھر کی بنیادیں تک بہہ جائیں گی
اور پھر ان کی یاد میں تو
ساری عمر اداس رہے گی

پروین شاکر کی شاعری کو لوگ ان کی آپ بیتی بھی قرار دیتے ہیں۔ان کی پر تنازعہ داخلی زندگی نے ان کی شخصیت کو جھنجھوڑ کر رکھدیا تھا۔پسندیدہ شخص سے شادی ہونے کے باوجود ان کی زندگی میں اک ایسا موڑ جہاں دونوں کے راستہ علیحدہ ہوگئے۔وہ زخم خوردہ ہوگئی اور یہی اذیت کا احساس ان کی شاعری کو اندرونی کیفیت کا عکاس بنا گیا۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اس نے گھر کا دروازہ کیا
وہ مجھ کو چھوڑ کر جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

''خوشبو'' کے ذریعے اردو شاعری کے ایوان میں داخل ہونے والی پروین شاکر ۲۶ر ڈسمبر۱۹۹۴ء میں سڑک حادثے کا شکار ہوکر اپنی خوشبو کو پذیرائی سونپ کر ہواؤں میں بکھر گئی۔

خوابوں میں ملوں گی نہ خیالوں میں ملوں گی
میں تم کو محبت کے حوالوں میں ملوں گی
کیوں ڈھونڈتے رہتے ہو مجھے اہل زمیں پہ
میں عکس ہوں اور چاند کے بالوں میں ملوں گی
وعدہ ہے مرا مجھ کو قضالے بھی گئی تو
پاکیزہ محبت کے حوالوں میں ملوں گی

احمد ندیم قاسمی سے شرف تلمذ حاصل کرنے والی شاعرہ کے تعلق سے احمد ندیم رقمطراز ہیکہ

''پروین شاکر ایسی سچی اور کھری لڑکی ہے جس نے جو سوچا جو محسوس کیا بلا جھجھک کہہ ڈالا۔نہ خود کو دھوکا دیا نہ اپنے پڑھنے والوں کو۔''

شاعری کے ۱۸ سالہ سفر میں ان کے چار مجموعے ''خوشبو' صد برگ' خود کلامی' اور انکار شائع ہوئے۔اور بے شمار ایوارڈس سے نوازی گئی۔

مر بھی جاؤں تو کہا لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

☆☆☆

اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک

ڈاکٹر نشاط نائرہ شیخ حبیب
اسسٹنٹ پروفیسر چشتیہ کالج آف خلد آباد، مہاراشٹرا

ایہام سے مراد یہ ہے کہ شاعر پورے شعر یا اس کے جزو سے دو معنی پیدا کرتا ہے۔ یعنی شعر میں ایسے ذومعنی لفظ کا استعمال جس کے دو معنی ہوں۔ ایک قریب کے دوسرے بعید کے اور شاعر کی مراد معنی بعید سے ہو ایہام کہلاتا ہے۔ بعض ناقدین نے ایہام کا رشتہ سنسکرت کے سلیش سے بھی جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ سلیش میں ایک ایک شعر کے تین تین چار چار معنی ہوتے ہیں جب کہ ایہام میں ایسا نہیں ہوتا۔

اردو شاعری میں ایہام گوئی

ولی دکنی کا دیوان 1720ء میں دہلی پہنچا تو دیوان کو اردو میں دیکھ کر یہاں کے شعراء کے دلوں میں جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا اور پھر ہر طرف اردو شاعری اور مشاعروں کی دھوم مچ گئی۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ولی کے تتبع میں شمالی ہند میں جو شاعری شروع ہوئی اس میں سب سے نمایاں عنصر ''ایہام گوئی'' تھا۔ اس لیے اس دور کے شعراء ایہام گو کہلائے۔ اس دور کی شاعری میں ایہام کو اس قدر فروغ کیوں حاصل ہوا۔ آیئے ان اسباب کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسباب:

ایہام گوئی کے بارے میں رام بابو سکسینہ اور محمد حسین آزاد دونوں کا خیال ہے کہ اردو کی ابتداء شاعری میں ایہام گوئی کے رجحان کا ایک اہم سبب ہندی دوہوں کا اثر ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے نزدیک اس زمانے میں فارسی شعرائکا دربار اور شعر وادب کی محفلوں میں بہت اثر تھا۔ یوں بھی ادب میں دہلی والے فارسی روایات برتتے تھے۔ اس لیے یہ بہت ممکن ہے کہ متاخرین شعرائے فارسی کے واسطے یہ چیز عام ہوئی ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ ایک سبب ایہام گوئی کا ہندی دوہے ہیں اور دوسرا سبب متاخرین شعرائے فارسی سے متاثر ہو کر اس دور کے شعراء نے اپنی شاعری کی بنیاد ایہام پر رکھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک ہر بڑے شاعر کی طرح دیوان ولی میں بھی بہت رنگ موجود تھے۔ خود ولی کے کلام میں ایہام گوئی کا رنگ موجود ہے۔ اگر چہ ولی کے ہاں یہ رنگ سخن بہت نمایاں نہیں لیکن ہر شاعر نے اپنی پسند کے مطابق ولی کی شاعری سے اپنا محبوب رنگ چنا۔ آبرو، مضمون، ناجی اور حاتم ولی کے ایہام کے رنگ کو چنا۔ یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں ایہام کی ایک بڑی وجہ ولی کے کلام میں موجود ایہام گوئی کا رنگ بھی تھا۔

ان تین اسباب کے علاوہ ایہام گوئی کے رجحان کا ایک اور اہم سبب محمد شاہی عہد کے درباری اور مجلسی زندگی تھی۔ یہ دور برصغیر کا نہایت بحرانی دور رہا۔ محمد شاہ گو بادشاہ تو بن گیا تھا لیکن اس میں وہ صلاحیتیں موجود نہ تھیں جو گرتی ہوئی حکومت کو سنبھال سکتیں۔ یوں اس نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے عیش و عشرت اور رقص و سرور کا سہارا لیا۔ یوں طوائفوں اور بھانڈوں کی محفلیں جمنے لگیں۔ اس قسم کی مجلسی فضا میں جہاں حسن و عشق کا تصور انفرادی کے بجائے اجتماعی جذبے کی صورت اختیار کر لے تو پھر اس کے اظہار کے لیے ایسے پیرائے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ایہام، رعایت لفظی، ذومعنی اور پہلو دار معنی، ضلع جگت، چٹکلے اور پھبتیاں وغیرہ ایسی محفلوں میں سب کو مزا دینے لگیں۔ یوں اس دور کے تہذیبی موسم اور معاشرتی زمین ایہام گوئی کے پھلنے پھولنے کے لیے نہایت مناسب تھی۔

مختصراً ان اسباب کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ہندی دوہوں کا اثر، فارسی کے شعرائے متاخرین کی روایت دیوان ولی میں ایہام گوئی کے رنگ کی موجودگی اور محمد شاہی عہد کی مجلسی اور تہذیبی زندگی ایہام گوئی کے رجحانات کے عام کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔

ایہام گو شعراء

ایہام گوئی کے سلسلے میں آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، فائز اور حاتم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شاہ مبارک آبرو گوالیار کے مضافات میں 1095ھ کو پیدا ہوئے۔ عالم شباب میں دلی آئے۔ شاہی ملازمت سے وابستہ رہے مگر عہد محمد شاہی میں سب کچھ

ISBN: 978-93-344-4743-9

چھوڑ چھاڑ کر قلندری اور درویشی اختیار کر لی۔ ان کی ابتدائی شاعری محمد شاہی دور کی آئینہ دار ہے۔ چونکہ مزاجاً وہ حسن پرست تھے۔ لہٰذا خوبصورت چیزوں سے انہیں دلچسپی تھی۔ ایہام گوئی کے باوجود ان کی شاعری میں خلوص، سچائی اور سادگی سے اظہار جذبات کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ فارسی شاعری کے اثرات بھی نمایاں محسوس ہوتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ہندی کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں ان کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا
بوسہ لبوں کا دینے کہا کہہ کے پھر گیا
پیلا بھرا شراب کا افسوس گر گیا!

شاکر ناجی

محمد شاکر نام ناجی تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے۔ طبیعت میں سنجیدگی اور مزاح کا خوبصورت امتزاج تھا۔ دوسروں کو خوب ہنساتے مگر مطلق نہ ہنستے تھے۔ کبھی کبھار مسکراتے تھے۔ ان کا دیوان ناپید ہے آبرو کے ہمعصر تھے۔ ایہام گوئی میں نمایاں ہوئے۔

ترے رخسار کے پرتو سے اے شوخ
پری خانہ ہوا گھر آرسی کا
خط کی خبریں عبث اڑائی ہیں
باتیاں اس کی سب ہوائی ہیں

شرف الدین مضمون

اکبر آباد کے قریب ایک قصبے میں پیدا ہوئے ابتدائے جوانی میں دہلی آئے۔ ابتداء میں سپاہ گری کے پیشے کو اختیار کیا لیکن بعد میں دینوی علایق سے آزاد ہو کر درویشی اختیار کر لی۔ ماحول اور زمانے کی عام روش کے مطابق ایہام گوئی میں بھی دلچسپی لیتے تھے میر تقی میر کے خیال میں ان کے اشعار کی تعداد دو سو بنتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

ہم نے کیا کیا نہ ترے ہجر میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریہ یعقوب کیا
کوئی اس جنس کا دہلی میں خریدار نہیں
دل تو حاضر ہے ولیکن کہیں دلدار نہیں

مصطفیٰ خان یک رنگ

دہلی کے رہنے والے تھے۔ بڑے ہنس مکھ، زندہ دل، رنگین مزاج اور خوش مزاج تھے۔ شاعری کی اصلاح خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں سے لیتے تھے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ پانچ سو کے قریب اشعاری تعداد بتائی جاتی ہے۔ رواج عام کے مطابق ایہام گوئی کرتے تھے مگر اس کے باجود سادگی اور جذبات نگاری کا وصف ان کے ہاں ملتا ہے۔

ہاتھ اُٹھا جور جفا سے تیرا
یہی گویا سلام ہے تیرا
پارسائی اور جوانی کیونکر ہو
اک جاگہ آگ اور پانی کیونکر ہو

شاہ حاتم

 ISBN: 978-93-344-4743-9

شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ اور شاہ محمد امین کے مرید تھے۔ کچھ عرصہ الہ آباد کے صوبے دار نواب امیر خاں کی رفاقت میں رہے۔ اس کے بعد ہدایت علی خاں، مراد علی خاں، فاخر علی خاں، جیسے امرا بھی ان کی مدد کرتے رہے۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مرزا صائب اور ریختے میں ولی دکنی کو استاد مانتے تھے۔ رفتہ رفتہ ریختے میں وہ خود استاد ہو گئے۔ سودا ان ہی کے شاگرد تھے۔ اصلاح زبان کا کام سب سے پہلے ان ہی نے شروع کیا۔ بہت سے نامانوس الفاظ ترک کر کے فصیح الفاظ داخل کیے۔ دہلی میں وفات پائی اور دلی دروازے کے باہر دفن ہوئے۔ تصانیف میں ایک دیوان فارسی ہے۔ اردو میں ایک ضخیم دیوان جمع کر لیا تھا آخر عمر میں اس سے ایک چھوٹا دیوان تصنیف کیا اور دیوان زادہ اس کا نام رکھا۔ حقے پر ایک مثنوی محمد شاہ بادشاہ کی فرمائش پر لکھی۔ ایک دیوان قدیم رنگ میں تھا جو نادر شاہ کی تاخت و تاراج میں ضائع ہو گیا۔

اے قدرداں کمال حاتم دیکھ

عاشق و شاعر و سپاہی ہے

کئی دیوان کہہ چکا حاتم

اب تلک پر زباں نہیں درست

اردو شاعری پر اثرات

ایہام گوئی کی بدولت شاعری پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثرات پڑے۔ ایہام گویوں کی کوشش سے سینکڑوں ہندی اور مقامی الفاظ اس طور سے استعمال ہوئے کہ اردو زبان کا جزو بن گے۔ نہ صرف الفاظ بلکہ ہندی شاعری کے مضامین، خیالات اور اس کے امکانات بھی اردو شاعری کے تصرف میں آ گئے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ایہام گوئی کے رجحان سے جہاں اردو زبان پر مثبت اثرات مرتب ہوئے اس کے کچھ منفی اثرات بھی ظاہر ہوئے۔

جب ایک مخصوص فضا میں ایہام کا رواج ہوا جہاں الفاظ کی بازیگری کو استادی سمجھا جانے لگا تو شاعری صرف الفاظ کے گورکھ دھندے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ لفظ تازہ کی تلاش میں متبذل اور بازاری مضامین بھی شاعری میں گھس آئے۔ نیز جب شاعر لفظوں کو ایہام کی گرفت میں لانے کی کوشش میں مصروف رہے تو پھر شاعری جذبہ و احساس سے کٹ کر پھیکی اور بے مزہ ہو جاتی ہے اور یہی حال اس دور میں شاعری کا ہوا۔

ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل

ایہام گو شعراء کے بعد جو نیا دور شروع ہوا اس میں مظہر، یقین، سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے ایہام کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ اس دور میں ان لوگوں نے ایہام گوئی کی بندشوں کو شدت سے محسوس کیا ان کے سبب خیالات کے اظہار میں رکاوٹ آ جاتی تھی۔ یوں ایہام گوئی میں زیادہ شعر کہنا مشکل تھا۔ لیکن ایہام گوئی ترک کرنے کے بعد شعراء کے دیوان خاصے ضخیم ہونے لگے۔ شعراء کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ اس نے دور میں ایہام گوئی کے خلاف اس قدر احتجاج کیا گیا کہ شاہ حاتم جو ایہام گو شاعر تھے انہوں نے اس روش کو ترک کر دیا اور اپنے دیوان سے ایہام کے شعر نکال دیے۔

☆☆☆

 ISBN: 978-93-344-4743-9

قمر اقبال کی شاعری کے چند نمایاں گوشے

ڈاکٹر قاضی عرشیہ جبین قاضی مخدوم
لیکچرار ملیہ آرٹس سائنس اینڈ مینجمنٹ سائنس کالج بیڑ CHB

سرزمین دکن فخر کرتی ہے اپنے چمن کے ان مرغزاروں پر جہاں سنتوں نے ایکتا کی راگنی چھیڑی، اہل تصوف نے وحدت وامن وآشتی کی چاشنی بکھیری۔ یہ ان وادیوں کے تقدس کا اعجاز ہی تھا کہ زبان اردو اپنی تمام تر سحر بیانی کے ہمراہ ولؔی اور سراؔج کے ذریعے دکن کے آنگن میں جلوہ افروز ہوئی۔ کیا ہی خوب لاڈ اٹھوائے اس نے کہ ایک شاعر کی زبانی معترف ہوئی کہ

دکن کے ولی نے مجھے گودی میں کھلایا

بلاشبہ اہل دکن نے شیریں اردو کو سرآنکھوں پر بٹھایا۔ اس کے گیسوؤں کو سنوارنے کے لئے ایسے گوہر نایاب پیدا کیے جنہوں نے اس کے جمال میں روز افزوں اضافہ کیا۔ ایسے ہی ایک فرزندِ دکن قمر اقبال ہیں۔ جس نے اردو غزل؛ اس دلربا کی دلربائی، دلکشی، رنگینی اور رعنائی میں ایک رومانویت پروس دی ہے۔

کہیں یہ درد کا دھاگا بھی یوں سلجھتا ہے
گرہ جو کھولیں تو دل اور بھی الجھتا ہے
وہ اک بات جو دل میں ہے میرے اس کے لیے
زباں سے کہتا نہیں وہ مگر سمجھتا ہے

قمر اقبال (اقبال محمد خان) ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر کے اردو شعر وادب کے وہ باکمال شاعر جن کے اشعار کی تمازت آج بھی قلب وجگر کو منور کرتی ہے۔ قمر اقبال ایک ایسے شاعر کہ جن کا لب ولہجہ آفرمنشیت کا ایک اسلوب متعین کرتا ہے۔ ان کے مصرعوں میں ایک زیرلب بلند آہنگی، ایک تہہ نشین گونج اور ایک مرعوب کن ڈرامائیت رینگتی رہتی ہے۔

قمر صدیقی قمر اقبال پر رقمطراز ہیں:

> قمر اقبال جتنا بلند مقام شاعر وفنکار ہے اس سے زیادہ حق پسند، حق گو اور متین وسلیم طبع انسان بھی ہے۔ ان کی طبیعت میں لاگ لپیٹ نہیں جس کا احساس ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی ملتا ہے اور تثلیث میں بھی۔ اور سچ نہ کہنے یا اظہار خیال کے لئے ڈھکے چھپے یا مصلحت آمیز راہوں کے اختیار کرنے کو جرم تصور کرتا ہے۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ حمایت علی شاعر نے تثلیث کا نام ثلاثی رکھ دیا اور اس صنف سخن پر کئی بحروں میں طبع آزمائی کی مگر قمر اقبال نے انہیں ان کے روبرو کہا کہ میں اس صنف سخن تثلیث ہی کے نام سے موسوم کرنا اور اسے ایک خاص بحر میں ہی کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ بات اس چیز کی دلیل ہے کہ قمر اقبال جو ایک شیریں ونرم لب ہے وہ اپنی بات مخصوص لب ولہجہ و بحر کا پابندہ کر بھی پوری کرے کی قدرت رکھتا ہے............'' (۵۸)

قمر اقبال اورنگ آباد کے مشہور اردو روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز میں مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دی۔ اورنگ آباد ٹائمز میں عزیز خسرو کے معاون مدیر کی حیثیت سے انہوں نے اخبار کی مقبولیت کو آسمان پر پہنچادیا۔ 'بات سے بات' اور 'بال کی کھال' آپ کے ذریعہ لکھے جانے والے مقبول ترین کالم تھے۔ آپ کے ذریعے ترتیب دیا جانے والا ادبی صفحہ ہر اعتبار سے ایک مکمل اور علم وفن سے مزین ادبی صفحہ سمجھا جاتا تھا۔ 'علامہ گمنام' بھی آپ کا تخلص تخلص تھا لیکن صرف ہزلیات کے لئے۔ آپ کی تثلیثات، غزلیات، ہزلیات نے قارئین کو اخبار سے جوڑے رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بلکہ اورنگ آباد اور اطراف کے اضلاع میں ادب وشعر شاعری کے فروغ میں قمر اقبال کے صفحے نے زبردست خدمات انجام دیں ۔

پتھر کو گہر، جھوٹ کوچ، شب کو کرن بول
اس دور میں جینا ہے جینے کو بھی فن بول

انہوں نے اپنے دوران صحافت مراٹھواڑہ میں ایک نسل کی آبیاری کی اوران کے زیر تربیت کئی نامور، جدید شعرا نے مقام پیدا کیا۔قمر اقبال ایک زندہ دل شخص تھے جنہوں نے تثلیثات اور اپنے سلگتے اشعار کے ذریعہ اردو دنیا میں ایک الگ مقام بنایا۔ان کے اشعار اور سلگتی ہوئی تثلیثات جدید موضوعات پر عام انسان کے ذاتی کرب اور یاسیت سے لبریز دکھائی دیتی ہے۔ان کی شاعری ان کی حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتی تھی۔ان کا مشہور شعر ہے ؎

اپنے ہی نگر کی گلیوں میں جب غیروں جیسا حال ہوا
اقبال محمد خاں سے کوئی اک روز قمر اقبال ہوا

اپنے شہر اورنگ آباد سے ہزار ہا شکایات ہونے کے باوجود انہیں اورنگ آباد دکن کی سرمین سے بے انتہا پیار تھا جس کا اظہار وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں ؎

اک دن بھی قمر تجھ سے الگ رہ نہیں سکتا
ہے کتنی کشش تجھ میں اے خاک دکن بول

قمر اقبال کے تخیل کی پرواز بہت ہی بلند ہے اور ان کا تصوراتی ذہن بت میں خدا تلاش لیتا ہے۔وہ موضوعات کے دھنی شاعر ہیں۔وہ پرانے موضوعات کو نئے پیکر و نئے اسلوب میں ڈھال دیتے ہیں اور قمر اقبال ایک ایسا شاعر بن کے ابھرتا جو پرانے پژمردہ خیالات کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ندرت احساس کی شدت ہر شعر ممیں ملتی ہے۔قمر اقبال جب موضوعات کو برتنے میں وہ شاعری میں لفظوں کے جادوگر بن جاتے ہیں۔مثلاً

لمس اس ہاتھ کا بچوں کی ہنسی ماں کی دعا
یہ جو تحفے ہیں فقط گھر سے ملا کرتے ہیں

قمر اقبال کی شاعری کے نمایاں گوشوں کا اجمائی جائزہ لینے پر یہ بات کھلنے لگتی ہے کہ شاعر نے نو عمری ہی سے انسانی کرب کا مزہ چکھ لیا ہے۔نو عمری ہی میں عشق و عاشقی کی رنگین حکایتیں چھوڑ کر زندگی کی تلخیوں کو اجاگر کرنے لگتے ہیں کہ:

زندگی تونے ہمیں لاکے کہاں چھوڑا ہے
مرنے والے ہیں بہت، زہر مگر تھوڑا ہے
بیوی کے کان میں وہی پیتل کی بالیاں
بوڑھا وہ شخص ہوگیا سونے کی کان میں

وہ بڑے خوددار شاعر ہیں۔وہ فن کی بنیادوں پر قدر دانی کے قائل ہیں۔وہ چاپلوسی، منت سماجت کے دور ہیں وہ چاہتے ہیں راست کلام کیا جائے۔اسی لئے ان کا لہجہ بے باک ہے۔تصنع اور مکر وفریب دور ہے۔بالکل غیور طبیعت کے مالک اس شاعر کے کلام میں مدمقابل سے لا پرواہی، اپنی ذات کا احساس زیاں، خودی میں رچی بسی زندگی کی منظر کشی ہے۔وہ اپنے مزاج خودداری کا اس طرح اظہار کرتے ہیں ؎

میں چاہتا تو کرن کوئی مانگ سکتا تھا
مرے قریب سے سورج کئی نکل کے گئے
خود کو دانستہ کڑی وہ دھوپ میں بھٹکایا ہے
ہم نے اس سایہ دیوار کو ترسایا ہے

وہ ہر منظر کو اپنے زاویے سے دیکھتے ہیں۔اس منظر میں زندگی کی کیفیات کو پیدا کرتے ہیں۔اپنے مزاج سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔اور وہ منظر قمر اقبال ویسے تو غم واضطراب کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے سنجیدہ غزلوں کے علاوہ جو ہزلیات لکھی ہیں۔ان سے ان کے مزاج چھپا ہوا اک من چلا اور خوش مزاج شخص بھی نظر آتا

ISBN: 978-93-344-4743-9

ہے۔ان کے اشعار میں زخموں کی سوزش ہے۔قمر اقبال اپنے ماضی اور حال دونوں سے شکوہ کرتے ہیں۔کہتے ہیں ؎

لاؤں ماضی کو گواہی کے لئے اب کیسے
آئینہ بھول گیا ہے مرا چہرہ شاید
زندگی روز ملی زہر بھرا جام لئے
روز جینے کی نئی راہ نکالی ہم نے

''قمر اقبال نے غزل کی صحتمند روایات کی بھر پور پاسداری کرتے ہوئے ہیئت اور موضوع کے ضمن میں بڑے یہ شگفتہ اور دلآویز تجربات کئے ہیں۔'موم کا شہر' کی کوئی سی ہی غزل لے لیجئے ،ہر جگہ آپ کو اظہار کی ندرت اور خیال کا اچھوتا پن ملے گا۔ایسا کم بہت کم ہوگا جہاں آپ کو قمر اقبال کے کلام میں متقدمین کے اشعار کی صدائے بازگشت سنائی دے۔ہر جگہ بات کہنے کا ان کا اپنا ہی نرالا مگر دل موہ لینے والا انداز نظر آئے گا۔ہر غزل میں آپ کو بھر پور تازگی کا احساس ہوگا۔قمر اقبال کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے خود کو گھسے پٹے قدیم طرز اظہار اور فرسودا ومضامین کی یلغار سے بچائے رکھا......اردو ادب کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ قمر اقبال نے اپنے فکر وطہار کی جدیدیت کے باجود خود کو اس قسم کی ادبی لغزشوں سے بچائے رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ہر خاص وعام میں اس قدر مقبولیت حاصل کر پایا۔ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے قمر اقبال نے بھی کیے ہیں لیکن انہیں دیکھ کر ذوق سلیم رکھنے والے کسی ادب دوست کے ماتھے پر کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی......''(۶۱)

قمر اقبال کو ان کے مزاج ،ان کے گرز زندگی اور خوبصورت اشعار کے سبب ہر خاص وعام سے اس قدر پزیرائی ملی کہ وہ پذیرائی نہ رہ الفت محبت تک جا پہنچی ہے۔اس ضمن میں قمر اقبال پر حمایت علی شاعر کے وہ چند جملے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن سے قمر اقبال کی شخصی اور شعری مقبولیت کا اندازآسانی کیا جاسکتا ہے۔ثلیثات (حمایت علی شاعر نے اسے 'ثلاثی' کے نام سے ہی پسند کیا ہے) کے موجد حمایت علی شاعر 'تتلیاں' پر بطور تبصرہ لکھتے ہیں:

''پاکستان میں جب اہل ادب مجھ سے پوچھیں گے کہ تم جدید تر دکن سے ہمارے لئے کیا لائے ہو؟......تو میں بڑی مسرت اور فخر کے ساتھ ان کی خدمت میں قمر اقبال کی 'تتلیاں' پیش کر دوں گا......قمر اقبال ثلاثی کہہ رہے ہوں کہ غزل ،ان کی شاعری میں یہ توازن موجود ہے۔وہ جدید شاعر ہونے کے باوجود روایت کی توانا لہروں کو اپنی باہوں میں لئے وقت کی منجدھار پر اپنا ادبی سفر طے کر رہے ہیں۔''(۶۲)

بے شک! قمر اقبال کی شاعری کے یہ چند نمایاں گوشے ان کی شاعری کی عظمت ،ندرت خیال اور فکر کی رنگینی اور کرب دونوں کی عکاس ہیں۔

☆☆☆

اُردوشاعری کے بدلتے رُجحانات (آزادی سے پہلے)

سعدیہ پروین نہال احمد
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو فارسی
ایم۔ایس۔جی۔آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج، مالیگاؤں کیمپ

خلاصہ: ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ قوموں کی بلندی وپستی کا راز تاریخی واقعات، مقامی تہوار وتقریب کی اہمیت، تہذیب، معاشرت، رسم ورواج، شکار کی معرکہ آرائی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اسی طرح سے سماجی، سیاسی، ادبی رجحانات اپنی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔اس مقالے میں آزادی سے پہلے کے اردو شاعری کے رجحانات کا مطالعہ وجائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اردوادب میں ہر دور میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ہر تبدیلی اپنے اندر نیا رجحان لے کر آئی۔اور اس رجحان کا اثر شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔چنانچہ اردو شاعری کا رجحان ابتداء ہی سے عاشقانہ رہا ہے۔اور اس کی وجہ اس دور کے حالات و ماحول ہیں۔اردو نے جب اپنی آنکھ کھولی تب فارسی ادب میں وارداتِ حسن وعشق موجود تھیں۔دل کھونا، آہیں بھرنا، ہجر میں آہیں بھرنا، مرنا جینا، کبھی کبھی مجاز سے حقیقت تک پہنچنا، حسن کی تعریف، اپنی ستم کشی پر ناز، قوت برداشت کا مظاہرہ بغرض یہ کہ عاشقی کے جملے لوازمات پر نظر پڑی۔

اردو جب ہندی شاعری سے ملی تب بھی یہی رجحان غالب نظر آتا ہے یہ چیزیں اس کثرت اور خوبیوں کے ساتھ سامنے آئیں کہ دوسرے کارآمد موضوعات پر بڑی دیر سے نظریں گئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ اردوشاعری نے بھی زبانِ عاشقی میں باتیں کرنا شروع کر دی۔

چنانچہ ولؔی کے وقت سے یا اس سے پہلے بھی دکن ہو یا شمال جہاں کہیں نظریں جاتی ہیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا سب سے پہلا رجحان دنیائے محبت یعنی عشق حقیقی یا عشق مجازی کی سیر کرنا تھا۔اور یہی لطف اندوزی کا ذریعہ بھی تھا۔اور اس رجحان کی نشوونما میں تقلیدی مادہ زیادہ کارفرما نظر آتا ہے۔البتہ ابتداء میں کچھ شعراء ایسے ضرور ملیں گے جن میں خاص طور سے دکن کے شعراء کے یہاں انفرادیت اور ماحول سے متاثر ہونے کے کافی ثبوت ملتے ہیں۔مثلاً کلیات قلی قطب شاہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سے قریب ۴۰۰ سال پہلے مختلف مقامی عنوانات وذاتی تاثرات پر طبع آزمائی کر کے شعراء نے نئے نئے راستے اردو شاعری میں پیدا کر دیئے تھے۔جن کے لئے آج دورِ حاضر بے چین ہے۔قلی قطب شاہ نے باغوں، پھلوں، محلوں، تہواروں اور معشوقوں کے نام بنام پر متعدد نظمیں لکھ کر ادب کو زندگی سے قریب لانے کی قابلِ قدر کوشش کی۔ایسے شعراء جو کچھ بیان کرتے ہیں اس میں اثر ورسوخ کا جذبہ ہوتا ہے۔ایسے شعراء محدود حد تک ہمارے ادب میں نظر آتے ہیں۔یہ رجحانات ہمارے ادب میں زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے کیونکہ اس وقت کے حالات نے کروٹ بدلی۔تاریخی، سماجی حالات کی وجہ سے قابلِ قدر رجحانات واضح ہوئے۔اس لئے میرؔ وسوداؔ کے عہد تک اور ان کے بعد آنے والی نسلوں نے جو کہ شمال اور جنوب (دکن) دونوں جگہوں پر ہر جگہ شعراء نے بیانیہ شاعری کو پیش کیا۔جس میں منظر نگاری، مقامی اثر، عوام کی زندگی، تبلیغی عنصر نجی حالات ملتے ہیں۔

میرؔ وسوداؔ کے کلام میں ہمیں اس دور کی زبوں حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔مثنوی ''گھر کا حال'' میں میرؔ نے اپنے گھر کی خستہ حالی کو بیان کیا سوداؔ نے ''شہر آشوب'' میں ہجوؤں میں اور کبھی کبھی قصائد میں بڑی تفصیل اور خوبی کیساتھ اپنے زمانے اور لوگوں کے حالات نظم کئے ہیں۔وہیں دکن کے شعراء نے لوگوں کے مذہبی رجحان کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے کلام کو مذہب کی اشاعت کا بھی ذریعہ بنایا۔نرم لب ولہجہ میں اصولِ دین، اس کے فوائد تحریر کرتے رہے۔میراجی نے اس موضوع کو اپنی مثنویوں میں جگہ بھی دی اس طرح شعراء کی نظم گوئی اور تنوع پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔مرثیہ خواں بھی اس زمانے میں مذہبی جوش وانہماک سے وجود میں آئے۔ادبی نقطہ اور اخلاقی نقطہ نظر سے بعض حصے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔کربلا کے واقعات کو بیان کرنا، مصیبتوں سے لوگوں کا دوچار ہونا، پریشانیوں میں دشمن سے مردانہ وار مقابلہ کرنا یہ تمام باتیں اس بات کی ضامن ہیں کہ غزل سے الگ ہو کر بھی لوگوں نے اپنے اپنے رجحانات کا پتہ دیا ہے۔اس طرح ابتداء میں ادبی رجحانات پر مذہب کا بھی غلبہ

صاف نظر آتا ہے۔ مذہب کے سلسلے میں تصوف کا ذخیرہ بھی اردو شاعری میں ہوا اور نتیجتاً عرصہ دراز تک لوگوں نے صوفیانہ شاعری پر طبع آزمائی کی۔ مذہبی جذبات کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ اردو شاعری میں نعتیہ کلام بھی رقم ہونے لگے اور کسی بھی صنف پر شاعری کرنے والے شعراء حمدِ خدا، نعتِ رسول، مدح آئمہ وہ بزرگان دین سے اپنے کلام کی ابتداء ضرور کرتے اور امیر مینائی کے عہد تک یہ رویہ جاری رہا۔

اردو شاعری کے رجحانات میں فارسی کا اثر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ عروض، خیالات، جذبات، طرز، غرض یہ کہ ہر بات میں اس کی تقلید اپنا فرض سمجھتی رہی اور اردو شاعری فارسی کے نقش قدم پر چلتی رہی۔ تقلید وترجمہ کے ذریعے بھی اردو ادب میں اضافہ ہوا۔ تقلید اور ترجمے کے ذریعے اردو ادب کو بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ یہ رجحان زندگی سے کچھ حد تک تعلق رکھتا تھا۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے باکمال شعراء نے ادب کو اپنے رجحانات کے دائرے تک محدود نہیں رکھنا چاہا۔ لیکن زمانے کی بدمذاقی اور غلامانہ ذہنیت کا علاج ہی کیا ہے۔

''ہر بوالہواس نے حسن پرستی شعار کی''

یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جب ذہنیت پست ہو جاتی ہے تو بجز کورانہ تقلید کے مشکل ہی سے کوئی نئی چیز بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح غزل وقصیدہ کا غلبہ پا جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اردو شاعری کی ابتداء ہندوستانی زوال کے شباب سے ہوتی ہے۔ سیاسی وہ اقتصادی حالات، بدامنی، فاقہ مستی اور سب سے بڑھ کر شیرازہ بندی کی کمی، غیر اعتمادی اور پست ہمتی کا ہر طرف زور۔ ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ بزدلی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں زمانہ چاہتا ہے کہ ہم جس حال میں ہیں اس کا کوئی جواز مل جائے۔ اس طرح غزل مع اپنے تصوف کی تسکین دینے کے لیے آگے بڑھی۔ غلط فہم کی قناعت، قسمت پر شاکر رہنا، اس طرح فرار پسند ذہنیت کو وجہ مل گئی۔ غزل نے بھی شعوری وغیر شعوری طور پر ماحول کی خستہ حالی کا خاکہ کبھی کبھی پیش کیا۔ اس طرح قسمت پر شاکر رہنے کے لیے آتش نے صوفیانہ انداز میں کہا۔

قسمت میں جو لکھا ہے وہ آئے گا آپ سے
پھیلایئے نہ ہاتھ نہ دامن پساریئے

بقول ذوق

احسان نا خدا کے اٹھائے میری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو چھوڑ دوں

اسی کے ساتھ اس دور کی شاعری میں جوش، خودداری اور ہمتِ مردانہ جیسے جذبات وخیالات کا ذکر بھی ملتا ہے۔

بقول آتش

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

اسی طرح سودا کے عہد تک شاعری کا رجحان حسن وعشق کے کارناموں کو تحریر کرنا تھا۔ جن میں جوش، خلوص، سادگی، تاثیر، سب کچھ تھا۔ غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، ہجو، شہر آشوب، واسوخت میں اس زمانے کے حالات، قوموں کی بلندی وپستی کا راز، تاریخی واقعات، مقامی تہوار وتقریب کی اہمیت، شکار کی معرکہ آرائی وغیرہ بھی نظموں میں رقم ہوتی رہی۔ سودا کی ہجو گوئی سے بڑے بڑے متقی اور پاکباز شعراء نے بھی دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ جن میں میر ضاحک، میر فاخر مکین بھی شامل تھے۔ اس شاعری سے ملتی جلتی ایک صنف جسے ریختی کہتے ہیں منظر عام پر آئی۔ اسکے موجد سعادت یار خاں رنگین مانے جاتے ہیں۔ ہجو اور ریختی دونوں کا وجود دربارداری سے ہوا۔ امراء کی خوشنودی اور اپنی برتری حاصل کرنے کے لئے شعراء اس قسم کی صنف کا استعمال کرتے تھے۔

آزادی سے پہلے قصیدہ گوئی کا خاص رجحان نظر آتا ہے۔ خاص طور سے فارسی کے بہترین قصیدہ گو شعراء کا تتبع باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ انہیں کے انداز بیان، شکوہ الفاظ، جوش، دقت پسندی، تشبیب میں وسیع النظری کو نصب العین مانا گیا۔ اس صنف شاعری میں سودا بلند پایہ حیثیت کے مالک تھے۔ آگے چل کر ذوق اور غالب نے بھی قصیدہ گوئی میں مقام حاصل کیا۔

ISBN: 978-93-344-4743-9

ولیؔ سے لے کر میر تک غزل میں قنوطیت نظر نہیں آتی لیکن میرؔ کے یہاں ذاتی پژمردگی کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔میرؔ،سوداؔ،دردؔ، غالبؔ نے لب ولہجہ کی بلندی، الفاظ کی تراش وخراش،اور خیالات وموضوعات پر توجہ دی۔

جرأتؔ وانشاؔء کے دور میں غزل میں شوخی آ گئی۔داخلی پہلو کی بجائے خارجی پہلو نمایاں ہونے لگے۔غالبؔ کے انداز بیاں کا اثر شیفتہؔ اور حالیؔ پر بھی پڑا۔اور ان کی کوشش تھی کہ اردو غزل کو مبالغہ وعامیانہ الفاظ سے دور رکھا جائے۔شاہ نصیرؔ،آتشؔ، ناسخؔ نے خارجی پہلو والے الفاظ کے الٹ پھیر اور سامنے کی باتوں کو دلچسپی کا باعث ٹھہرایا۔ان کا رجحان مبالغہ، رعایت لفظی اور سنگلاخ زمین، قافیہ پیمائی کی جانب رہا۔اس دور کے شعراء نے زبان کی صفائی، الفاظ کی نشست، تراش وخراش اور قوائد پر زیادہ دھیان رکھا۔اردو کی یہ خدمت بھی ادب کو سنوارنے کے لئے ایک اہم خدمت تھی۔کیونکہ اردو ادب اتنی ترقی کر چکا تھا کہ بغیر خس وخاشاک کے صاف کئے ہوئے ترقی کی طرف ادب کا قدم آسانی سے نہ اٹھ سکتا۔زبان کیلئے ایک معیار اور ایک مرکز کا متعین ہو جانا از حد ضروری تھا۔اور یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مرکز کے قائم ہونے سے پابندیاں بڑھ جاتی ہیں۔اور یہ چیز اردو ادب کے ایک بڑے حصے پر حاوی ہوگئی۔اسی دور میں پنڈت دیا شنکر نسیم نے'' گلزار نسیم'لکھی۔جسمیں رنگینی بیان ،رعایت لفظی واختصار کی عمدہ مثال ملتی ہے۔اس زمانے میں استادی وشاگردی کا رجحان عام تھا۔یہی وجہ ہے کہ مشاعروں کا رواج عام ہوا۔اس دور میں اردو مرثیہ نے ادب کو عروج تک پہنچایا۔مرثیہ تقلیدی ورسمی دُنیا سے الگ ہو کر ادب میں اپنی ایک شناخت قائم کی۔مرثیہ کے رجحان میں اردو شاعری میں اب حسن وعشق اور اس سے دلچسپی رکھنے والے والہانہ جذبات ختم ہوئے۔اور مرثیہ نے تقدس،شجاعت،قومی ایثار کے جذبات دلکش انداز میں بیان کر کے ایک نئی دنیا کا خاکہ سامنے کر دیا۔لوگوں کو یہ بتایا کہ باپ، بیٹے، بھائی، ماں، بہن، بھانجے، کس طرح ایک دوسرے سے اُنس رکھتے ہیں۔آداب گفتگو نشست وبرخاست کے انداز ذہن نشین کر کے تمدنی زندگی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی۔واقعہ کربلا اور انیسؔ کا خدائے سخن نظم کرنا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر زیادہ پُر اثر ہوگا۔میر انیسؔ ودبیرؔ کی مجلسوں میں گھنٹوں پہلے جانے والوں کو جگہ نہیں ملتی تھی۔سب کا رجحان اسطرف ہو گیا۔اسطرح مرثیہ گوئی نے اردو شاعری کے رجحان کو سادگی،صفائی،تاثیر کی طرف مائل کر دیا۔اور یہ کہ ذہنی ومعنوی اثرات میں مسدس کی شکل ہر دلعزیز ہوگئی۔بیانیہ شاعری کی یہی صورت آنے والی نسلوں کو بہترین معلوم ہوئی۔چنانچہ دور جدید کے اکثر شعراء آزادؔ، حالیؔ، چکبستؔ،وغیرہ نے اپنے پیغامات زمانے تک پہنچانے کے لئے مسدس ہی کا انتخاب کیا۔مرثیہ کے ہر اجزاء ایسے تھے کہ دنیا کے ہر ادب کے لئے مایۂ ناز ہو سکتے تھے۔مگر افسوس کے دور انحطاط میں اردو اپنے اس مذاق کو بھی زیادہ آگے بڑھا نہ سکی۔کوہ تابین زمانے نے مذہبی چیز سمجھ کر جواہر پاروں کو نظر انداز کر دیا۔اس دور کے بعد بھی اردو کا رجحان غزل،قصیدہ،مثنوی کی طرف ویسا ہی رہا جیسا کہ اس سے پہلے تھا۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں'' سبھا'' کا وجود ہوا۔یہ ڈرامائی شاعری کا جزو تھا۔امانت اور مداری لال وغیرہ نے اس صنف پر خاص توجہ دی۔اور زمانے کے لوگ بھی متاثر ہونے لگے۔ادبی پہلو سے نہیں بلکہ تماشا سمجھ کر۔بقول سروری صاحب ۔

'' یہ سبھائیں شاعری کا اعلیٰ نمونہ نہ تھیں''

(کتاب کا نام: جدید اردو شاعری،صفحہ ۶۳۔مصنف: سروری صاحب)

واجد علی شاہ کے بعد اردو شاعری کا مرکز لکھنؤ میں بھی نہ رہ سکا۔ جسے جہاں ٹھکانہ ملا چلا گیا۔اسکے بعد رامپور نے بھی کوشش کی کہ ادنیٰ حیثیت سے دہلی اور لکھنؤ کا جانشین ہو جائے۔کافی تعداد میں شعراء یہاں پہنچے۔جن میں امیرؔ، غالبؔ، داغؔ، جلالؔ، اسیرؔ، میرؔ قلقؔ، تسلیمؔ،اور بحرؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔لیکن رامپور بھی زیادہ دنوں تک شعراء کی سرپرستی نہ کر سکا۔مجمع منتشر ہو گیا۔داغؔ حیدر آباد چلے گئے۔امیرؔ بھی۔

ادبی دور کی تقسیم کے اعتبار سے قلم کا مسافر اس مقام پر آ گیا تھا جو قدیم اور جدید اردو شاعری کا سنگم ہے جہاں پُرانی شاعری کے سربرآوردہ شعراء نئی شاعری کے علم برداروں سے مل رہے ہیں۔آزادؔ، حالیؔ،امیرؔ اور داغؔ کا احترام کرتے ہوئے اپنی عمارتوں کے نقشے مرتب کر رہے ہیں۔

آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی توجہ عوام کی طرف ان کی اجتماعی حیثیت میں کبھی نا رہی۔غریبوں کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا اور اگر کہا گیا تو صرف اور صرف اخلاقی حیثیت سے۔قوم کی شیرازہ بندی میں ہماری شاعری نے کوئی مدد نہ دی۔نہ کوئی پیغام دیا۔نہ راہِ عمل پر لانے کی فکر کی۔حالاں کہ ادب کے لئے اس میدان میں آنا ضروری تھا۔منظر نگاری اور اپنے تاثرات سے زیادہ تر گریز رہا۔اگر نظیرؔ اکبرآبادی وانیسؔ توجہ نہ کرتے تو شاید یہ عناصر ہمیشہ کے لئے قدیم شاعری سے مفقود

ISBN: 978-93-344-4743-9

رہتے۔

ادب کے نزدیک قدیم شاعری اور جدید شاعری میں فرق وقت اور حالات کے تناظر میں ہوا۔ جو ہر ملک اور ہر زمانے میں ہوتا ہے۔ دہلی کے کمزور ہوتے ہی اہل نظر نے دیکھ لیا کہ اب انگریز بغیر عام ہندوستان پر قبضہ کئے ہوئے نہیں رہ سکتے۔ ان کے قدم رفتہ رفتہ استقامت کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ آج یہ سلطنت گئی اور کل وہ صوبہ انگریزوں کا ہو گیا۔ آمدنی واقتدار میں فرق آرہا تھا۔ آخر میں یہ یقین ہو گیا کہ انگریز دہلی اور کلکتہ کے درمیان میں اودھ یا لکھنؤ ایسی ضروری جگہ کو کسی غیر کے ہاتھ میں نہیں رہنے دینگے۔ انگریزی اقتدار اتنا بڑھ چکا تھا کہ اب سر تسلیم سرخم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ غالبؔ نے سچ کہا ہے۔

مے سے غرض نشاط ؤ ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

امیرؔ بھی کبھی کبھی بے چین ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ۔

امیرؔ افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

اس خارجیت نے ایک طرح کی حقیقت نگاری بھی پیدا کر دی جو بعد میں نظموں کے لئے راہیں کھولنے کا ذریعہ بن گئی۔ مگر رفتہ رفتہ ایک بے کیف و بے جان شاعری کا گمان ہونے لگا۔ ان سب باتوں کا ردّعمل جدید اردو شاعری کی شکل میں نمایاں ہونا فطری امر تھا۔

سیاسی اثر کے ساتھ معاشرتی تبدیلیوں نے بھی ہماری شاعری کو بہت حد تک بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ذہنی تبدیلی بھی ہماری جدید شاعری کو شاہراہ پر لانے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔ واجد علی شاہ کی گرفتاری کے ساتھ ہی لکھنؤ پر انگریزی پھیرا لہرانے لگا۔ دربار ختم ہو گئے۔ شعراء بھی بادشاہ حضرات سے تحفے تحائف کی امید کھو بیٹھے۔ دہلی اور لکھنؤ دونوں دروازے بند ہو گئے۔ نئے شعراء کو یہ امید نہ تھی کہ نوابوں اور بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہو گی۔ اب کوئی صلہ یا داد مل سکتی تھی تو عوام الناس سے۔ خیالات میں تبدیلی، تمدن، غرض ہر چیز کی تقلید نئے دور کے حساب سے بدلنے لگی۔ فاتح قوم کا غلبہ ہوتے ہی ان کے خیالات کی تقلید ہونے لگی۔ ہماری اردو شاعری بھی اس تبدیلی کی منتظر تھی۔ انگریزی سے شناسائی ہوتے ہی اس نے مغربی ادب پر نظر ڈالی۔ اور پھر منظر، اخلاق، عشق، رزم کے علاوہ دنیا کے دوسرے محسوسات، سیاست، مذہب، حب وطن، سماج اور کاروباری زندگی کے متعدد پہلوؤں پر اہل سخن نے توجہ کی۔

سیاسی، اقتصادی، سماجی، علمی وادبی، مذہبی، فلسفیانہ اور دوسری تحریکات، وقت کی ضرورت اور فضا کے مطالبات نے اردو زبان اور ادب کے رہنماؤں کی آنکھیں کھول دیں۔ انہیں حالات وخیالات نے حالؔی اور آزادؔ کو ہماری شاعری کی چارہ سازی پر آمادہ کر دیا۔ ۱۵ ؍ اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن اردو قائم کرتے وقت آزادؔ کا تاریخی لکچر جدید اردو شاعری کی تحریک کے اسباب اور نصب العین پر اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے۔ جدید شاعری کے ذریعے آزادؔ اور حالؔی نے وجدان کے ساتھ ساتھ دنیا میں جینے کا راز بھی بتایا۔ زبانی باتوں کی بجائے عملی دنیا میں اردو کو لانا چاہتے تھے۔ بلا شبہ انھوں نے اردو شاعری کو تنگ دائرے سے نکال کر جامعیت وہمہ گیری کی طرف متوجہ کیا۔

اردو شاعری کا یہ خاص رجحان رہا ہے کہ اس نے حسبِ ضرورت اپنے مزاج کو تبدیل کیا ہے۔ اور ان ادبی رجحانات کو تبدیل کرنے والوں میں غالبؔ وذوقؔ کے شاگردوں کے نام فہرست میں اوّل درجے میں ہیں۔ آزادؔ نے نئے رجحانات کی تشکیل کی۔ حالؔی واسمٰعیلؔ نے بڑھ کر ساتھ دیا۔ اور پھر ذوقؔ کے ادبی گھرانے کا ہی ایک باکمال فرد عمارت بلند کرنے کے لئے پنجاب سے اٹھا اور اس حسن جامعیت کے ساتھ تعمیرِ نو کو سنوارا کہ سب کو حیرت ہوئی۔ قدیم وجدید طرز دونوں نے آفرین کی اور ادبی دنیا سے، 'اقبال زندہ آباد' کی صدا بلند ہونے لگی۔ چنانچہ شاعری میں تشبیہات وتلمیحات، اصلاحات، قومیت، ملّت کی تعمیری تحریکیں وجود میں آنے لگیں۔ مثلاً حسین، حیدر، فاروق، بلال، ابراہیم، حجاز، دجلہ، فرات، ھواللہ واحد، ورفعنا لک ذکرک وغیرہ سب اسماء واجزاء اپنی تمام تر خصوصیات ومعنویات کے ساتھ پُر جوش وکار آمد موقع پر استعمال ہونے لگے جیسے۔۔۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال وفقر وغنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

 ISBN: 978-93-344-4743-9

اس دور کے بدلتے ہوئے حالات، سماجی انتشار اور سیاسی وارداتیں صنفِ غزل میں اور نظم میں شامل ہوگئیں۔جن میں علاّمہ اقبالؔ، امیر مینائی، اسمٰعیل میرٹھی، داغ دہلوی، بہادر شاہ ظفر، مرزا اسداللہ خان غالب، چکبست اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کی شاعری میں اس بدلے ہوئے رجحان کو دیکھ سکتے ہیں۔نتیجتاً ادب بھی سماجی حقیقتوں کا آئینہ دار بن گیا۔شاعر وادیب زیادہ روشن خیال اور وسیع النظر ہو گئے۔شاعری جمہوریت کے احساس کا ترجمان بن گئی اور اسی کے ساتھ سیاسی، قومی، اور آزادی پر مشتمل شاعری کا رجحان اردو ادب میں غلبہ حاصل کرنے لگا۔

حوالہ جات:

۱) کتاب کا نام: بانگِ درا مصنف کا نام: علاّمہ اقبالؔ مطبع ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶ سن اشاعت ۲۰۱۸

۲) کتاب کا نام: مختصر تاریخِ ہند مصنف کا نام: مولانا سیّد ابوظفر صاحب مطبع معارف اعظم گڑھ سن اشاعت ۱۹۳۶

۳) کتاب کا نام: جدید اردو شاعری مصنف کا نام: عبدالقادر سروری مطبع انجمن امدادِ باہمی سن اشاعت ۱۹۳۲

۴) کتاب کا نام: اردو شاعری آج کل اور ہمیشہ مصنف کا نام: قاضی مشتاق احمد
مطبع ایچ ایف آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی سن اشاعت ۲۰۰۳

☆☆☆

مراٹھواڑہ میں اردو غزل ۱۹۶۰ء کے بعد: ایک اجمالی جائزہ

ڈاکٹر سہیم الدین خلیل الدین صدیقی
(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سوامی رامانند تیرتھ مہاودھالیہ، امباجوگائی (مومن آباد) ضلع بیڑ)

''غزل'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کہ لغوی معنی ''عورتوں کے متعلق باتیں کرنا'' یا ''حسن والتفات'' کا ذکر کرنا ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے مطلع، قافیہ، ردیف، بحر اور مقطع غزل کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ دیگر اصناف کی طرح غزل بھی ہندوستان کی پیداوار نہیں بلکہ دیگر ملک سے و دیگر زبان یعنی فارسی سے اردو ادب میں داخل ہوئیں اور ایک دن اسی اردو ادب کی وہ اسی ملک کی ہو کہ رہے گئی۔ جس کو ہمارے بے مثال و اعلیٰ اردو داں حضرات نے اس کو سراہا، اس کو سینچا، اس کے گیسو سنواریں ان گیسو سنوانے والوں میں سب پہلا نام خسرؔو کا آتا ہے۔ خسرو کی زبان میں فارسی و ہندی کے اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں، جو آگے چل کر ہندوی، ریختہ، اردو معلیٰ اور اردو کہلاتے ہیں، خالص اردو غزل گوئی کے آغاز کا سہرا قطب شاہ کے بعد دکن کے شاعر ولؔی دکنی کے سر باندھا جاتا ہے۔ یہی ولؔی دکنی، جو کہ کبھی ولؔی گجراتی، کبھی ولؔی اورنگ آبادی اور کبھی اردو غزل کے باوا آدم کہلاتے ہیں۔ بہر حال ولؔی، اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور اورنگ آباد مرہٹواڑہ کا عظیم شہر کہلاتا ہے۔ جہاں ولؔی کے علاوہ سراؔج اورنگ آبادی نے بھی اردو غزل میں خصوصاً دکن میں غزل گوئی کی روایت کو پروان چڑھایا۔ غزل پروان چڑھتے ہوئے ترقی کے نئے منازل، نئے تجربات اور نئے احساسات کے ساتھ صفؔی تک پہنچی۔ صفؔی اورنگ آبادہی کے نہیں بلکہ مراٹھواڑہ کے بھی نمایاں شاعر ہے آپ نے اس صنف سخن میں آسان اور سہل الفاظ داخل کئے اور مع اپنے کم وبیش ۱۹۴۷ء تک لے کر آئے اور وجؔد کے حوالے کر دیا۔

وجؔد مرہٹواڑہ کی ہمہ گیر شخصیت وشاعر تھے۔ آپ ۱۹۶۰ء کے نمائندہ غزل گو شاعر تھے، آپ نے اردو نظم وغزل کو ایک نئی جلا بخشی۔ وجؔد کا پورا نام سکندر علی وجؔد تھا، آپ ۲۲/ جنوری/ ۱۹۱۴ء کو ویجاپور، ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہی اورنگ آباد میں حاصل کی، ۱۹۳۰ء میں شاعری کا آغاز کیا، ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیور سٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا، پھر حیدر آباد دکن سے سول سروس امتحان کامیاب ہوئے۔ جج بنے، بعد ازاں اورنگ آباد میں اسپیشل آفیسر آف انکوائریز رہے۔ جہاں ان کی شاعری نے اپنا کمال دکھایا یہ آزادی کے بعد کا وقیاساً ۱۹۶۰ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ جس میں انہوں نے اپنے شاعری کے بہترین نمونے پیش کئے ان کے غزلوں میں نغمگی، حسن و جمال کی رنگینیاں صاف نظر آتی ہے، وہ چھوٹے چھوٹے بحروں میں بڑی سے بڑی بات کہہ دینے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں جس کی جیتی جاگتی مثالیں ہمیں ان کے کلام میں ملتی ہے:

سادگی لاجواب ہے جن کی
ان سوالوں کی یاد آتی ہے
جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے[1]
آگئی وقت کے منہ پر رونق
غیرتِ شمس و قمر آتا ہے
وہ کسی علم کا محتاج نہیں
جس کو جینے کا ہنر آتا ہے[2]

([1] اوراق مصوّر۔ ص ۱۱۔۱۲۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۳ء [2] اوراق مصور۔ ص ۴۵۔۴۶)

سکندر علی وجد نے اردو غزل کے سرمایہ میں جو اضافہ کیا ہے وہ مرہٹواڑہ کی شاعری کیلئے بہترین امر ہے ان کی غزلوں میں موجودہ وقت کی چاپ سنائی

دیتی ہے، جس میں بلا کا حسن ہے۔ آپ ۱۹۶۰ء کے نمایاں شعراء میں سے تھے، جنھوں نے اردو غزل کی آبیاری کیں اور مرہٹواڑہ کی غزل کو زینت بخشی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سکندر علی وجؔد کے علاوہ علاقہ مراٹھواڑہ کے جن شعراء نے اردو غزل کے دامن کو وسعت عطا کیں، ان میں یعقوب عثانی، حبیب رحمانی، عمر صدیقی، اطہر جالنوی، حکیم ابراہیم خلیل، منظور احمد نظر، حکیم خورشید علی، شاکرؔ جالنوی اور ہرش چندر دکھی جالنوی وغیرہ کے نام بیحد قابل ذکر ہیں۔ یعقوب عثانی نے وجؔد کے ساتھ ہی شاعری کا آغاز کیا لیکن وہ مقام حاصل نہ کر سکے جو کہ وجؔد نے اردو غزل سے حاصل کیا ہے۔ سوائے ''شعر ونغمہ'' کے یعقوبؔ عثانی کا کوئی خاص کارنامہ نظر نہیں آتا، لیکن، اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کے انہوں مراٹھواڑہ کی غزل گوئی کی کوئی خاص خدمات انجام نہیں دی بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ اردو غزل کے لیے سودمند ثابت ہوا ہے۔ اسی باعث یعقوبؔ عثانی کلاسیکی غزل کے نمائندہ شاعر کہلاتے ہیں ان کے اشعار کچھ اس طرح سے ہیں:

منزل کی سمت کا بھی تو لازم ہے احترام
تھک تھک کے راہِ شوق میں بیٹھا نہ کیجئے
رہنے نہ پائے اب تو کوئی نقش ماسوا
مجھ کو مری نگاہ میں رسوا نہ کیجئے[1]
لُوٹ گئی کائناتِ بزم خیال
تم گئے ہو تو ہوش آیا ہے
ہے کوئی جو سنبھال لے بڑھ کر
پائے اُمید ڈگمگایا ہے[2]

([1]شعر ونغمہ۔ ص ۱۲۵۔۱۲۴۔ [2]ایضاً۔ ص ۱۲۷)

یعقوبؔ عثانی کے علاوہ ہرش چندر دکھی جالنوی کا نام بھی مرہٹواڑہ کے نمائندہ شعراء میں قابل ذکر ہے۔ جناب دکھی جالنوی کو مراہٹواڑہ خاص مقام حاصل ہے، آپ کو ''فخرِ مہاراشٹرا'' کے خطاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے شعری مجموعوں میں ''رموز فطرت (مئی ۱۹۶۳ء)'' اور ''رموزِ کائنات (جنوری ۱۹۶۴ء)'' شائع ہو چکے ہیں جس میں تصوّف ومعرفت، واردات زندگی کے تجربات وواقعات، فلسفہ حیات وموت، عشقیہ رنگ، رندانہ وسیاسی رنگ کا امتزاج، متفرقات اور حسن وجمال نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ دکھی کی غزل کا مزاج دوسروں سے منفرد ہے، جس میں اساسی پہلو اور ایک پرسوز کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ شاید اسی لیے وقار الشعراء ڈاکٹر وقار حسن لکھنوی آپ کے غزلوں کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

''اُن (دکھی) کی غزلوں میں جذبے کی آنچ، ایک پُرسوز اور دھیما لہجہ، شیرنی بیان اور نرمئی گفتار کچھ اس طرح سمو گئے ہیں کہ ان کا کلام سامع اور قاری کے قلب ودماغ کو خاصا متاثر کرتا ہے۔'' (رموز کائنات۔ دکھی جالنوی۔ ص ۱۴)

اب ذران کے غزل کے اشعار دیکھئے کتنے دلکش ودلچسپ ہیں۔ اور ان میں درجہ بالا تمام باتیں موجود نظر آتی ہیں ملاحظہ ہو:

موج طوفاں پہ سفینہ کو جو چلتے دیکھا
ہم نے اُمید کے پہلو سنبھلتے دیکھا
زلفِ حالات سنبھالے سے نہ سنبھلی اب تک
زلفِ گیتی کو کئی بار سنبھلتے دیکھا
خود کو احساس کے سانچے میں جو ڈھالا ہم نے
پھر زمانے کی نگاہوں کو بدلتے دیکھا
کارواں عقل کا جس راہ پہ مایوس رہا

 ISBN: 978-93-344-4743-9

ہم نے دیوانوں کو اس راہ پہ چلتے دیکھا
رنج و غم اور الم سوز فضائیں کیا ہیں
ہم نے خاروں میں گل تر کو ہی پلتے دیکھا
خون دل خون جگر خونِ تمنا ہی سہی
سنگ ریزوں سے بھی گوہر کو نکلتے دیکھا
کس کی بَر آئیں زمانے میں مرادیں دکھی
جس کو دیکھا کف اِفسوس ہی ملتے دیکھا

(رموز کائنات۔ص ۱۵۔۱۶)

دکھی کے ساتھ جالنہ کا ایک اور ممتاز نام مولانا محمد عمر صدیقی اطہر جالنوی ہے، جو کہ ایک عالم دین تھے اور اتنا ہی نہیں بلکہ شاعری کا ذوق وشوق رکھتے تھے، کہا جا تا ہے کہ انہیں حضرت خیالی بُر ہان پوری سے شرف تلمیذی حاصل تھا۔ حضرت خیالی کا تعلق دبستان داغ دہلوی سے تھا۔ لیکن آپ کے شاگرد مولانا اطہر کی غزل پر دبستان ِ داغ کا ذرّہ برابر بھی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ مولانا اطہر کی غزلوں میں تصوّف وتسلسل، فلسفہ اور دین کی بصیرت افروز تعلیمات کا حسین امتزاج ملتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ مولانا اطہر کی مجموعہ غزل ''نقشِ دوام'' میں تغزل، رمزوایماء، تشبیہات اور استعارات کی فنی خصوصیات نظر آتی ہے۔ آپ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

اپنے کو غیر ، غیر کو اپنا کریں گے ہم
کب تک بنام ریست یہ سودا کریں گے ہم
پیش و پس گھیرے ہوئے ہے آئینہ خانہ مجھے
کیوں بنایا جارہا ہے مجھ سے بیگانہ مجھے
تفصیل کائنات ہوں یا جزوِ کائنات
اب تک سمجھ سکے نہیں شام و سحر مجھے
دامن گل چھوڑ کر ، صحن گلستاں چھوڑکر
بوئے گل پامال بندش کا سامان چھوڑکر
جب وسعتیں باقی نہ رہیں بحر میں بر میں
جلوے تیرے آ ڈوبے میرے دیدۂ تر میں

۱۹۶۰ء کے زمانے کے بیشتر شعراء میں ایک شاعر مولوی اختر الزماں ناصر بھی گذرے ہیں، جنھوں نے علاقہ مراٹھواڑہ میں اپنی شعری خدمات انجام دی۔ ناصر صاحب اورنگ آباد کے رہنے والے تھے، آپ کی تمام عمر اورنگ آباد مراٹھواڑہ اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں گزری ہے، آپ کے اساتذہ میں یعقوب عثمانی اور درد کاکوری نمایاں نام ہے۔ مولوی اختر الزماں ناصر کے یہاں قارئین کو دبستان داغ دہلوی کی ہلکی پھلکی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آپ کے کلام میں بلا کی شائستگی تھی، جس میں ۱۹۶۰ء کے بعد بڑا انقلاب اور انسان دوستی کا جیتا جاگتا پیغام نظر آتا ہے۔ ان کے شعری مجموعہ کا نام ''برگ وبار'' ہے۔ ان کے منتخب اشعار درج ذیل بطور نمونہ پیش کئے جارہے ہیں۔

دُنیائے محبت کے ہیں دستور نرالے
اس دیش میں مندر ہے نہ مسجد نہ شوالے
دے دعوت ِ آرام کسی اور کو منزل

میں اپنی تھکن میں نہ کروں ترے حوالے
ہے ترک دوستی کا اتنا ہی بس فسانہ
آواز تم نے جب دی میں دور جاچکا تھا
نقاب ڈال کر چہرے پہ و سنورتے ہیں
کچھ اور بھی ہوئے حیراں آئینہ خانے
حسن عریاں اور یہ شباب
لو سوا نیزے پہ آیا آفتاب
جب بھی میرے بغیر پی ہوگی
میرے حصّے کی گر پڑی ہوگی

یعقوب عثمانی، دکھی جالنوی، مولانا عمر اطہر جالنوی اور اختر الزماں ناصر کے بعد آپ (ناصر) کے ہم عصر شعراء میں جس نے ۱۹۶۰ء کے بعد مراٹھواڑہ میں اردو غزل کی روایت کو فروغ دیا جن میں حبیب رحمانی، منظور نظر، اختر حسین، حکیم خاں حکیم اور جے پی سعید وغیرہ اسماء گرام پیش پیش ہیں۔ حکیم خاں حکیم کا حال ہی میں ''آہ نارساں کی ازمائش'' کے عنوان سے شعری مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس کی رسم اجراء گذشتہ ماہ ۱۱/ جنوری/ ۲۰۲۰ء کو قومی سیمینار میں ہوا تھا۔

الغرض جے پی سعید مرہٹواڑہ کے نمایاں غزل گو شاعر ہے۔ آپ کے شاعری میں میر و غالب سے لے کر جگر و اصغر تک کا حسن و جمال ملتا ہے، آپ کی ولادت اورنگ آباد میں یکم/ مارچ/ ۱۹۳۲ء کو ہوئی۔ اور یہی آپ نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اس میں فن کے نئے نئے تجربے کئے۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''گُل گشت (جنوری ۱۹۸۶ء)'' اورنگ آباد سے شائع ہوا۔ ان کے کلام میں تغزل کی تازگی، شائستگی اور شگفتگی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے جو قدم قدم پر ہمارے اردو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کے اشعار میں جدیدیت اور مابعد جدیت کے تمام عناصر دیکھے جاسکتے ہیں، اس کے علاوہ مختلف تشبیہات و استعارات کا حسین امتزاج کے ساتھ انسان کے ظاہری اور باطنی درد کی رو اور ایک الگ طرح کی کسک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ معاً آپ کے یہاں ۱۹۶۰ء کے بعد کی غزل کی تمام خوبیاں نظر آتی ہے۔ آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

گلستاں کی رنگینی کس کی خوں کا ثمرہ ہے
کوئی کچھ نہیں کہتا اور سبھی سمجھتے ہیں
بدگمانیاں ان کی بڑھ گئی ہیں کچھ اتنی
میری خیر خواہی کو دشمنی سمجھتے ہیں
میری بے کسی کا اب حال پوچھتے کیا ہو
مجھ کو خود وطن والے اجنبی سمجھتے ہیں
تھم گئے اشک بھی برسے بادل کی طرح
دل کی بیتابی وہی آج بھی ہے کل کی طرح
لاشیں بکھری ہیں تمناؤں کی ارمانوں کی
قلب کا گنج شہیداں بھی ہے مقتل کی طرح
میں بھی ہوں اشک فشاں آپ اکیلے ہی نہیں
میرا دامن بھی ہے نم آپ کے آنچل کی طرح

 ISBN: 978-93-344-4743-9

(گُل گشت۔ جے پی سعید۔ص ۳۶۔۳۵)

۱۹۶۰ء کے بعد کا دور مراٹھواڑہ کی غزل گوئی کے لئے سُنہرا دور رہا ہے،جس میں مزکورہ بالا تمام شعراء نے کارہائے نمایاں انجام دی ہیں۔ان شعراء کے علاوہ مزید دیگر ے شعراء ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں اپنی شاعرانہ کمالات کے جوہر دکھائے ہیں ان شعراء میں نیاز قیصری (جنتور)،حمید اللہ خاں حامد،شمس جالنوی (جالنہ)،ابوبکر (لاتور) عبدلقادر بیدل،جعفر سوز،عبدلغفار راہی،رشید انجم،امام الدین یقین (پربھنی) اور بشر نواز (اورنگ آباد) نمایاں شعرا ہیں۔مذکور شعراء نے اردو غزل کی روایت کو بے حد فروغ دیا،اور اس کے گیسوؤں کو سنوارنے میں اپنا تعاون دیا۔جس کے باعث ہمارے قارئین وناقدین ان کی خدمات اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔البتہ ان شعراء میں بشر نواز ایک نمایاں نام ہے۔

بشر نواز اورنگ آباد مراٹھواڑا کے مشہور اردو شاعر تھے،آپ اسی شہر میں ۱۸/ اگست/ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے،یہی شاعری کا آغاز کیا،یعقوب عثمانی اور وجد سے رہنمائی حاصل کی اور یہی سے اپنی تخلیقی صلاحیت کی بینا پر قومی سطح پر شہرت پائی،فلموں کے لیے نغمہ لکھے۔اُن نغموں نے خوب واہ واہی بٹوری جس نے انہیں علاقہ مراٹھواڑہ میں منفرد مقام عطا کیا۔ان کے اب تک دو شعری مجموعے''رایگاں ۱۹۷۲ء'' اور''اجنبی سمندر ۱۹۹۷ء'' شائع ہو چکے ہیں۔ان کی غزلوں میں زندگی کے تمام نشیب فراز ،زبان کا سادہ وعام فہم انداز،نفرت اور محبت حسین امتزاج نمایاں طور پر دیکھائی دیتا ہے جس میں جدیدیت کے تمام پہلو نظر آتے ہیں۔

آنکھوں کی لودلوں کی ضیا لے گئی ہوا

چہروں سے اب کے رنگ وفا لے گئی ہوا

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے

رستوں کے سب نشان لے گئی ہوا ۱

چپ چاپ سُلگتا ہے دیا تم بھی تو دیکھو

کس درد کو کہتے ہیں وفا تم بھی تو دیکھو

کچھ رات ڈھلے روز جو آتی ہے فضا سے

کِس ڈوبتے دل کی ہے صدا تم بھی تو دیکھو ۲

جب چھائی گھٹا لہرائی دھنک ایک حسن مکمل یاد آیا

اُن ہاتھوں کی مہندی یاد آئی اُن آنکھوں کا کاجل یاد آیا

ہم زود فراموشی کے لئے بدنام بہت ہے پھر بھی بشؔر

جب جب بھی چلی مدماتی پون اڑتا ہوا آنچل یاد آیا ۳

(۱۔ رایگاں۔ص ۹۷۔ ۲۔ ایضاً۔ص ۰۷۔ ۳۔ ایضاً۔ص ۸۲)

بشؔر نواز نے جس دور میں اپنی ملک گیر شناخت بنائی تھی اس دور کے ان کے ہم عصر شعراء میں قاضی سلیم ،شفیق فاطمہ شعریٰ،وحید اختر،فُضیل جعفری،حمایت علی شاعر،رؤف انجم،سحر سعیدی،محمود عشقی،میر ہاشم اور احسن یوسف زئی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔یہ تمام اردو کے ممتاز غزل گو شاعر رہے ہیں اور ۶۰ء کی دہائی اور اس کے بعد کی تمام دہائیوں کے نمائندہ شعراء بھی کہلاتے ہیں۔قاضی سلیم جدید اردو غزل اور نظم میں میں اپنا مقام بنایا تو انہی کے ساتھ وحید اختر اور شفیق فاطمہ شعریٰ نے اپنا شعری تعاون دیا۔بہر کیف حمایت علی شاؔعر (۱۹۲۶ء۔۲۰۱۹ء) بھی ان سے کم نہ تھے انہوں نے بھی اردو ادب کی خدمت میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کیا۔اور اردو غزل کو جدید لب ولہجہ اور رنگ وآہنگ دیا،آپ کے شعری تصانیف میں''آگ میں پھول (۱۹۸۱ء)''،''تشنگی کا سفر (۱۹۸۱ء)''،''ہارون کی آواز (۱۹۸۵ء)''اور''حرف حرف

ISBN: 978-93-344-4743-9

روشنی (۱۹۸۶ء)''، بے حد مقبول ہے۔ جس میں آپ کی نمائندہ نظمیں، غزلیں اور ایک نئی صنف تثلیثات موجود ہیں، جناب شاعر کے شعری مجموعہ ''حرف حرف روشنی'' سے غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

دست ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آ رہی ہے صدا غور سے سنو
شاخیں اُٹھا کے ہاتھ دعا مانگنے لگیں
سرگوشیاں چمن میں ہیں کیا غور سے سنو
یہ بازگشت ، میری صدا کی ہے یا مجھے
آواز دے رہا ہے خدا، غور سے سنو
کب تک زمیں اُٹھائے رہے آسماں کا بوجھ
اَب ٹوٹتی ہے رسم ِوفا، غور سے سنو
صحرا میں چیختے ہیں بگولے، شہر شہر
اک شور ہے، سکوت ِفزا، غور سے سنو
(حرف حرف روشنی۔ ص ۳۰۔۲۹)

اسی عہد کے ممتاز و نامور شعراء میں میر ہاشم اور احسن یوسف زئی بھی پیش پیش ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میر ہاشم کا اپنے عہد کے ترقی پسند شعراء میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اسی لئے انہیں ریاست مہاراشٹر کے ترقی پسند شاعر بھی تسلیم کیا جاتا ہے، آپ سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، اور اپنے شہر پربھنی کی سیاسی جماعتوں سے بھی وابستہ تھے۔ موصوف کے دو شعری مجموعے ۱۹۶۰ء کے بعد شائع ہوئے ہیں، ایک ''در دِنارسا'' اور دوسرا ''دستِ روز وشب'' جن میں غزلیں اور نظمیں دونوں ہی شامل ہیں، آپ کو ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی نے غزل کے اہم اور بنیادی شاعر کہا ہے۔ جس سے کچھ حد راقم الحروف بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں آپ کے چند اشعار کچھ اس طرح سے ہیں:

اُس کو آباد پہ انداز دیگر رہنے دے
دل کے ویرانے میں خوابوں کا گذر رہنے دے
اتنا ویراں تو نہ کر باد ِخزاں گلشن کو
کوئی پتّا تو سہ شاخِ شجر رہنے دے
صبر ایک آخری صورت ہے سحر ہونے تک
صبح جس کی نہ ہو ایسی تو کوئی رات نہیں

جے پی سعید، بشر نواز، حمایت علی، قاضی سلیم کے بعد اورنگ آباد مراٹھواڑہ ایک نمایاں نام قمر اقبال ہے۔ قمر اقبال صاحب کا وطن اورنگ آباد ہے۔ قمر اقبال اردو غزل کے اور خصوصاً جدید غزل کے ایک قد آور شاعر تھے۔ آپ نے اپنی غزلوں میں گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ آپ ۱۹۷۰ء کے نمائندہ غزل گو واعتدال پسند شاعر تھے۔ آپ کے غزلوں میں تمام تر صلاحتیں پائی جاتی ہے جو کہ ہر ایک غزل گو شاعر کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔

خود کی خاطر نہ زمانے کے لئے زندہ ہوں
قرض مٹی کا چکانے کے لئے زندہ ہوں
آنکھوں کے سامنے ہے اندھیرا سوالیہ

ISBN: 978-93-344-4743-9

سورج ہمارے شہر کا کس نے چرالیا
اپنے ہی شہر کی گلیوں میں جب غیروں جیسا حال ہوا
اقبال محمد خاں کوئی چپکے سے قمر اقبال ہوا
دنیا تھی ایک طرف تو قلم دوسری طرف
میں نے بڑھا کے ہاتھ قلم کو اٹھالیا

قمر اقبال کے لہجہ میں ایک طرح کی غنائیت، مٹھاس اور دردمندی پائی جاتی ہے جس کی وجہہ سے وہ مراٹھواڑہ میں پہچانے جاتے ہیں۔ موصوف نے غزل کے علاوہ ثلاثی میں بھی بڑا نام کمایا ہے۔ ''موم کا شہر'' اور ''تتلیاں'' آپ شعری مجموعے کے نام ہے۔ قمر اقبال کے زمانے میں دیگر شعراء میں عروج احمد جالنوی، سہیل رضوی (پربھنی)، نذیر اختر (ناندیڑ)، شاہ حسین نہری (اورنگ آباد)، محمد کلام الدین صدیقی ساجد یونس، ارمان جالنوی، عبدالغفار راہی (ناندیڑ)، سید اطہر اورنگ آبادی، جاوید ناصر وغیرہ نمائندہ نام ہیں۔ جاوید ناصر کی شاعری میں خصوصاً اردو غزلوں میں حسن، تازگی اور پیکر تراشی کے وصف کے ساتھ ساتھ زبان کو عمدہ طریقہ سے برتنے کا رجحان بھی دیکھائی دیتا ہے۔ آپ کے مجموعے کلام میں ''حاصل (۱۹۷۷ء)'' اور ''تلافی (۱۹۸۸ء)'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

چھیڑ دیتی ہے گھڑی بھر کو خموشی دل کی
روز لفظوں کی نمائش کا مزہ آتا ہے
دست امکان نے پھینکا تھا نشانہ لیکر
سنسناتا ہوا پہلو سے مقدر نکالا
رات آجائے تو پھر تجھ کو پکاروں یارب
میری آواز اُجالوں میں بکھر جاتی ہے
کہاں کسی کے دُکھوں کا شمار کرنا تھا
مجھے تو رات کے دریا کو پار کرنا تھا

سیّد اطہر اورنگ آبادی خصوصاً مراٹھواڑہ، مہاراشٹر، ہند حلقے میں ایک نمایاں ومعروف نام ہے آپ کو اللہ تعالیٰ نے کئی صفات سے نوازا ہے آپ ایک صاحب طرز ادیب، ایک شاعر، ایک مورخ، ایک عالم دین اور ایک صالح شخصیت کے مالک ہے، موصوف کی شاعری میں سادگی، تصوّف، حسن و جمال اور زندگی کے تجربے ملتے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی بات کہنے کا فن بخوبی جانتے ہیں ان کے شعری مجموعہ کا نام ''فکرِ سخن'' ہے۔ ''فکرِ سخن'' کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو خودی میں مقام رکھتے ہیں
وہ خدا سے کلام رکھتے ہیں
جن کو دنیا میں آگے بڑھنا ہے
وہ قدم تیز گام رکھتے ہیں
اپنے دامن پر وہ نظر ڈالیں
دوسروں کو جو نام رکھتے ہیں
بات کریئے ذرا سلیقے سے
ہم بھی اپنا مقام رکھتے ہیں

ISBN: 978-93-344-4743-9

قمر اقبال، جاوید ناصر اور سید اطہر کے بعد جن شعراء نے کم وبیش ۱۹۸۰ء تا حال مراٹھواڑہ میں اردو غزل کے گیسو سنورے اور اب بھی سنوار رہیں وہ اس کو ادب میں ممتاز مقام عطا کر رہے ہیں۔ان میں فہیم احمد صدیقی (ناندیڑ)، سجاد اختر، عطا اللہ محشر (جالنہ)، محمد مقبول سلیم، فاروق شمیم، سلیم محی الدین (پربھنی) وغیرہ سرفہرست ہیں۔فہیم احمد صدیقی کی بات کی جائے تو اُن کے یہاں شعر وادب کے تئیں متوازن رویہ، جدیدیت وروایت کا امتزاج، اور گزرے ہوئے زمانے سے حاصل کیا ہوا تجربہ دکھائی دیتا ہے۔جس کی مثالیں ہمیں ان شعری مجموعہ ''(وارفتہ ۲۰۰۳ء)'' میں ملتی ہے۔

ہمارا دل ہے یہ دہلی سے مختلف ہے، بہت
یہ ایک بار جو اجڑا تو پھر بسا ہی نہیں
رستوں کی نیند اُڑ گئی قدموں کی چاپ سے
مجھ کو تمام رات مرا گھر نہیں ملا
پھر کڑی دھوپ درختوں کے گھنے سائے ہیں
آپ کی یاد کے اسباب نکل آئے ہیں
عزیزوں مجھ سے میرا حال پوچھتے کیا ہو
میں اپنے آپ سے عرصہ ہوا ملا ہی نہیں

فہیم احمد صدیقی کے بعد ایک اور نام سلیم محی الدین کا آتا ہے جو جدید غزل کے ذریعہ ہر عام وخواص قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر دیتی ہے، ان کے یہاں ایک نیا لب ولہجہ ،نغمگی ،غنائیت ، تہہ داری ، چھوٹی اور مناسب بحروں کے ساتھ آسان زبان و بیان اور تازگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے غزلوں کے مجموعہ کا نام ''وابستہ'' ہے۔جس نے اُنہیں ایک منفرد شناخت عطا کی۔''وابستہ'' سے چند مصرعے ملاحظہ ہو:

ہم چراغوں کو روشنی دینگے
تم ہواؤں کے کان بھر دینا
اس کی تصویر جب اُتاروں میں
میرے مولا تو جان بھر دینا

مراٹھواڑہ کی سرزمیں قدیم زمانے سے ہی اردو غزل کے لیے زرخیز رہی ہیں، جو کبھی ولؔی اور سراؔج سے لے متعدد شعراء کا مَسکن رہی, آج بھی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔آزادی کے بعد سے لے کر ۱۹۶۰ء تک اور اور ۱۹۶۰ء لے کر اب تک یہاں بہت سے شعراء پیدا ہوئے ہیں،جس میں سے چند بہت مشہور ہو گئے اور ان کی شہرت کا سکّہ پورے بھارت میں پھیلتا چلا گیا اور ا کچھ ناپید ہو کے رہے گئے ہم انہیں بھول گئے اور بھولتے ہی جا رہے ہیں ناپید ہونے والے شعراء جو اپنے حالات وواقعات کے مارے ہیں آج بھی کہیں سانس لے رہے ہیں۔ہمیں آواز دے رہے ہیں کہ اے اردو کے متوالوں تم کہاں ہوں؟ ہمیں بھی تاریکی سے باہر نکالوں تاکہ ہمارا فن بھی زمانے کے سامنے آئیں۔ہم بھی کچھ اردو کے خدمت گار کہلائے۔مذکورہ بالا سطور میں کچھ ایسے بھی نام ہیں۔جو زمانے کے ستم زدہ حالات وواقعات کے ہاتھوں گم شُدا ہو گئے۔اور کچھ ان حالات زار سے لڑ کر سامنے آ گئے۔ہمیں توقع ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ ضرور سامنے آئینگے۔اور مراٹھواڑہ میں خصوصاً اردو غزل میں ایک نیا شور کرینگے اور ہمیں ان کی نئی بازگشت سنائی دے گی۔

ماخذ شعری کلام

۱)۔ سکندر علی وجؔد۔اوراق مصوّر۔

ISBN: 978-93-344-4743-9

۲)۔ یعقوب عثمانی۔شعرنغمہ۔

۳)۔ ہرش چندر دکھی۔رموز کائنات۔

۴)۔ مولانا اطہر۔نقش دوام۔

۵)۔ مولوی اختر الزماں ناصر۔برگ وبار۔

۶)۔جے پی سعید۔گل گشت۔

۷)۔ بشرنواز۔رائیگاں،اجنبی سمندر۔

۸)۔حمایت علی شاعر۔حرف حرف روشنی۔

۹)۔ قمر اقبال۔موم کا شہر،تتلیاں۔

۱۰)۔ جاوید ناصر۔حاصل،تلافی۔

۱۱)۔ فہیم احمد صدیقی۔وارفتہ۔

۱۲)۔ سلیم محی الدین۔وابستہ۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

غالبؔ اور شاہ حسین نہری کی غزل گوئی

(ایک خاص بحر کے تناظر میں)

ڈاکٹر رعنا کوثر شیخ حسین

اسسٹنٹ پروفیسر طلعت بی ایڈ کالج، خلد آباد

''منسرح'' یہ عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لفظی معنیٰ ہے'' آسان کیا ہوا یا آسان'' ہے۔علم عروض میں بحر منسرح مثمن سالم میں بحر منسرح کچھ مزاحف بحروں میں سے ایک بحر منسرح مثمن مطوی منحور ہے۔منسرح مثمن مطوی منحور کے بحر کا ایک مصرع کا وزن اس طرح ہوگا۔

وزن: مُفتَعِلُن ۔ فاعلاتُ ۔مُفتَعِلُن ۔ فَع

بحر منسرح مثمن مطوی منحور ایک ایسی بحر ہے جہاں تک میرا مطالعہ ہے مجھے اس بحر میں صرف دو شعرا کے غزلیں ملتی ہیں۔جن میں ایک مرزا اسداللہ خاں غالبؔ جو ایک اردو ادب کے عظیم شاعر تھے اور دوسرے شاہ حسین نہری جو دکن اورنگ آباد مشہور شعراء کے نام آتا ہے۔

مرزا غالبؔ نے اردو شاعری میں ایک انقلاب لایا۔ان کے یہاں نیاپن اور جدت کا پہلو ملتا ہے، دیوان غالبؔ کا شعری مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر حصہ غزلوں کا ہے غالبؔ کو اردو اور فارسی دونوں زبان پر مہارت حاصل تھی۔شروعات میں فارسی میں شعر کہنا شروع کئے بعد میں اردو کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اردو میں شاعری میں طبع آزمائی کی۔غالبؔ کی شاعری میں فارسی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا ہے اور ان کی شاعری میں تشبیہات، استعارات، علامات اور اشارات بھی موجود ہے۔غالبؔ کی غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل کو فکر و فن ذہن عطا کیا۔ آل احمد سرور ان کی غزلوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ'' غالبؔ سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی غالب نے اسے ذہن دیا'' غالبؔ کی غزلوں میں تہہ داری موجود ہے تہہ داری کا مطلب یہ ہے کہ شعر کو ایک بار پڑھنے سے کوئی مطلب سمجھ میں آئے گا اور دوبارہ اس شعر کو پڑھیں یا اس پہ غور کریں تو اس کی تہہ سے کوئی دوسرا معنی بھی نکلتا ہے۔ان کی شاعری میں حسن و عشق کے موضوعات، غزلوں میں گہرائی موجود ہے حسن کی مختلف کیفیات کو پیش کیا ہے۔عشق و محبت کی واردات کو داخلی انداز میں بیان کیا ہے۔اس طرح ان کی شاعری میں درد و غم بھی دِکھتا ہے۔یہ غم ان کی ذات، عشق، فکر معاش اور زمانے غرضیکہ سبب سے پیدا ہوتا ہے۔غالبؔ کی شاعری میں شوخی و ظرافت کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔غالبؔ کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ان کا دلکش اسلوب اور پراثر انداز بیان ہے۔غالب نے بہت عمدہ انداز میں سلاست، روانی، سادگی اور صفائی سے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔

مرزا غالبؔ کی ایک غزل کی تقطیع بحر منسرح مثمن مطوی منحور کے حوالے سے پیش خدمت ہے۔

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے

طاقتِ بے داد انتظار نہیں ہے

مُفتَعِلُن	فاعِلاتُ	مُفتَعِلُن	فَعُ
اَ اُ کِ مری	جانَ کوق	رَارُ نہی	ہے
طاقَتِ بے	دادِ ان تَ	ظارَ نہی	ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے

نشّہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

دے تِ ہَ جَن	نت حیاتِ	دہرکِ بد	لے
نَش شَ بَ اَن	دازَ ءِ خُ	مارَ نہی	ے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

گر یہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو

ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

گرِ ہ نکا	لے ہَ تے رِ	بزمَ سِ مج	کو
ہاءِ کِ رو	نے پِ اِ خ تِ	یا رَ نہی	ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر

خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

ہم سِ عَبَثْ	ہے گمانِ	رن جِشِ خا	طر
خا کَ مِ عُش	شاق کی غُ	بار نہی	ہے

دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی

غیر گل آئینۂ بہار نہیں ہے

دل سِ اُٹا	لُط فِ جلوَ	ہاءِ معا	نی
غے رِگُلا	ئی نَ ئے بَ	ہار نہی	ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے

وائے ! اگر عہد استوار نہیں ہے

قَتُ لَ کَ مے	رے کیاہَ	عہدِ تُ با	رے
واءِ اگر	عہدِ اِس تَ	وار نہی	ہے

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ

تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

تونِ قسم	مے کشی کِ	کا ءِ ہَ غا	لب
تے رِ قسم	کا کُچا تَ	بار نہی	ہے

شاہ حسین نہری:

پروفیسر شاہ حسین نہری عصرِ حاضر میں دکن کے معروف وممتاز شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ولادت: ۱۲رفروری ۱۹۴۱ء اورنگ آباد دکن۔ شاہ حسین نہری نے جس عہد میں شاعری میں اپنی آنکھ کھولی وہ دور جدیدیت کے ہنگامہ کا تھا۔ اورنگ آباد کے ہم عصروں میں قاضی سلیم، بشرنواز، سکندر علی وجد، شفیق فاطمہ شعریٰ، جاوید ناصر، عارف خورشید ہیں۔ شاہ حسین نہری کے یہاں قدیم روایات کے ساتھ جدیدیت کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں روایت وجدت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

شاہ حسین نہری ایک ایسے کہنہ مشق، زود گو اور قادرالکام شاعر ہیں جنھوں نے غزلیں اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ نظموں میں مختلف اصناف وہیئت اور اقسام پر اپنی تخلیقی چھاپ چھوڑی ہے۔ حمد ونعت ومنقبت امت مسلمہ کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ آپ نے خشوع وخضوع کے ساتھ بہت ہی خوبصورت انداز میں یہ تقدیسی شاعری کی خدمات کو انجام دیا ہے۔ سامانِ تسکین، مجموعہ اس بات کا بہت ہی بہترین نمونہ ہے۔ رباعیات کے دو دیوان ''ربیعہ'' اور ''شاہ بانی'' ہیں۔ بقول پروفیسر محمد علی اثرؔ۔

''جہاں تک صنف رباعی میں ایک سے زائد دواوین مرتب وارشائع کرنے کا تعلق ہے تو سوائے شاہ نہری کے دکن کیا شمالی ہند کے بھی کسی شاعر

نے یہ اعزاز حاصل نہیں کیا۔'' (عالمگیر ادب، شمارہ نمبر۴، صفحہ نمبر ۳۲۶)

آپ کے غزلوں کے تین مجموعے ''شب آہنگ''، ''شب آفتاب'' منظر عام پر آئے ہیں۔ غزلوں میں مضامین و موضوعات کا تنوع اور فنی محرکات و عوامل کے اعتبار سے بڑی رنگارنگی پیدا کی ہے۔ رباعی کے مشکل اوزان میں شعر کہہ کر شاہ صاحب نے ماہرین فن کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ آپ علم عروض پر بھی کمال حاصل رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی کی مشکل سے مشکل گھاٹی سے گذر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق جتنا بھی لکھا جائے کم ہے اس مقالہ میں شاہ حسین نہری کی غزل کی تقطیع ایک خاص بحر ''بحر منسرح مثمن مطوی منحور'' کے حوالے سے کئے ہیں۔

۱) غزل

خونِ زمیں ہی یہ میزباں ہے ابھی تو

مرحلۂ جبر آب وناں ہے ابھی تو

مُفْتَعِلُنْ	فاعِلاتُ	مُفْتَعِلُنْ	فَعْ
خونِ زمی	ہی یہ مے زَ	باہ ابی	تو
مرحَ لَ ئے	جب رِ اَا بُ	ناہ ابی	تو

نازشِ امکاں کہاں ہے کون بتائے

سازشِ فتراکِ پاسباں ہے ابھی تو

نازِشِ اِم	کا کہاہ	کونَ بتا	ئے
سازِشِ فت	راکِ پاسَ	باہ ابی	تو

میں بھی کبھی واقعہ بنوں تو کہوں بھی

ایک کہانی ہی خانماں ہے ابھی تو

مے بِ کبی	واقِعہ بَ	نوتُ کہو	بِی
اے کَ کہا	نی ہِ خانُ	ماہ ابی	تو

نوکِ زنی ہی مزاج پرس رہی ہے

خواب سرا میں مزاج داں ہے ابھی تو

نوکِ زنی	ہی مزاج	پُرس رہی	ہے
خابِ سرا	مے مزاج	داہ ابی	تو

گرد کی صورت اڑے نہ شاہ بھی اک دن

راہ سے لڑنا یہ سخت جاں ہے ابھی تو

گرد کِ صو	رت اُڑے نَ	شاہ بِ اِک	دن
راہ سِ لڑ	نا یِ سختِ	جاہ ابی	تو

۲) غزل:

سازِ فنا گاہ میری چاہ کہاں ہے

ISBN: 978-93-344-4743-9

شاہ فقیروں کو سیر گاہ کہاں ہے

مُفْتَعِلُن	فاعِلَاتُ	مُفْتَعِلُن	فَعْ
سازِ فنا	گاہ میرِ	چاہ کہا	ہے
شاہ فقی	روکُ سیرَ	گاہ کہا	ہے

روز نئی سمت روز چال نرالی

ایسی ہوا سے بھلا نباہ کہاں ہے

روزَ نئی	سمتِ روزَ	چالَ نرا	لی
اے سِ ہوا	سے بلانِ	باہَ کہا	ہے

ہے تو کہیں منزل خیال وہ میری

نجمِ دلِ شب بتا کہ راہ کہاں ہے

ہے تُ کہی	من زِلے خِ	یالِ وُ مے	ری
نج مِ دلے	شب بتا کِ	راہ کہا	ہے

جلتے مکاں شعلہ زباں سے الاپیں

شہر ہو روشن اگر گناہ کہاں ہے

جل تِ مکا	شُعْ لَ ئےَ زَ	باسِ اَلا	پے
شہرَ ہُ رو	شن اگرگُ	ناہ کہا	ہے

ہمدم ودمساز تھا جو آپ کا اپنا

یاد ہے کچھ دیکھیے وہ شاہ کہاں ہے

ہمدَمودم	سازَ تاجُ	اَاُپَ کَ اپ	نا
یادَہَ کچ	دے کِیے وُ	شاہ کہا	ہے

ماحصل:

اس مقالہ میں دو مشہور شعرا ایک مرزا غالبؔ اور دوسرے شاہ حسین نہری کی غزلوں کی تقطیع بحر منسرح مطوی منحور کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے مطالعہ سے اس بحر میں مجھے صرف دو ہی شعرا کی غزلیں ملی ہے۔

☆☆☆

 ISBN: 978-93-344-4743-9

جدید اردو شاعری کے رجحانات

شازیہ نوشین جلیل احمد

پوسٹ:اسیسٹنٹ پروفیسر((CHB (شعبہ اردو/ فارسی)

ایم۔ایس۔جی آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج مالیگاؤں ناسک

اردو جدید شاعری کا رجحان ایک نئے دور کی عکاسی کرتا ہے، جس میں روایت وجدت کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ 20 ویں صدی کے آخر اور 21 ویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری نے نئے تجربات کی جانب قدم بڑھایا، جس میں شعراء نے روایت سے ہٹ کر مختلف موضوعات اور اسالیب کو اپنانا شروع کیا۔ اس دور کی شاعری میں معاشرتی، نفسیاتی اور فلسفیانہ موضوعات پر زور دیا گیا، اور شعرا نے اپنے اشعار میں گہرائی، پیچیدگی اور حقیقت پسندی کو شامل کیا۔ اس تبدیلی کی ایک اہم خصوصیت اس کا انسان کی داخلی دنیا اور سماجی مسائل پر توجہ مرکوز کرنا تھا۔

جدید اردو شاعری میں ایک اور اہم پہلو اس کی آزاد شاعری ہے، جس میں روایتی بحر اور قافیہ کے قیود سے آزاد ہو کر شعراء نے اظہار کے نئے طریقے اپنائے ہیں۔ آزاد نظم اور نظموں میں لچک اور تغیر نے شاعری کو زیادہ سلیس اور قدرے پیچیدہ بنا دیا ہے۔ یہ شاعری اب صرف خوبصورت الفاظ یا لفاظی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس میں زندگی کی پیچیدہ حقیقتوں کا عکاس ہوتا ہے۔ کئی شعراء نے اپنی شاعری میں سیاست، سماج، اور انسان کے وجودی مسائل کو اجاگر کیا، جس سے ان کی شاعری نہ صرف ادبی میدان میں، بلکہ معاشرتی سطح پر بھی اہمیت اختیار کر گئی۔

جدید اردو شاعری میں کئی اہم شعراء نے اپنے اشعار کے ذریعے نئے تجربات اور خیالات کو پیش کیا ہے، جو ان کی شاعری کو ایک منفرد پہچان دیتے ہیں۔ یہاں کچھ مشہور شعراء کے اشعار اور ان کے اسلوب کی جھلک پیش کی جا رہی ہے:

فیض احمد فیض اپنی شعری خدمات کے سبب عصر جدید کے سب سے زیادہ مقبول اور منفرد شاعر ہیں جو بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ فیض احمد فیض نے جس دور میں شاعری شروع کی اس وقت عام طور پر روایتی طرز کی شاعری کی جاتی تھی فیض نے بھی اگر چہ شروع شروع میں روایتی طرز تحریر اپنایا مگر جلد ہی انھوں نے اس شاعری کو خیر باد کہہ کر حقیقت کی طرف آگئے اس طرح فیض اس زمانے میں ایک پُل بن کر سامنے آگئے جو روایت کی سنگلاخ چٹانوں کو تجربوں کی خار وادی سے ملاتا ہے۔ فیض کی شاعری کے اثرات دور جدید کے شاعروں پر حاوی نظر آتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ جدید تقاضوں اور عصری موضوعات کو فن کارانہ چابکدستی سے موضوع شعر بناتے رہے اور ساتھ ہی اپنی روایت سے بھی انھوں نے رشتہ قائم رکھا اور فیض نے جو اسلوب اپنایا اس کا اثر بھی نئے شاعروں پر خاصا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے استعارے اور تراکیب، علامت نگاری اور پیکر تراشی کے نمونے بھی نئے شاعروں میں کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں ان کے اثر کا خاص سبب یہی رہا کہ انھوں نے روایت کی روشنی میں مشاہدے اور تجربے کی تازگی اور پختگی سے اپنی شاعری کو منور کیا۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے

احمد فراز

احمد فراز کو جدید شعرا میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ اور سلاست سے بھرپور ہے لیکن اس میں حد درجہ نفاست پائی جاتی ہے۔ عام آدمی بھی ان کی شاعری کو بڑی آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ احمد فراز کی شاعری میں رومانوی موضوعات کے علاوہ سماجی اور سیاسی عوامل سے پیدا ہونے والے احساسات اور جذبات

بھی اپنی پوری شدت سے ملتے ہیں۔ان کی شاعری کا کینوس محدود نہیں وہ سماجی اقدار کے بہت بڑے علمبردار تھے اور انہیں اپنی اقدار کی پامالی کا بہت دکھ تھا،ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

اب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

پروین شاکر

پروین شاکر کی شاعری میں نسوانیت،محبت،اور ذاتی جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ان کے اشعار میں لطافت اور فنی جمالیات کی جھلک ملتی ہے۔ایک معروف شعر:

آندھی کی زد میں آئے ہوئے پھول کی طرح
میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے فضا میں بکھر گئی

جون ایلیا

جون ایلیا کی شاعری میں شدتِ جذبات،نفسیات اور تنہائی کا گہرا تذکرہ ملتا ہے۔ان کا کلام ہمیشہ بے باک اور تلخ حقیقتوں سے بھرا ہوتا ہے۔ایک مشہور شعر:

چاہتا ہوں کہ بھول جاؤں تمہیں
اور خود بھی نہ یاد آؤں تمہیں
جیسے تم صرف اک کہانی تھیں
جیسے میں صرف اک فسانہ تھا

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں حقیقت پسندی اور سماجی مسائل پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ان کی شاعری میں انسان دوستی کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے اور ان کے اشعار میں عوامی زندگی کی غمگین حقیقتیں بڑی سادگی سے بیان کی گئی ہیں۔

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

کنول فیروز

کنول فیروز ان کی شاعری زندگی سے بھرپور،انقلاب آفریں اور عمل کی پیامبر ہے،وہ ان دانشوروں میں شامل ہیں جو کسی تعصب کا شکار نہیں اور جب کبھی اُس کے گرد جبر و استبداد اور انسانیت سے استحصالی کی آندھیاں اس زور سے چلتی ہیں کہ یہ تند و تیز طوفان ہر تمنا ہر آرزو اور مستقبل کی تمام اُمیدوں کو بہالے جاتا ہے۔تو اس کے نغمات میں گہرے کرب کی ایک ٹیس یوں اٹھتی ہے۔

رہگزر،رہگزر ہے سناٹا
زرد پتوں سے اَٹ گئے رستے

یہ شعراء جدید اردو شاعری کی ایک اہم کڑی ہیں،جنھوں نے اپنے منفرد انداز اور تجرباتی اسلوب کے ذریعے اردو ادب کو نئے رنگوں میں ڈھالا ہے۔ان کی شاعری میں نہ صرف محبت،دکھ اور جذبات کا بیان ہے،بلکہ اس میں سماجی،ثقافتی اور نفسیاتی سطح پر بھی گہرا غور و فکر کیا گیا ہے۔

اردو کی جدید شاعری میں زبان کا استعمال بھی ایک نیا رنگ اختیار کرتا ہے۔جدید شعراء نے اپنی زبان کو سادہ،سلیس،اور عوامی بنایا تا کہ وہ عوام تک پہنچ سکے۔ان کی شاعری میں مقامی لہجے اور غیر روایتی اصطلاحات کا استعمال بڑھا ہے،جس سے ایک نیا ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔اس دور کے شعراء اپنی زبان کو ایک جدید آئینے کی طرح استعمال کرتے ہیں،جس میں ماضی اور حال کی جھلکیاں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔یہ زبان انفرادیت اور شناخت کا عنصر بھی بن گئی ہے،جو عصر حاضر کی تہذیبی اور معاشرتی

تبدیلیوں کی عکاسی کرتی ہے۔

جدید اردو شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو اس کا تجرباتی اور استعاروں کے استعمال میں اضافہ ہے۔ شعرا نئے روایت سے ہٹ کر نئے استعارے، علامات، اور بصری تخیلات کو اپنے اشعار میں جگہ دی۔ اس طرح کی شاعری نہ صرف نئے فنی تجربات کا حصہ بنی، بلکہ قاری کو ایک نئے طریقے سے سوچنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ اس دور میں شاعری نے ایک خاص "مابعد جدید" رنگ اختیار کیا، جس میں موجودہ دور کی غیر یقینی اور متنوع حقیقتوں کو سلیقے سے بیان کیا گیا۔ اس نے قارئین کو ایک نئے فکری افق پر پہنچا دیا، جہاں وہ ماضی کی شاعری سے ہٹ کر نئے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جدید اردو شاعری کے رجحانات نے ثابت کر دیا کہ ادب کی حقیقت صرف خیالات اور جذبات کی گہرائی تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ یہ معاشرتی اور انسانی تجربات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ یہ شاعری نہ صرف وقت کی تبدیلیوں کا عکس ہے بلکہ انسان کی داخلی دنیا اور اس کی پیچیدگیوں کو بھی بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ اس کا اثر اردو ادب کے مستقبل پر دیرپا ہوگا، اور یہ آنے والی نسلوں کو اپنی حقیقت اور شاعری کے ذریعے جینے کے نئے طریقے سکھائے گا۔

حوالہ جاتی کتب

1: جدید اردو شاعری عبدالقادر سروری انجمن ترقی اردو ہند حیدرآباد 1932

2: جدید شاعری عبادت بریلوی اردو دنیا، کراچی 1961

3: جدید اردو شاعری پر فیض احمد فیض کے اثرات ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ ہاشمی 2012

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

مراٹھواڑہ کے نمائندہ شاعر: ڈاکٹر عصمت جاوید

سید اشفاق علی سید مظفر نبی

ریسرچ اسکالر، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی

کسی شخصیت کا کسی مخصوص حیثیت میں مشہور ہو جانا بھی کبھی کبھی اس کے لیے وبال جان بن جاتا ہے کیونکہ اس شہرت کی وجہ سے جس میں وہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے، اس کے علاوہ لوگ اسے کسی دوسری خصوصیت کا حامل ماننے کے لیے یا تو ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے یا اس درجہ کا مقام نہیں دیتے جیسے کسی اور کو جو صرف اسی شعبہ کا خاص ہوتا ہے دیتے ہیں۔ یہی بدقسمتی سے ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب کے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک ماہر لسانیات، ایک بہترین ناقد ہیں، نثر پر ان کی بڑی گرفت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بہترین شاعر بھی ہے اس بات کو بھی نہ صرف قبول کرنا چاہیے بلکہ بحیثیت شاعر ان کا اردو ادب میں جو مقام ہے انھیں وہ مقام بھی ملنا چاہیے۔ میں آج اس مختصر مقالے میں مراٹھواڑہ کے دیگر شعراء کے علاوہ ڈاکٹر عصمت جاوید بھی ایک نمائندہ شاعر ہے اسی بات کو پیش کرنے کی حقیر کوشش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کی شاعری پڑھ کر یہ احساس جاگزیں ہوا ہے کہ وہ ایک حساس شاعر ہے۔ وہ نو بہ نو مضامین کو بڑی چابکدستی سے شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ سیاست ہو یا معاملات زندگی، منافقت ہو یا دوغلا پن یا کوئی اور زندگی سے جڑے مسائل ہوں وہ ایک حساس شاعر کو کسی طور چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید کو اجتماعی حسیت کا احساس اور اسے بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنی گرفت میں لینے کا ہنر خوب آتا ہے۔ ان کے بیان میں روانی کے ساتھ شیرینی بھی ہے۔ بین الاقوامی فکری پس منظر کے ساتھ معاشرت، سیاست اور تہذیبی روایات پر ان کی گہری نظر ہونے کے سبب ان کی شاعری میں سچا تخلیقی حسن دکھائی دیتا ہے۔

غزل جمالیات کا ایسا اظہار ہوتا ہے جس کے وسیلہ سے شاعر اپنی داخلی کیفیات اور قلبی واردات کو ایک دلکش تجربہ بنا کر پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کی غزلیہ شاعری، لسانی و اسلوبیاتی کے گہرے نقوش سے عبارت ہے۔ ان کی غزل، نظم، قطعہ اور رباعی پر الفاظ غالب ہیں۔ ان کے بعض ابیات مشہور ہوئے جس میں شاعر کا تعلّی کا احساس ہی نہیں ہے بلکہ اس تعلّی میں اس کا شعور، اس کا عہد اور اس کا وجود سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔

سیاح دور دور سے آتے ہیں دیکھنے
پتھریلے شہر میں وہ اکیلا درخت ہے

☆

وہ تو سورج ہے، جہاں جائے گا، دن نکلے گا
رات دیکھی ہو تو سمجھے کہ اندھیرا کیا ہے

☆

جو مجھ پر نثر کا ہوتا نہ قرض اے جاوید
میں شاعری میں بڑا نام کر گیا ہوتا

☆

آئندہ و گزشتہ کو مجھ میں کرو تلاش
پڑھتے ہیں جس کو روز وہ اخبار میں نہیں

☆

پت جھڑ کی رت میں، کاغذی پھولوں کے درمیاں
میں ہی تو ایک پھول بچا ہوں گلاب کا

رؤف خیر نے ڈاکٹر عصمت جاوید کی شاعری سے متعلق لکھا ہے:

''لسانیات کے خشک موضوعات میں الجھے رہنے کے باوجود عصمت جاوید کے اندر کا شاعر ہمیشہ زندہ وسلامت رہا۔ یہی ہم زاد بعد میں روپ بدل بدل کر ان کی پہچان بھی بنتا گیا''۔

'اکیلا درخت' کی شاعری میں روز وشب کے حوادث سے ہم روبرو ہوتے ہیں۔اس درخت پر مسائل کے اتنے ثمر لٹکے ہوئے ہیں جن مسائل کو شاعر نے اٹھایا ہے ان کا حل یقینی طور پر کل ملے گا۔انھوں نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی تعبیر بھی بتائی ہے:

بنیں گی کل یہی زنجیر ٹوٹنے کی صدا
جو آج درد میں ڈوبی ہوئی کراہیں ہیں

☆

اپنے آگے ظالموں کو پابجوٗلاں دیکھنا
گو ابھی ممکن نہیں، امید آئندہ تو ہے

عصمت جاوید کے شعری رنگ وآہنگ میں لسانی آمیزہ کو اولیت حاصل ہے۔ان کی غزلوں میں پہچان اور اجنبیت کے درمیان ایک سوال ہمیشہ قائم رہتا ہے۔یہ سوال پہچان کے وسیلے سے درآیا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر حمید سہروردی رقمطراز ہیں:

''عصمت جاوید نے زندگی کے ہر لمحاتی اور عارضی تجربے کو ایک نئی اور آفاقی شکل وصورت دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ان کے شعری اظہار میں پہچان اور اجنبیت کے مابین سوالیہ نشان، اجنبیت اور ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ پہچان کے وسیلے سے درآیا ہے''۔

ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب کے کلام کے موضوعات واسلوب پر جن صاحب نظر شعراء نے اظہار کیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

عارف خورشید اپنا خیال ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:

''اکیلا درخت میں خدا کی ذات پر یقین، لوگوں کے منافقانہ رویے پر بے چینی کا اظہار، واقعات وحالات زمانہ سے عدم اطمینان اور ناراضگی، نصیحتیں، غصہ، بے زاری، طنز اور کہیں کہیں جھڑکی، نوجوان نسل سے بطور خاص برہمی، شور وغل اور احساس نغمگی کی کمی، اکثر شکایت وغیرہ موضوعات عصمت جاوید کے کلام کا حصہ ہیں''۔

شیخ ابراہیم خیال فتح پوری کے خیال میں:

''عصمت جاوید بظاہر بڑی سادگی سے باتیں کہتے ہیں غیر متعلق سی باتیں لیکن ان باتوں کے پیچھے جو مصنوعی گہرائیاں چھپی ہوئی ہیں وہ صرف غور کرنے سے کھلتی ہیں ان کی غزلوں میں چاند، سورج، پہاڑ، چشمے، سمندر سبھی کچھ ہے''۔

نذیر فتح پوری گویا ہوتے ہیں:

''عصمت جاوید کی غزلوں میں طنز کا پہلو بھی نمایاں ہے۔اس طنز کی مختلف صورتیں ہیں۔آدمی پر طنز، زندگی پر طنز، سماج کی بے راہ روی پر طنز، سیاست کی فریب کاری پر طنز، حکمرانوں کی عیاری پر طنز، اخلاق کی پائمالی پر طنز، انسانیت کی زبوں حالی پر طنز، کردار کی منافقت پر طنز، حتیٰ کہ شاعر نے اپنے آپ پر بھی طنز سے گریز نہیں کیا''۔

مذکورہ بالا آرا کے تناظر میں دیکھا جائے تو عصمت کی غزلوں میں لفظی ومعنوی ابعاد کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ان کی شاعرانہ عظمت ان ہی لفظیات سے تشکیل

ISBN: 978-93-344-4743-9

پاتی ہے۔لسانی اوراسلوبیاتی کے چکر نے الفاظ کی دنیا تک ہی شاعر کو مقید کر دیا۔انھوں نے لفظوں کے سہارے ہی سے بعض اشعار اچھے بھی نکالے ہیں جس سے ان کی شاعرانہ عزت بڑھی ہے:

جو سچ لکھوں گا جل جائے گا کاغذ
قلم سے پھر بھی کہتا ہوں شرر لکھ

☆

یہ اور بات ہے کہ اسے بھول جائیں ہم
ہے زندگی سے موت کا رشتہ جڑا ہوا

☆

مضطرب سناٹا، ٹوٹی کشتیاں، لاشوں کے ڈھیر
ہے سمندر کا عجب منظر، اتر جانے کے بعد

☆

بھرم یہ کیسے کھلا دل کی بے نیازی کا
مری نگاہ میں عریاں ہے کوئی خواہش کیا

☆

تھک چکا ہوں سنتے سنتے کھوکھلے لفظوں کا شور
کوئی لہجہ دل سے ٹکرا کر کھنکتا کیوں نہیں

☆

آ کر قریب کم نہ ہوئے دل کے فاصلے
مانا کہ فاصلوں کی یہ دنیا سمٹ گئی

شاعر نے لسانی وفنی محاسن کو اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے جس سے رنگ غزل میں ندرت ونظافت پیدا ہوگئی ہے۔اکیلا درخت کی غزلیں دبستان اورنگ آباد کی دین ہیں۔عصمت جاوید کی غزل گوئی اپنے منفرد طرز بیان کی وجہ سے قابل مطالعہ ہے۔

☆☆☆

جدیدیت اور اردو شاعری

سیدہ نازیہ فاطمہ سید زین العابدین
ریسرچ اسکالر (پی۔ایچ۔ڈی) شعبۂ اردو
ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر یونیورسٹی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے حوالے سے، وہ بھی موجودہ ادبی صورت حال کے سیاق میں باتیں کرنا غیر ضروری سا لگتا ہے۔ ایسی ہر اصطلاح وقت کے تناظر میں اپنا ایک دائرہ بناتی ہے۔ اس دائرے کی روشنی میں اس کا کچھ مفہوم متعین ہوتا ہے، پھر وہ اصلاح تعینات کی قید سے کسی نہ کسی حد تک آزاد ہو جاتی ہے۔ اس کی تعبیر اور تشریح کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ جدیدیت بے شک ایک تاریخی مظہر ہے اور اپنا ایک خاص تہذیبی، معاشرتی اور فکری پس نظر رکھتی ہے لیکن تاریخ، جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، ماضی سے مربوط ہونے کے باوجود اور ایک مخصوص زمانی اور مکانی سیاق میں اپنی پہچان قائم کرنے کے باوجود کبھی یکساں نہیں رہتی۔ ایک سطح پر، تاریخ ماضی اور حال کے مابین ایک مکالمے کا نام ہے، ظاہر ہے کہ حال ایک بدلتا ہوا اور ارتقا پذیر مظہر ہے، اس لیے مثال کے طور پر جدیدیت سے ہم آج جو کچھ مراد لیتے ہیں، وہ سن ساٹھ کے آس پاس جدیدیت کے مقبول اور مروج مفہوم کی کاربن کاپی نہیں ہوسکتا۔ اپنی پرانی ترجیحات یا تعصّبات پر اصرار دراصل ایک فیوڈل رویہ ہے جسے ہم نہ تو نئے زمانے سے ہم آہنگ قرار دے سکتے ہیں نہ ہی نئی فکر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدیدیت اپنے ماضی سے یا اپنی روایت سے ایک نے تعلق کی تفسیر تھی۔ آرٹ اور ادب کی دنیا میں جدیدیت نے ایک معنی خیز رول ادا کیا۔ اس طرح جدیدیت کو ایک ناگزیر تاریخی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

لیکن یہ تعریف اپنے ابہام کے باوجود ادھوری ہے، اردو تنقید اور شاعری یا فکشن کا جو سرمایہ سن ساٹھ کے بعد سے اب تک سامنے آیا اس کے حساب سے یہ تعریف خام کارانہ بھی ہے لہٰذا ہمیں اپنے استدراک اور اثاثے پر ضرورت سے زیادہ خوش اور مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔ جس پیچیدہ، پریشان کن، تہذیبی، تاریخی اور جذباتی ماحول کے واسطے سے جدیدیت کا میلان سامنے آیا اور جسے مرتب کرنے میں پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دنیا پیش پیش رہی، اس کی ایک نمائندہ جہت بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے سیاسی حالات سے نکلتی ہے۔ کسی بھی عہد کی فکر کا مجموعی خاکہ یہاں تک کہ مزاج بھی اس عہد کی تاریخ اور سیاست کے اٹوٹ رشتوں کا پابند ہوتا ہے اور بیسویں صدی تو یوں بھی، سیاست کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے اقتدار کی صدی ہے۔ اس لیے، پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں ایک طرف پرانے آدرشوں کی شکست کا شور ہے، دوسری طرف نت نئے اندیشوں اور وسوسوں کی سرگوشی۔ یہ ایک عظیم افسردگی (DEPRESSION) کا دور تھا اور ایسی متضاد، عجیب و غریب کیفیتوں کی گرفت میں تھا کہ اس کی پہچان مشکل ہوگئی تھی۔ بقول کے THE AGE OF WONDERFUL NONSENSE AND BATHTUB GIN" اخلاقی، ضابطوں کے لحاظ سے ایک انقلابی تبدیلی کا اور جس نے حساس لکھنے والوں کو اپنی صورت حال کی عکاسی کا ایک نیا راستہ دکھایا، نئے اسالیب اختیار کیے گئے اور اجتماعی، سماجی اور سیاسی تجربوں کی ایک نئی تعبیر کا دروازہ کھلا۔ سماجی حقیقت نگاری کے روایتی تصور اور تاریخ کی جدلیات میں یقین رکھنے والوں کی رسمی وضع کے برخلاف سماج، سیاست اور تخلیقی تجربے کے گنجلک رشتوں کو سمجھنے کی نئی کوششیں سامنے آئیں۔ فکری تن آسانی کی عادت اور محدود مروج اصطلاحوں کا سہارا ڈھونڈنے کی روش بہت سے لوگوں کو اس سچائی سے دور رکھتی ہے کہ سماجی وابستگی اور سیاسی موقف کا مفہوم وقت کے ساتھ بدلتا بھی ہے۔ ادب کے ENGAGEMENT میں یکساں ایقان کے باوجود ضروری نہیں کہ ایقان کی حدیں اور بنیادیں بھی ایک سی ہوں۔ چنانچہ آپ اپنے حساب سے باتیں کیجیے اور ہمیں اپنے حساب سے سوچنے دیجیے۔ اجتماعی سچائی بہت بڑی سچائی ہے اور اس سچائی سے شعر و ادب کا رابطہ برحق مگر ادب کی تفہیم تخلیق اور تشکیل کا عمل بہر حال ایک شخصی اور انفرادی سرگرمی ہے۔

نئی شعری روایت کے حوالے سے بات کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس رمز کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ سمجھنے میں خاصی کوتاہی برتی۔ ہمارے یہاں یہ مسئلہ بالعموم سن ساٹھ کے بعد زیر بحث آئے۔ گویا کہ مغرب کے مقابلے میں کوئی پچاس برس کی تاخیر کے ساتھ۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ ہر قوم کا اجتماعی شعور اپنا الگ کلینڈر رکھتا ہے۔ تاہم تشویش کی بات یہ ہے کہ نئے شاعروں نے اپنے ترقی پسند پیش رووں کی بہ نسبت کچھ نئے دروازے تو بے شک کھولے، مگر ان کی ضد میں کچھ نئی دیواریں

بھی کھڑی کرلیں۔ جدیدیت ایک معنی میں انسانی تجربوں اوراظہار کی ان تالہ بندیوں کے خلاف ردِعمل کا اور برہمی کا اظہار بھی تھی جن کا قصوروار ہم سماجی حقیقت نگاری کے خالی مفسروں کو ٹھہراتے ہیں لیکن ساتویں دہائی میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے مابین جو گھمسان کا رن پڑا اس نے اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دیے۔ عبرت کا مقام یہ ہے کہ ادب کی روایت، تاریخ کے تسلسل اور کلاسکیت کا شعور رکھنے والے ترقی پسند اکابر بھی بے قابو ہو گئے۔ صبا، حیدرآباد اور شب خون، الہ آباد کے صفحات اس کی گواہی دیتے ہیں۔ رہے نئے لوگ اور نئی حسیت کے علم بردار، تو ان کا نو مسلمانہ جوش سمجھ میں آتا ہے اور اس کا تجزیہ ہم آج نسبتاً معروضی فاصلے کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ایک طرف تبدیلی کی حقیقت اور احساس وخیال کو نئے موسموں کو تسلیم کرنے سے انکار، دوسری طرف کیسی ستم ظریفی ہے کہ ترسیل کی ناکامی کے المیے کو تمغے کی طرح سجانے پر اصرار، اس افراتفری کا نتیجہ جو نکلا وہی نکلنا بھی چاہئے تھا۔ اختر الایمان نے تو خیر اپنی بے تحاشا زرخیزی اور زور آوری، اپنے غیر منتشر انہماک اور اپنی یکسوئی کی وجہ سے ایک محفوظ جگہ اپنے لیے بنائی ورنہ ہمارے پیشرو اس خود فریبی سے نکلنے کو تیار نہیں تھے کہ ان کے بعد صرف سناٹا ہے۔ دوسری طرف نئی بصیرت کا دم بھرنے والوں میں خود احتسابی کا کال ایسا پڑا کہ ایک اپنے سوا سبھی کو مسترد کر بیٹھے۔ انفرادی تجربے، تنہائی اور بے سمتی کا راگ دھیما پڑا تو کرتب بازیاں شروع ہو گئیں اور نہ جانے کب کے کھوئے ہوئے سبق یاد آنے لگے۔ ارتقا کا دائرۂ عمل بھی ہوا تو رعایت لفظی اور معنوی کی سطح پر پاکتے جانگیے اور بنیان کی ردیف پر۔

اگر یہ صورت حال ہمیں افسردہ نہیں کرتی تو زمانے کے بجائے ہمیں اپنی طرف تشویش ہونی چاہئے اور یاد کرنا چاہئے کہ تاریخ کا سفر کچھ صوفی منش سماجی مفکروں (اروبندو گھوش، جدو کرشنا مورتی)، روحانی معالجوں اور احیاء پرست سیاسی تنظیموں کے علاوہ، شعور کے کسی اور منطقے میں کبھی بھی متدائر (CYCLICAL) نہیں ہوا۔ زندگی اپنے اندرونی تضادات اور باطنی آویزشوں کے باوجود آگے بڑھتی جاتی ہے اور نئے واقعات و واردات سے اس کا ربط قائم ہوتا جاتا ہے لیکن کیا تدریجی تحرک اور ترقی کے اس پیمانے پر ہم اپنی نئی شعری روایت یا نئی حسیت کے مفہوم کا تعین کر سکتے ہیں۔ شاید نہیں، اور اس انکار کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنا تجزیہ ایک وسیع تر تناظر میں کرنا ہوگا۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ بہ قول بلراج کومل۔۔ ''کامیاب نظم میں تحرک فن کارانہ چابکدستی سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ماورائے تعریف اس وصف سے ہوتا ہے جو لمحہ اعجاز میں تخلیق کو روشن اور منور کر دیتا ہے۔ دور حاضر دور کی جو کامیاب نظمیں کم و بیش اس معیار پر پوری اترتی ہیں ان میں اقبال کی مسجد قرطبہ، تصدق حسین خالد کی کتبہ، میراجی کی سمندر کا بلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے، راشد کی اسرائیل کی موت، فیض کی تنہائی، سردار جعفری کی میرا سفر، مخدوم محی الدین کی لخت جگر، اختر الایمان کی ایک لڑکا، مجید امجد کی آٹوگراف، وزیر آغا کی اجڑتا شہر، خلیل الرحمن اعظمی کی آنچل کی چھاؤں میں، قاضی سلیم کی کھلونے، محمد علوی کی گھر، شہریار کی عہد حاضر کی دل ربا مخلوق، ساقی فاروقی کی مردہ خانہ یکساں سطح پر نہ ہونے کے باوجود قابل ذکر ہیں۔۔۔ اور شاعر بھی ہیں اور بہت سی اور اہم اور قابل ذکر نظمیں بھی ہیں جنھیں بآسانی اس نامکمل فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں لفظ باسانی کی بلاغت لائق توجہ ہے اور علامہ اقبال کی مسجد قرطبہ سے ساقی فاروقی کے مردہ خانے تک تسلسل کی جو لکیر کھینچی گئی ہے وہ بہت سے سوالات کی جگہ افسردگی اور ملال کا ایک گہرا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس سے ایک لگاتار بڑھتے ہوئے تخلیقی اضمحلال کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اس صنف میں اقبال کا نام شامل کرنے کے لیے ایسا ویسا حوصلہ کافی نہیں ہے۔ ہم اس سے آگے بڑھ کر میراجی، راشد، فیض، اختر الایمان پر آتے ہیں اور نئے شعری منظرنامے کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بات فوراً سامنے آتی ہے، وہ بھی ذہن پر زیادہ زور دیے بغیر۔ یہ کہ نئے شاعروں نے نئی تنقید کے اس بلند بانگ اور قدرے تحقیر آمیز رویے سے زیادہ اپنے بنیادی مزاج میں وقوع پذیر ہونے والے چند تغیرات کے نتیجے میں فیض کی بہ نسبت میراجی اور راشد اور پھر ذرا دیر سے اختر الایمان کو جو قبول کیا تو اس کے اسباب میں کہیں ترقی پسندی کے لیے کسی قسم کا تعصب تو نہیں تھا؟ شاید نہیں۔ فیض کی شاعری میں تخلیقی معجزہ کاری اور طلسم کا عنصر ان کے تمام ہم عصروں سے زیادہ ہے اور فکر، نظریہ، طرز احساس غرض کہ تمام بیرونی سہاروں کے بغیر صرف اپنے شاعرانہ سحر اور غنائیت کے بل بوتے پر اصولی اختلافات کو زیر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ فیض کے اشعار پڑھتے وقت ہم اپنے آپ کو ان کے تصورات اور اور تجربوں کی دھوپ سے بچائے رکھیں جب بھی ان کا جادو ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ اس کے باوجود نئی شعری حسیت کا سلسلہ میراجی اور راشد سے تو قائم ہو گیا اور فیض کی طرف بڑھنے میں اسے جو تامل ہوا تو اس لیے کہ فیض کی شاعری اپنے تخلیقی تحکم اور اقتدار کے بعد بھی کچھ بند بندسی، کچھ بندھی بندھی سی ہے۔ ہمارے جذبوں کو اور احساسات کو جتنی چھوٹ میراجی اور راشد کی شاعری سے ملتی ہے، فیض سے نہیں ملتی۔ نئے شاعر اپنے تجربوں کی دریافت اور اظہار کے سلسلے میں اس آزادی کے طلب گار تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ حالی کے افادی اور مقصدی شاعری کے منشور سے لے کر ترقی پسند تحریک کی شعریات تک بیرونی احکامات کا جو قصہ چلا آتا ہے، اسے اب ختم کیا جانا چاہئے۔ نئے شعرا اپنے پیشروؤں سے (جن میں حلقہ ارباب ذوق کے شاعر بھی

 ISBN: 978-93-344-4743-9

شامل ہیں) الگ رول ادا کرنا چاہتے تھے۔ انہیں نہ تو اپنے آپ کو عبور کر کے کسی عظیم الشان فلاحی اور اجتماعی نصب العین تک رسائی کا شوق تھا، نہ ہی وہ صرف اپنے باطن کے سیاح بننا چاہتے تھے۔ راشد اور میرا جی کی شاعری بھی ان کے لیے صرف راستے کا چراغ تھی، منزل نہیں۔ فکری، جمالیاتی، اخلاقی ہر سطح پر ان کے رویے ۱۹۲۰ء کے آس پاس پہلی جنگِ عظیم کے سائے میں رونما ہونے والی روایت کے ترجمانوں سے مماثل تھے۔ ان کے تجربے اور تخلیقی مقاصد اپنے آزادانہ انسانی عناصر کے ساتھ ساتھ ایک خاص سیاسی جہت بھی رکھتے تھے۔

یہ ایک پیچیدہ مگر اندیشوں سے بھری ہوئی صورت حال تھی اور اس کے دیانت دارانہ استدراک کے لیے غیر معمولی توازن اور احتیاط کی ضرورت تھی جن لکھنے والوں نے تخلیقی تجربے اور اس تجربے کی ارضی اور ٹھوس بنیادوں کے نازک رشتے اور ان کے باہمی تناسب کا لحاظ نہیں رکھا، انہیں ادب کی مملکت سے نکلتے اور صحافت کے حدود میں داخل ہوتے دیر نہیں لگی۔ وہ اس عہد کے عامیانہ اور سنسنی خیز واقعات کے بیان میں لگ گئے لیکن اصل مسئلہ ایک سمٹی سکڑی داخلیت کی طرح باہر کی دنیا کے درشت اور دہشت خیز اثرات سے بھی آزاد ہونے کا تھا۔ ادب، بہر حال تاریخ کا فٹ نوٹ نہیں ہوتا، ہر چند کہ اپنے زمانے کے روحانی مطالبات اسے مکمل طور پر بے لگام اور تاریخ کے تعاقب سے آزاد بھی نہیں ہونے دیتے البتہ روح عصر کی ترجمانی کرنے والے ادب کی قدر و قیمت کا انحصار محض اس بات پر نہیں ہوتا کہ اسے اپنی بنیادی غذا اپنے زمانے سے ملتی ہے۔ کھری اور سچی تخلیقی استعداد اس سے ماخوذ توانائی کے ذریعہ ہم پر حقیقت کی تعبیر کا ایک ایسا دروازہ بھی کھولتی ہے جو عامیانہ اظہار اور استدراک سے آگے کی چیز ہے۔ ادب کے ذریعہ ہم جس سچائی تک پہنچتے ہیں وہ (بقول کلاڈ لیوی اسٹراؤس) معنی کی مسلسل توسیع میں چھپی ہوتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جس ذہنی اور جذباتی پس منظر میں شعر و ادب کی نئی حسیت کو فروغ ملا اس کی پہچان انکار کے ایک مرکزی رویے سے ہوتی ہے۔ مسلمات سے انکار، خوش گمانیوں سے انکار، روایتی اسالیب کی تجدید سے انکار، گویا کہ نئے سرے سے اپنے فکری وسائل اور تخلیقی واسطے مہیا کرنے کی ایک مجبوری بھی تھی۔ نئے نئے لکھنے والوں کے لیے اپنے شخصی وژن میں ایک نئی اخلاقی معنویت پیدا کیے بغیر اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں تھا۔ سیاسی انقلاب پسندی کے تصور کو اس عہد میں ایک نئی سطح پر ابھرنے کا جو موقع ملا اس کی وجہ یہی تھی کہ چاروں طرف بکھری ہوئی حقیقتیں جیسی بھی تھیں ان میں آگے کے لیے ایک راستہ تو بنانا ہی تھا۔ اس لیے آزاد فکری کے میلان کو بھی اس عہد میں بڑے پیمانے پر قبولیت ملی۔ نئے لکھنے والوں کو یہ اندیشہ لاحق نہیں تھا کہ اپنی آزاد فکری کے نتیجے میں انہیں کوئی بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس کچھ ایسا تھا ہی نہیں جسے کھونے سے وہ ہراساں ہوتے۔ چنانچہ آزاد خیالی بجائے خود ایک اسلحہ یا مدافعت کا ایک ذریعہ بن گئی، یا ایک اخلاقی قدر اور اس احساس میں یقین بتدریج بڑھتا گیا کہ شخصی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہونے والا کوئی بھی نظام، ایک اخلاقی موقف کے بغیر اپنی معنویت قائم نہیں کر سکتا۔ آداں گارد ادب کے ایجنڈے میں جدیدیت کا مفہوم استوار ہی اس اخلاقی موقف کی اساس پر ہوتا ہے۔ یہ انداز نظر نہ تو سیاست کو شجر ممنوعہ بناتا ہے نہ ادب کی سماجی معنویت کے تصور کو مسترد کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عام انسانی صورت حال سے بے اطمینانی کے نتیجے میں رونما ہونے والی برہمی اور نئی فکر میں مستقبلیت کے ایک عنصر کی ناگزیری شمولیت کے بغیر نہ تو جدیدیت کے تصور کی تکمیل ہو سکتی تھی، نہ اس عہد کے سیاق میں ادب کے مجموعی رول کی۔ ان سوالات پر پیش پا افتادی اصولوں اور اصطلاحوں کے پھیر سے نکل کر، ایک نئی سطح پر، تفصیل کے ساتھ باتیں کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں بس چند اشارے کیے جا سکے۔ تنقید اور نظریہ سازی کے چلن نے ایسی گرد اڑائی کہ شاعری اور شعر کہنے والے پیچھے جا پڑے۔ جدیدیت کے سائے میں پروان چڑھنے والی شاعری کا سب سے افسوسناک پہلو، ہمارے خیال میں یہی ہے کہ جدید نظریات کے مقابلے اس کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سوچنا بھی شاید غلط نہیں کہ اب جو مابعد جدیدیت کا شور اٹھا ہے، وہ بھی دراصل جدیدیت کے اسی ایجنڈے کی بحالی ہے جسے بھلا دیا گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ انجانے میں ہوا یا جان بوجھ کر ایسا کیا گیا، یہ سوالات بھی بحث کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش کا جو تماشا ہمارے تجربے اور مشاہدے کا حصہ ہے، بہت سیدھا سادا نہیں ہے۔ اس کی جہتیں کثیر ہیں اور اس کی سطح صرف ایک نہیں ہے۔ ملکی سیاست سے بین الاقوامی سیاست تک، ہمارے اپنے معاشرے سے لے کر عالمی معاشرے کے حال احوال تک۔ اس مسئلے کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ نئے لکھنے والے ایک فیشن زدہ شعری اور ادبی کلچر کے بہاؤ میں گم ہو جانے والے تہذیبی، فکری، سیاسی حوالوں کے از سر نو استعمال سے اب جھجکتے نہیں۔ ایک بامعنی سطح پر اپنے عہد سے خود کو مربوط کرنے والی شاعری یا نئی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے رسمی ترقی پسندی، رسمی جدیدیت کی اصطلاحوں کو بڑی حد تک غیر ضروری بلکہ بے کار بنا دیا ہے یا کم سے کم اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ ان اصطلاحوں کے معنی پھر سے متعین کیے جائیں۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

رئیس احمد قتیلؔ کی شاعری میں جدید سماجی تصوّرات

ریسرچ اسکالر: شیخ سکندر شیخ ستار کھاٹک
شعبۂ اردو، چشتیہ کالج۔ خُلد آباد

دنیائے شاعری کا ایک ایسا روشن ستارہ جسکی چمک صرف دھولیہ ہی نہیں پورے خاندیش میں پھیلی ہوئی ہے۔ میری مُراد جناب رئیس احمد قتیلؔ سے ہے۔ جنکا جنم تعلیم یافتہ مگر اقتصادی طور پر انتہائی پچھڑے ہوئے گھرانے میں ۵؍مئی ۱۹۵۴؁ء میں ہوا۔ مالی حالات خراب ہونے کی وجہ سے ۱۹۶۸؁ء میں ساتویں کلاس تک کی پڑھائی مکمل کر کے نہایت ہی کم عمر میں ہی پاور لُوم چلانا سیکھا اور اسی کام میں بطورِ مزدور کام کرنے لگے۔ لیکن علم کی چاہت جو دل میں پنہا تھی وہ کہیں نہ کہیں جوش مار رہی تھی اور اسی کی بدولت ۶/۵ سال بعد پھر سے تعلیم کی طرف گامزن ہوئے اور مراٹھی میڈیم سے نائیٹ ہائی اسکول میں آٹھویں کلاس میں داخلہ لیا۔ اللہ کا کرم اس طرح ہوا کہ ۱۹۷۵؁ء میں دسویں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی تو ۱۹۷۷؁ء میں بارہویں اور ایسے ہی ۱۹۸۰؁ء میں بی۔اے۔ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ دن میں پاورلوم چلانا، رات میں پڑھائی کرنا نہایت ہی مشکل کام تھا لیکن کہتے ہے نہ جہاں محنت اور صبر ہوتا ہے وہاں اللہ کا کرم بھی ضرور ہوتا ہے۔ اسی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کی آپ نے ۱۹۸۲/۸۳؁ء میں بی ایڈ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرلی اور نان گرانڈ اے۔ٹی۔ٹی۔ ہائی اسکول کاسودہ، ضلع۔ جلگاؤں میں ڈھائی سال تک ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائض رہے۔ بنیادی تعلیم اردو سے ہوئی تھی اس پر شاعری کا ذوق انھیں ہر وقت بیقرار رکھّے ہوئے تھا کہ اسی شاعری کے عشق نے انھیں بی۔ایڈ کی پوسٹ چھوڑا کر دی۔ ایڈ کی پوسٹ پر کام کرنے کیلئے کاسودہ سے اپنے ہی شہر دھولیہ میں بُلا لیا۔ ۱۹۸۶؁ء میں پھر ایک بار اس عہدے سے استعفٰی دیکر دھولیہ شہر میں ہی اینگلو اردو ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لی اور وہی ۲۰۱۲؁ء میں سبکدوش ہوئے۔

کبھی گُل اور کبھی کانٹا لگے ہے
وہ اِنساں ہے مگر کیا کیا لگے ہے
کسی بھی زاویے سے اِس کو دیکھو
رئیس احمد قتیلؔ اپنا لگے ہے

(شہکار۔ص۔۶۲،۶۳)

اردو زبان سے محبت اور اردوداں لوگوں میں رہتے ہوئے بھی جناب رئیس قتیلؔ نے دھولیہ شہر کی ''سرودھرم سنبھاؤ'' سنستھا میں جو مراٹھی، ہندی اور اہیرانی زبان پر منحصر ہر مہینے کے آخری اتوار کو شاعری کا پروگرام منعقد کرتی ہے اس میں بطورِ ہندی شاعر آج تک حصّہ لے رہے ہے۔ جس کی وجہ سے موصوف کی ۳؍کتابیں ہندی زبان میں شائع ہوسکیں۔ رئیس قتیلؔ کو شاعری کی دنیا میں سفر کرتے ہوئے قریب ۵۰؍برس ہوگئے ہیں لیکن آج بھی موصوف کے کلام میں وہی تازگی وشگوفتگی پائی جاتی ہے۔

زباں تک آپ اپنے وصف کو لایا نہیں کرتا
سمندر ہوں میں اپنا ظرف دِکھلایا نہیں کرتا
بخیل اِنسان ہے، بے فیض سا اُس پیڑ کی صورت
پرائے چھوڑیئے ، اپنوں پہ جو سایا نہیں کرتا

(شہکار۔ص۔۲۸)

رئیس احمد قتیلؔ کے آج تک ۲۳؍مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی فہرست کچھ اس طرح سے ہیں۔

ا۔سنگم غزلوں کا مجموعہ ۱۹۸۷؁ء

 ISBN: 978-93-344-4743-9

۲۔	انوارِرسالت	نعتِ پاک کا مجموعہ	۱۹۹۰ء
۳۔	سوچ کی لہریں	غزلوں کا مجموعہ	۱۹۹۴ء
۴۔	جھرنے	گیتوں کا مجموعہ (طلبہ کیلئے)	۱۹۹۵ء
۵۔	پیاسا ساگر	ہندی غزلوں کا مجموعہ	۱۹۹۷ء
۶۔	حدیقۂ نعت	نعتِ پاک کا مجموعہ	۲۰۰۴ء
۷۔	میرا چاند	ہندی غزلوں کا مجموعہ	۲۰۰۸ء
۸۔	مشاہدات	نظموں کا مجموعہ	۲۰۰۸ء
۹۔	نذرِ غالبؔ	غالبؔ کی تمام زمینوں میں غزلیں	۲۰۱۰ء
۱۰۔	ترنگا	قومی گیتوں کا مجموعہ	۲۰۱۱ء
۱۱۔	نایاب	نعت اور غزل کا مشترکہ مجموعہ	۲۰۱۱ء
۱۲۔	راشٹریتا	ہندی قومی نظمیں	۲۰۱۲ء
۱۳۔	رنگارنگ ہزلیں	ہزلوں کا مجموعہ	۲۰۱۴ء
۱۴۔	آسمان	غزلوں کا مجموعہ	۲۰۱۵ء
۱۵۔	گلدان	بچّوں کے لئے نظمیں	۲۰۱۵ء
۱۶۔	ترانۂ محمّدی	بچوں کیلئے نعتِ پاک	۲۰۱۶ء
۱۷۔	شہکار	غزلوں کا مجموعہ	۲۰۱۷ء
۱۸۔	برگِ نیم	غزلوں کا مجموعہ	۲۰۱۸ء
۱۹۔	دیارِ نبی ﷺ	نعتِ پاک کا مجموعہ	۲۰۱۹ء
۲۰۔	عظمتِ حُسین	سلام کا مجموعہ	۲۰۱۹ء
۲۱۔	مہکتے ایّام	نظموں کا مجموعہ	۲۰۲۰ء
۲۲۔	سمندر	قطعات کا مجموعہ	۲۰۲۱ء
۲۳۔	کہکشاں	نظموں کا مجموعہ	۲۰۲۱ء

رئیسؔ قتیلؔ نے اب تک سیکڑوں ہندی اور اردو شاعری کے مقابلوں میں حصّہ لیا ہے۔ جس میں تقریباً ۸۰% کامیاب رہے اور انعامات سے نوازے گئے۔ یہ مقابلے 'نعتوں'' 'غزلوں'' 'ہزلوں' اور' گیتوں' پر مشتمل رہے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے آپ کے اتنے سارے مجموعہ کلام منظرِ عام پر آسکے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ایک اسکول کے ٹیچر ہونے کی وجہ سے بہت سے گیت اور نظمیں بچّوں کے لئے بچّوں کی محبّت میں بچّوں کی فرمائشوں پر لکھتے رہے۔ اور اس طرح بچّوں کے لئے زیادہ ادب تخلیق ہوتا رہا۔ جس کی بدولت بچّوں کے لئے آپ کی ۵ ر کتابیں شائع ہوئیں۔ آپ نے ان کتابوں سے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم' بھائی چارے' بلند حوصلوں اور مذہب و وطن سے پیار کرنے کی تلقین کی ہیں۔ اپنے بڑوں کا ادب اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی ہے۔ آپ نے اسکول کے بچّوں کے لئے کئی ڈرامے بھی لکھے اور تقریریں بھی۔ جنھیں انعامات سے نوازہ گیا۔ کئی شعراء وادبا کی کتابوں پر آپ نے تبصرے بھی لکھے۔ اسکولی اور دیگر کئی تقریری اور شاعری کے مقابلوں میں آپ کو بحیثیتِ جج مقرر کیا گیا۔

علم سے ہر اِک کا دامن بھر دِیا
کنکروں کو جِس نے گوہر کردیا

ISBN: 978-93-344-4743-9

وہ مُدرّس کے علاوہ کون ہے
جس نے قطرے کو سمندر کر دیا

(مہکتے ایّام۔ٹیچرس ڈے(۲)۔ص۔۹۸،۹۹)

رئیس قتیل کہتے ہیں کہ ''شاعری صرف خیالی نہیں ہوتی بلکہ وقت اور سماج کی ضرورت کے تحت لکھی جاتی ہے۔کیونکہ کوئی بھی چیز اپنے اندر مقصدیت نہیں رکھتی یا سماج کے لئے کار آمد نہیں ہوتی اس چیز کو زمانے میں کوئی اہمیت نہیں ملتی۔شاعری بھی ایک ایسی ہی شئے ہے۔اگر اسے صرف خیالوں تک محدود رکھا جائے یا وقت گزاری کے لئے لکھا جائے تو بہت جلد نابود ہوجاتی ہے۔'' اور یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی سبھی کتابوں میں انکی شاعرانہ تخلیق کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد نظر آتا ہے۔''ترنگا'' اور ''راشٹریتا'' نامی دونوں کتابوں کے مطالعے سے ان کے سرو دھرم سمبھاؤ اور سماج اور اپنی قوم میں بھائی چارے کے مقصد کا پتہ چلتا ہے۔اپنے دیش کے مستقبل کے لئے اور اپنے دیس واسیوں کے لئے کیا کیا کیا جا سکتا ہے۔ایسے جذبات نمایاں ہوتے ہیں۔

آؤ ہم جگ کو بتائیں کیا ہے الفت کی کشش
ختم کر دیں جو چھپی ہے دِل میں نفرت کی خلِش
ختم کرنی ہے زمانے سے تعصب کی تپِش
ختم کرنی ہے زمانے سے تشدّد کی روِش
آؤ مِل کر پیار کا وہ دیپ ہم روشن کریں

(عالمی یومِ عدم تشدّد۔۲ اکتوبر۔ص۔۱۱۷ تا ۱۱۹)

جب میں نے اُن سے سماجی معاملات کی بات کی تو بتاتے ہیں'' آدمی ایک سماجی جانور ہے۔وہ سماج سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔یہ بات الگ ہے کہ کچھ لوگ سماج میں ایکدم سے مِل جاتے ہیں جبکہ کچھ لوگوں کا سماج سے وقتی تعلق رہتا ہے۔وہ اکثر سماج میں رہتے ہوئے بھی سماج سے کٹ کر رہتے ہیں۔لیکن ایک شاعر ہمیشہ سماج سے جُڑ کر رہتا ہے وہ سماج سے کٹ کر رہ ہی نہیں سکتا۔کیونکہ سماج میں ہونے والی تبدیلیاں اور روز بروز ہونے والی نئی نئی ہلچل شاعر کو کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔

دیکھنا دریاں کے جیسے بن جائیں گے
جب اِک پانی کے قطرے بن جائیں گے
کیا ہوگا تاریخ بدلنے سے بتلا
کیا اِس سے کنکر ہیرے بن جائیں گے

(برگِ نیم۔ص۔۷۹)

بطورِ ٹیچر طلبہ اور ان کے والدین سے آپ کے نزدیکی تعلقات رہے ہیں۔اسی لئے تو سماج کو صحیح سمت کی طرف چلانا آپ کا ہمیشہ سے کام رہا ہے۔جس بات کی تصدیق آپ کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے۔ایک انسان کا دوسرے انسان سے کیا رشتہ ہے،ایک قوم دوسری قوم سے کیسا تعلق چاہتی ہے۔پڑوسی کا پڑوسی پر کیا حق ہے۔سماج میں جب بھی آپ نے کوئی بگاڑ دیکھا ہے تو اُس کو سدھارنے کے لئے اپنی شاعری کا استعمال کیا ہے۔ایسی ان گنت سماج سدھارک کی شاعری آپ کے مجموعوں میں ملتی ہیں۔

ہر آن پیار کا برتاؤ اِن کے ساتھ رکھّو
وہ آسمان سے نیچے اُتر بھی سکتے ہیں
یہ شرط ہے کہ نصیحت بصد خُلوص کرو
بگڑ چکے ہیں جو بچّے سنور بھی سکتے ہیں

(سمندر۔ص۔۳۹)

ISBN: 978-93-344-4743-9

اس لئے قتیلؔ بڑی خوشی سے کہتے ہیں'' کہ میں نے میری ساری تخلیقات کا مواد اِسی سماج سے حاصل کیا ہے۔'' وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ'' میں کوئی سماج سدھارک نہیں ہوں مگر یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں سماج میں نظر آنے والی برائیوں کو دور کر کے اس کی جگہ بھلائی کو قائم کرسکو۔ اس بات کی بھی کئی مثالیں ان کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عیب و ہنر کا فرق سمجھتا نہیں تجھے
دورِ جدید تیری بصارت کہاں گئی
کیوں کنکروں کی مدح سرائی میں مست ہے
گوہر شناس تیری لیاقت کہاں گئی

(سمندر۔ص۔۵۶)

جب ان سے میں نے شاعری کی بات کی تو کہتے ہیں۔'' شاعری زندگی کا عکس ہے۔ شاعر سماجی اور ذاتی تجربات کو اپنی شاعری میں پروتا ہے۔ اردو شاعری میں غزل کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ روایتی اور ترقّی یافتہ ادوار سے گزر کر غزل سماج کی حقیقتوں کو بیان کرتی ہے۔ آج کا شاعر عشق و محبت کے نغمے نہیں گا تا بلکہ سماج اور عام زندگی کے واقعات و حادثات کو اپنی غزل و شاعری کا موضوع بناتا ہے۔'' ان کی شاعری میں یہ خصوصیات ان کے مجموعہ کلام'' سنگم''' سوچ کی لہریں'' '' آسمان'' '' شہکار' اور برگِ نیم میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جس میں حالات کی عکاسّی نظر آتی ہے' تو کہیں تلخ حقائق بھرے زندگی کے تجربات نظر آتے ہیں۔ تو کہیں سماج کی ان برائیوں پر طنز کے نشتر دکھائی دیتے ہیں۔

اپنی ساری زندگی کا تجربہ رکھ دے گا وہ
سامنے کچھ اس طرح سے فیصلہ رکھ دے گا وہ
درد سر ہوگا نہ پھر ہوگی پریشانی کوئی
مسئلوں کے درمیاں جب روپیہ رکھ دے گا وہ

(سمندر۔ص۔۴۳)

ویسے تو موصوف کی ہزاروں خصوصیات موجود ہیں جن کی سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان کے کلام اور مجموعوں کی علاقۂ خاندیش میں اپنی الگ شناخت ہیں لیکن میں آخر میں ایک بات نہایت ہی قابل قبول مثال پیش کرنا چاہونگا کہ ان کی ایک تصنیف بنام'' نذرِ غالبؔ'' بہت ہی اہمیت کی حامل تصنیف ہے۔ اِس قسم کی کتاب لکھنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں مرزاء غالبؔ کے دیوان'' دیوانِ غالب'' کی ۲۳۵ غزلوں کی پیروڈی رئیس قتیلؔ نے نہایت ہی آسانی سے قلم بند کیں ہیں۔'' نذرِ غالبؔ''، میں غالبؔ کی لکھی گئی غزلوں کی زمین میں سبھی غزلوں کو لکھا گیا ہیں۔ وہ خود اپنی شاعری میں اپنے آپ کو کچھ اس طرح متعارف کرواتے ہے۔

اِسی باعث مرا کردار مہکتا ہے قتیلؔ
میرے ہاتھوں میں گلابوں کے سِوا کچھ بھی نہیں
ساحرؔ و غالبؔ و اِقبالؔ ہیں میرے ہمراز میرا
سرمایہ کِتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

(سمندر۔ص۔۴۸)

ان سب کے علاوہ' سلام'' منقبت'' '' قطعات' پر بھی رئیس قتیلؔ کے مجموعہ کلام چھپ چُکے ہیں۔ بہت ساری مقامی شخصیات پر بھی آپ نے نظمیں لکھیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ آپ نے کئی ہزلیں بھی لکھیں ہیں جن کا مجموعہ کلام بھی منظر عام پر'' رنگا رنگ ہزلیں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایسے اَنگنت کارنامے موصوف کی قابلیت سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے شاید اصلاح البنات گرلز ہائی اسکول و جونیئر کالج' دھولیہ کے پرنسپل'' شمس الحسن سر''رئیس احمد قتیلؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ'' ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا تجربہ ہر طرف جھانکتا ہوا جان پڑتا ہے۔ انہیں آج کے ماحول نے جو دِیا ہے۔ انہوں نے اسے اشعار میں ڈھال کر قارئین اور سامعین کے سامنے رکھ دیا ہے۔''

☆☆☆

اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کی عکاسی

شیخ شبانہ بانو محمد الیاس (پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر)

انیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ تہذیبی زوال سے عبارت ہے اس ادب میں جو ادب لکھا جانا چاہیے تھا وہ ادب یقیناً فرسودہ تہذیب وتمدن، مفلسی، جہالت اور غلامی سے نبرد آزمائی کا نہ صرف عکاس ہوتا بلکہ درد وکرب سے نجات پانے کا راستہ بھی بتلانے والا ہوتا یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب کے زیر اثر جو ادب تخلیق پایا وہ نہ صرف اپنے عہد کا عکاس رہا بلکہ اس نے وہ تمام عوامی مسائل اور مستقبل سے بھی روشناس کراتا رہا ہے اس ادب نے مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور ذکر کیا اور سائنسی اقلیت پسندی کی نیو رکھی ۔ ۱۹۳۶ء میں بڑے تفصیلی طور پر باضابطہ لائحہ عمل تیار ہوا، میں تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف مختصراً انداز میں اپنی بات سمٹنے کی کوشش کرونگی کہ اس تحریک کے زیر اہتمام ایسا ادب تخلیق کیا جانے لگا جس کا مقصد اور معرف صرف اور صرف تنقید حیات تھا جو راست مجھ سے آپ سے اور ہم سے نہ صرف مخاطب تھا بلکہ ہمارے مسائل اور ان کے حال کا خواہاں بھی ۔ جسے ابتداء میں نئے ادب کی تحریک اور بعد میں ترقی پسند تحریک کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اس کی ابتداء کرنے والوں میں بعض ایسے نوجوان تھے جو انگلستان میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے ان میں سجاد ظہیر، ملک راجا آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ نے لندن کے نا کنگ ریستورانت میں بیٹھ کر اس خاکہ مرتب کیا اور اس کے بعد ایک مینی فیسٹو تیار کیا گیا ۔ ترقی پسند نے اپنے اعلان نامے میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ:

> ''ہماری انجمن کا مقصد یہ ھیکہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جد وجہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائی جائے ۔ جس کے لیئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے ۔ ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین قدروں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لیے زندگی کے جس شعبے میں ردّعمل کے آثار پائیں گے انہیں افشاں کریں گے ہم انجمن کے ذریعہ ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذب وتمدن سے فائدہ اٹھائیں گے ۔ ۔'' (بحوالہ گفتگو سہ ماہی ۔ ترقی پسند ادب نمبر)

اس ضمن میں سجاد ظہیر نے کہا تھا کہ:

> ''ہم اعلانیہ اور دانستہ طور پر ترقی پسند تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی سے جوڑنا چاہتے تھے کہ ترقی پسند دانشور، مزدوروں اور غریب کسانوں اور مظلوم عوام سے ملیں اور ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں ۔ انکے جلسے اور جلوسوں میں جائیں اور انھیں اپنے جلسوں اور کانفریسوں میں بلائیں اسی لئے ہم اپنی تنظیم میں اس بات پر زور دینا چاہتے تھے کہ دانشوروں کے لئے ادبی تخلیق کے ساتھ عوامی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قریبی ضروری ہے ۔'' (بحوالہ گفتگو سہ ماہی ۱۹۷۶ء صفحہ نمبر ۔ ۱۹ ، ۲۰)

۲

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کا قیام ایک عہد ساز واقعہ تھا جو علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری بڑی ادبی تحریک تھی ۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ھیکہ ترقی پسندی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا جس کی پہلی کانفرس لکھنو میں منشی پریم چند کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی یہ تحریک بڑی تیزی سے پھیلنے لگی ۔ طویل بحث میں نہ جاتے ہوئے اسکو مختصر کر دیا گیا ۔ چونکہ اردو میں یہ تحریک ایک خاص منشور کے تحت شروع کی گئی تھی اور پھر اسے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کی حمایت حاصل تھی اس پہلی کانفرس کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پریم چند جیسے معروف ادیب نے اس کی صدارت کی ۔ جن کا تاریخی خطبہ نے سماجی سروکار اور ادیب کی سماجی ذمہ داریوں کے احساس کو نا صرف اجاگر کیا بلکہ یہ بے حد متاثر کن ثابت ہوا ۔

> ''حضرات یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے ہمارے سمیتیوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر ہر زبان کی اشاعت سے بحث کی جاتی تھی یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اسکا منشا خیالات وجذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ زبان کی تعمیر تھا وہ بھی نہایت ہی

ISBN: 978-93-344-4743-9

اہم کام تھا۔‘‘

ادب کی افادیت سے متعلق وہ مزید کہتے ہیں۔

’’مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہیکہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کوبھی افادیت کی میزان پرتولتا ہوں بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہےاور وہ ہماری روحانی مسّرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو مسّرت خود ایک افادی شئے ہے۔‘‘

(بحوالہ عکس ادب، سہ ماہی۔اورنگ آباد، جولائی ۲۰۱۳ تا ستمبر ۲۰۱۳۔ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ۔پروفیسر ڈاکڑ ایم.اقبال۔مالیگاؤں)

ترقی پسند تحریک کے خاص مقاصد اسطرح سے تھے۔

۱) تمام ہندوستانیوں کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشورتی جلسے کر کے اورلٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

۲) ترقی پزیر مضامین لکھنے والوں اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کوشش کرنا۔

۳) ترقی پزیر مصنفین کی مدد کرنا۔

۴) آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت کی کوشیش کرنا۔ (بحوالہ اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ۔ڈاکڑ منظر اعظمی)

ہندوستان میں اس کی پیش قدمی میں سب سے اہم لوگوں میں پریم چند جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، اور ساغر نظامی وغیرہ تمام لوگوں نے سجاد ظہیر کی حوصلہ افزائی کی اور شعرا ئیا کرام میں فیض، مخدوم محی الدین، ساحرلدھیانوی، مجاز، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، ظہیر، سعید فرید آبادی، اسرالحق مجاز، اختر انصاری، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، شاد عارفی، پرویز شاہدی، عزیز حامد مدنی، قتیل شفائی، کاشمیری، کیفی اعظمی، منیب الرحمٰن، شور علیگ، سلام مچھلی شہری، اختر الایمان، جذبی، صفدر میر، فارغ بخاری ادا جعفری وغیرہ نمایاں نام ہیں۔اس تحریک کے زیراثر ان تمام شعراء کے یہاں بھی تنوع اور تجربہ کی کمی نہیں، جو اس تحریک کے یہاں انقلاب کی گھن گرج اور بحران کا نام ہے تو سردار جعفری نے اسے مزدور کا نعرہ بنادیا۔مخدوم محی الدین انقلابی اور تلنگانہ میں کسانوں کے اتحاد اور انقلابی جدوجہد کا قائد تھا۔اس لئے ان کے تہی زندگی ایک سچے انقلابی آنکھ سے دیکھی جاتی ہے۔

۳

مجاز نے آنچل کو پرچم بنانے کی تلقین کی اور غم حیات کے ساتھ ساتھ غم دل کو شعری پیکر عطا کیا۔اس طرح جاں نثار اختر اور اختر الایمان اور جذبی کے یہاں جذبہ کی گھٹن اور ترجیح پا کر شعری ادب اختیار کرتی ہے تو شاد عارضی کے ہمہ گیر طنز نے تمام زندگی کو اپنے تہی محیط کرلیا۔ساحر کی شہرت میں تاج محل کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے وہ بھی انقلاب پسند ہے اور آرائشوں سے معاشرہ کو پاک دیکھنے کے متمنی تھے۔ظہیر کاشمیری اور مختار صدیقی نے شعری آہنگ میں بعض بہت اچھے تجربات کیے فیض، ندیم اور عارف متین تینوں ایسے شاعر ہیں جنھوں نے جوش وخروش اور گھن گرج سے بچکر اپنی شاعری کا آغاز کیا۔(بحوالہ اردو ادب کی مختصر تاریخ۔سلیم اختر)

ترقی پسندوں پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے مواد پر اسلوب کو قربان کر دیا۔لیکن ان تینوں کی شاعری اس کی نفی کرتی ہے ۔ بلکہ فیض نے تو بعض اوقات اچھی خاصی اور منفرد شاعری کی۔ان کے یہاں انقلاب کے عملی پہلو کم اور تصور سے زیادہ دلچسپی ملتی ہے۔یہ ایک نفاست پسند انسان کا انقلاب ہے۔تخیل اور جذبے کی فنکارانہ ہم آہنگی اور اس کے خوبصورت اظہار ندیم کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔ندیم کی سادگی نے صداقت اور جذبات سے جنم لیا۔عارف متین کے لئے ترقی پسندی ایک آدرش ہے۔اس لئے انھوں نے بعض لوگوں کی طرح نظریہ فروشی نہ کی۔ان کے یہاں ترقی پسندی کا فلسفہ جذبہ کی بھٹی سے کندن بن کر نکلتا ہے۔

اس کے علاوہ نثری صنف میں افسانہ نگاروں میں احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ ’’شعلے‘‘ سجاد ظہیر کا لندن کی ایک رات، رشید جہاں، محمود الظفر کے افسانے شمارہ ’’انگارے‘‘ میں شائع ہوئے۔کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ طلسم خیال، مجاز کی آہنگ اور حیات اللہ انصاری کے افسانے انوکھی مصیبت ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

افسانہ نگاروں میں سے بیشتر کا فن پریم چند کے ان ہی خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، بلونت سنگھ، مہندر ناتھ، حمید اختر، کرشن چند نے کشمیر کے خوبصورت عبارت میں تذکرہ سے آغاز کیا مگر بعد ازاں ہندوستان کے ہر خطے کے مسائل کے لئے اپنا قلم وقف کر دیا اور اب تو ان کی

سوچ دیگر اقوام کے لئے بھی ہے۔منٹو اور عصمت کے حصہ میں جنسی کی بدنامی آئی جس کے نتیجہ میں ان کی اچھی کہانیاں مقدمات کی سنسنی میں دب گئیں۔

جب کہ ندیم نے گاؤں کے پس منظر میں انسانی کے ان المیوں کو اجاگر کیا جن کا تعلق جزباتی ناآسودگیوں سے کم اور معاشی عدم مساوات سے زیادہ ہے۔بلونت سنگھ نے سکھوں کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔مرزا ادیب نے انسان دوستی کو اپنا مسلک قرار دیا۔بیدی کی سب سے بڑی خصوصیت تکنیک اور جزئیات نگاری قرار دی جاسکتی ہے۔تشکیل وتعمیر کے لحاظ سے ان کی کہانیاں لاجواب ہیں۔افسانہ نگاروں کی یہ فہرست نامکمل ہے اور ان میں سے چند پر تبصرہ اور قطعی طور پر نا کافی ہے لیکن اس سے ترقی پسند افسانہ کے موضوعات میں تنوع اور گہرائی کا اندازہ یقیناً لگایا ہے۔

(بحوالہ اردو ادب کی مختصر تاریخ۔سلیم اختر)

ترقی پسند افسانہ میں جدت وتنوع کی لاتعداد مثالوں کے تناظر میں اگر ترقی پسند ناول کا جائزہ اس وقت جب ان کا مطالعہ ''غیر ترقی پسند'' تحریر کے طور پر ہو،لیکن ترقی پسندوں کے مخصوص ادبی مقاصد،انجمن کے منشور اور پریم چند کے ناولوں کی روشنی میں ترقی پسند ناول کا مطالعہ کریں تو ناامیدی ہوتی ہے۔شاید اس کی وجہ ہو کہ افسانہ میں زندگی کی ایک جھلک باآسانی دکھائی جاسکتی ہے۔لیکن ناول کا وسیع کینوس زندگی کے جس وسیع مطالعہ اور فنی خواص کا متقاضی ہے وہ شاید ان کے بس کا روگ نہ تھا۔البتہ غیر ملکی اور بالخصوص روسی ناولوں کے تراجم سے اردو ادب کا دامن مالا مال کیا گیا۔

۴

ترقی پسند تحریک نے خاکہ نگاری رپورتاژ ایجاد تو کم کئے لیکن ان میں قابل قدر تحریروں سے انہیں دقیع ضرور کیا۔خصوصیت سے خاکہ نگاری کا تو انداز ہی بدل کر رکھ دیا گیا۔پہلی مرتبہ شخصیت کی انسانی خوبیوں اور خامیوں کو فنکارانہ بصیرت سے اجاگر کیا گیا اور نہ اب تک تو شخصیت نگاری قصیدہ در مدح قسم کی چیز ہی تھی۔چنانچہ عصمت کا ''دوزخی'' منٹو کے ''گنجے فرشتے'' اس سلسلہ میں نمایاں مثال ہیں۔احمد بشیر نے بعض بہت اچھے خاکے لکھے لیکن تواتر سے نہ لکھے اس لئے وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جس کے یہ مستحق تھے۔رپورتاژ کو مقبول بنانے میں کرشن چندر،عصمت،ابراہیم جلیس سجاد ظہیر وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔فسادات اور تقسیم ملک کے موضوع پر بھی بعض بہت اچھے رپورتاژ لکھے گئے۔

(بحوالہ ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر) قمر رئیس۔سید عاشور کاظمی)

ابتداء میں بعض لوگوں کا نظر یہ رجحان اور اس تحریک کے تہی یہ تھا کہ کسی نہ کسی جہت سے باغی ہونے کا مدعی اور نئی راہوں کی تلاش ہو اور بعض لوگ سیاسی اور سماجی نظام سے باغی تھے تو کچھ لوگ اخلاقی قدروں سے بیزار اور کچھ زنگ خوردہ ادبی اقدار اور اسالیب سے بیزار تھے۔یہ سب میدانات کبھی ایک ادیب یا شاعر کے بیان یکجا طور پر کبھی الگ اور کبھی ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گڈمڈ دکھائی دیئے۔لیکن بہت جلد ترقی پسند تحریک نے سیاسی بغاوت اور اشتراکیت وعوامی انقلاب کو اپنا نصب العین بنالیا اور اجتماعی فکر اور مسائل کو انفرادی تجربوں پر فوقیت دی تھی مگر ایک بات ترقی پسند ادب کے ساتھ یہ ہوئی کہ قدامت پسندوں اور روایتی انداز رکھنے والوں کے برخلاف نوجوانوں نے اس کا اثر قبول کیا۔اور اس دور کے نوجوانوں کا ذہنی اضطراب اور نئی اقدار کی جستجو کا کرب بڑھتا گیا۔اور اس نئے ادبی تجربوں کے لئے مناسب وقت درکار کرتا رہا۔چنانچہ ترقی پسند ادب کے نام سے جب ادب میں روایت سے بغاوت ہوئی اور نئی دنیا کا خواب دیکھنے اور فرسودہ روایات کو بدلنے کا راستہ ہموار ہوتا گیا۔اور پوری فضاء پر نیا ادب یعنی ترقی پسند ادب اردو زباں میں ایک سیلاب کی طرح آگے بڑھتا گیا۔ویسے تو ترقی پسند ادب کا نقطۂ آغاز فرسودہ اقدار سے بغاوت اور نئی اقدار کی جستجو اور نئے ادب سے روشناس کرانا تھا۔اس طرح ترقی پسند ادب جن باتوں پر میسر تھا اس میں شاعری کے لئے وضاحت۔صراحت،عوامی اپیل اور مانوس سانچوں کا استعمال ہونے لگا۔اس لئے شعراء سیاسی اور سماجی سطح پر فرسودہ اقدار سے بغاوت کر کے ترقی پسند ادب سے علاحیدگی اختیار کر لی۔

حلقۂ ارباب ذوق میراجی کی قیادت میں لاہور میں ایک نئی جماعت وجود میں آئی تھی۔ان دو طرح کی جماعتوں کے بٹ جانے کی وجہ سے ترقی پسند تحریک میں ایسے ہی شاعر رہ گئے جو اس تحریک کے سیاسی اثرات کو قبول کرنے کے باوجود اس کے ادبی رجحانات سے متاثر نہ ہوئے۔بعض شعراء کی نظموں پر انگریزی کے جدید شعراء کا اثر تھا اور اس ترقی پسندوں کی اکثریت نے نظم نگاری کو اپنے کے لئے سب سے زیادہ پسند کیا۔اور جس کی پیروی جوش ملیح آبادی کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ مجازؔ، جاں نثار اخترؔ، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین شامل تھے۔جنھوں نے آزاد نظم لکھنے کی جراءت کی۔جوش ملیح آبادی کے زیر اثر کہا جاتا ہے کہ تمام شعراء اکرام نے نقصان بھی اٹھایا۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا سنہرا دور تھا۔جو ساری زبانوں پر محیط تھی اور اس نے ادب کا بہت بڑا ذخیرہ پیش کیا یہ ہندوستان کی اتنی

زبردست تہذیبی تحریک تھی۔ ہماری تحریک سے آزادی کی گہری وابستگی تھی اور ''ترقی پسند'' کا باعث افتخار لکھا ہے۔ کیونکہ ترقی پسندوں کا مقصد جو کچھ بھی رہا ہو۔ پچھلے گزشتہ سالوں میں موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے جتنے کامیاب نئے اور مفید تجربے ہوئے اتنے تاریخ میں کہیں نہیں ہوئے۔ غرض اس تحریک نے اردو ادب کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہے۔

۵

مہندر ناتھ نے لکھا کہ ترقی پسندوں نے پڑھا اور اس ضمن میں انھوں نے اپنی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''آج ترقی پسند ہونا ایک اعزاز ہے لیکن اس زمانے میں ترقی پسند ہونا ایک عذاب تھا۔ مذہب پرست لوگ ترقی پسندی کو لادینوں کی داشتہ مانتے تھے اور برسر اقتدار لوگ ترقی پسندوں کو روس کا گماشتہ گردانتے تھے۔'' (بحوالہ مہندر ناتھ نمبر۔ آپ بیتی)

چنانچہ یہ بات بھی درج کی جاسکتی تھی کہ ادب کو عوام سے قریب لے آئیں گے اور ادب کو زندگی کا عکاس اور مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بنائیں گے دراصل اس تحریک کا منسلک ہی اشتراکی اور عوامی انقلاب تھا اگر چہ کہ اس تحریک نے اپنا رشتہ ملک کی آزادی کی جدو جہد اور جمہوریت سے جوڑا مگر بہت جلد یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ اس تحریک کا اصل مقصد اشتراکی انقلاب تھا اور یہ ادب سے زیادہ اشتراکیت نقیب بن گئی۔ ترقی پسندی کا اصل سرچشمہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ اشتراکیت یا سوشلزم تھا۔ اس بات کو ابتداء میں ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کا کھل کر اظہار کیا گیا۔ اس ضمن میں احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستانی ترقی پسند تحریک اشتراکیت کے اصولوں کے پرچار میں فاشزم کے خلاف تمدنی اور ادبی محاذ قائم کرنے کی تحریک کا ایک حصہ ہے اسے ان تحریکوں کے جزو کی حیثیت سے سمجھنا چاہئے''۔

اس کے بنیادی مقصد یعنی سوشلزم نے ہی ترقی پسندی کی گئی ضمنی بنیادیں فراہم کی ہیں۔ اسی لئے کہ اشتراکی سیاست اور تصور ادب کے زیر سایہ ہی پروان چڑھے۔ ان حالات کے پیش نظر اگر ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک نے اپنے مقاصد کے حصول میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئیں اور ادب پر اس کے اثرات نمایاں یقیناً دوررس ثابت ہوئی۔ شاعری سے لیکر افسانہ، ناول، تنقید ہر شعبۂ ادب میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، سیّد احتشام حسین، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، دیوندر ستیارتھی، بلونت سنگھ وغیرہ افسانہ نگاروں نے اہم کام انجام دیا۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانہ موضوع وادا فکر وفن کے لحاظ سے جسکی ہمہ جہت ترقی ہوئی جن افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام کرشن چندر، سعادت حسن منٹو۔ راجندر سنگھ بیدی اگر چہ کے راہ راست اس ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن ان کا نام اس دور کے تین اہم افسانہ نگاروں کے ساتھ لیا جاتا ہے جن میں عصمت چغتائی وغیرہ ہے۔ حیات اللہ انصاری اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اس تحریک کو اپنے افسانوں کے ذریعہ مضبوط بنایا۔ جن میں انوکھی مصیبت، کالا دیو، ماں بیٹا، بارہ برس کے بعد شکر گزار آنکھیں اور آخری کوشش شامل ہیں ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ پریم چند افسانہ ''کفن'' وغیرہ۔

خواجہ احمد عباس جو ایک فلمی کہانی کار اور محاضی حیثیت سے ان کی اہم خدمات ہیں۔ ٹڈی، بھولی، سونے کی چار چوڑیاں اور سردار جی وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔ اس کے بعد احمد ندیم قامتی نے بھی اس تحریک کے بےلوث خدمات انجام دی۔ ان کے افسانے ہیرو مسیحا کے بعد الحمد اللہ۔ کفن دفن اور رئیس خانہ شامل ہیں۔ دیوندر ستیارتھی کا بھی ترقی پسند افسانے میں اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ میں ہوں خانہ بدوش، پہلا افسانوی مجموعہ ہیں۔ دیا جلے ساری رات، کوبتا سسرال نہیں جائے گی اور جنگلی کبوتر وغیرہ اہم ہیں۔ اسی طرح تنقید نگاروں میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، سیّد احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم،

۶

اختر انصاری، عزیز احمد، مختار حسین، سردار جعفری وغیرہ نے بڑھ چڑھ کر اس تحریک میں حصّہ لیا۔ ترقی پسند ناول نگاروں نے ناول کو بدلتی ہوئی زندگی کا عکاس وترجمان بنایا۔ وقت کے ابھرتے ہوئے مسائل نے ناولوں میں جگہ پائی۔ سجاد ظہیر کا ناولٹ لندن کی ایک رات عصمت چغتائی۔ مندی، ٹیڑھی کھیر، عصمت نے عورتوں کی بےبسی اور مظلومی کو کئی موثر تصویر میں پیش کی ہیں کرشن چندر نے شکست، جب کھیت جاگے، طوفان کی کلیاں اور دل کی وادیاں سوگئیں لکھیں۔ ہندو مسلم فسادات اور

ISBN: 978-93-344-4743-9

جاگیردارانہ نظام اور وقت کے دوسرے سلگے ہوئے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنا دیا۔

عزیز احمد نے ایسی بلندی، ایسی پستی، شبنم گریز، آگ اور پوس، جسے شاہکار ناول جنسی حقائق کی روشنی میں بیان کیا۔ پریم چند پہلے ناول نگار ہیں انھوں نے بیوہ، بازار حسن، نرملا، میدان عمل، گئو دان اور گوشۂ عافیت وغیرہ لکھیں۔ سدرشن بالی، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، رامانند ساگر، ہنس راج ہنس اور عظیم بیگ چغتائی، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری نے بھی نفسیاتی، رومانی ناول لکھے۔ ناول ''آنگن'' خدیجہ مستور کا ہیں۔ دوقومی سیاسی نظریات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان تمام ادیبوں کے لئے کھلے ہوں جو ملک کی آزادی سماجی انصاف اور جمہوریت کے لئے عوام کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں۔ جو زندگی کے بارے میں ایک واضح سائنسی اور عقلی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک اور تنظیم نے ایک متحدہ محاذ کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں ہر فکر و خیال اور ہر سیاسی مسلک کے ادیب شریک تھے۔ اسی طرح ڈرامہ نگاروں نے بھی اس تحریک میں نمایاں کام انجام دیا جن میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، اپندر ناتھ اشک، مرزا ادیب، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ شامل ہیں۔

غرض اس تحریک کا قیام عمل میں آیا اور اس زمانے کے اہم شاعروں اور ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر اس تحریک میں حصہ لیا۔ جن میں حسرت موہانی اور مولوی عبدالحق نے اس موقع پر تقریریں کیں اور ملک کے ہر بڑے شہروں میں انجمنیں قائم کی گئیں۔ لاہور سے علامہ اقبالؔ نے بھی ان لوگوں کی لندن میں حوصلہ افزائی کی۔

سجاد ظہیر نے اس تحریک کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ:

> ''جب ہم نے ترقی پسند تحریک کی تنظیم کی جانب سے قدم اٹھا تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں پہلی تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں کسانوں اور درمیانہ طبقے کی طرف ہونا چاہئے ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور حس وحرکت جوش وعمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار و رجحانات کی مخالفت کرنا جو رجعت، پست ہمی پیدا کرتے ہیں۔ ہمارا اولین فرض ٹھہرا۔'' (بحوالہ اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ۔ ڈاکٹر منظر اعظمی)

اس ضمن میں قمر رئیس اس تحریک کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

> ''سجاد ظہیر کی کوشش یہی تھی اور ین کا خیال تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے دروازے ان تمام ادیبوں کے لئے کھلے ہوں جو ملک کی آزادی سماجی انصاف اور جمہوریت کے لئے عوام کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں۔ جو زندگی کے بارے میں ایک واضح سائنسی اور عقلی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک اور تنظیم نے ایک متحدہ محاذ کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں ہر فکر و خیال اور ہر سیاسی مسلک کے ادیب شریک تھے''۔

۷

جن ادیبوں اور شعراء نے اس تحریک کے زیر اہتمام ایک مقصد کے ساتھ جو کچھ بھی رقم کیا وہ تمام کا تمام قماریات اور شبابیات کا نہیں تھا ایسے ہی ایک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں میں ایک اہم نام ''علی سردار جعفری'' کا ہے۔ علی سردار جعفری کا خیال تھا کہ جب تک انسانیت کے مقاصد بہتر طور پر ادا نہیں کئے جائیں گے تب تک نہ تو اعلی انسان وجود میں آئے گا نہ اعلی ادب کلئے کو اپناتے ہوئے علی سردار جعفری کی پوری زندگی انسانیت کی خدمت کرتے ہوئے گزری۔ آزادی کے بعد جو واقعات ہندوستان میں وقوع پذیر ہوئے وہ دل دہلانے والے تھے اس تحریک کے زیر اثر علی سردار جعفری نے زخم خوردہ انسانیت پر مرہم رکھا یوں تو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا جانے والا تمام تر ادب فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور استحصال کی روک تھام سے عبارت ہے۔ سردار جعفری نے اپنے قلم کے ذریعے اس آئین کو مزید تقویت بخشنے کی کوشش کی ہے۔

آدمی بھی محبت بھی، گیت بھی ہے آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی، روح دل کی تنہائی
ایک طویل سناٹا جیسے سانپ لہرائے

(بحوالہ گوشۂ علی سردار جعفری۔ اردو دنیا نومبر ۲۰۱۳)

ISBN: 978-93-344-4743-9

انسانی فطرت کا سردار جعفری نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔تبھی تو مندرجہ بالا اشعار ان کی اس گہرائی اور گرائی کا پتہ دیتے ہیں جو انسانی فطرت سے متعلق ہے۔سردار جعفری کے خطوط جوانھوں نے اپنی بیگم سلطانہ کے نام[جیل سے لکھے]مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان خطوط میں فن کا دل دھڑکتا ہے جو اپنے اطراف کی ناہمواری سے بڑا پس مردہ ہے۔غرض جب بھی ترقی پسند تحریک کی بات ہوگی سردار جعفری کو یاد کیا جائے گا۔کیونکہ سردار جعفری نے اپنی تحریروں اور قلم سے اس تحریک کو استحکام بخشا۔

''علی سردار جعفری ترقی پسندوں کے اس خوش قسمت قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو سیاسی سماج اور اقتصادی منعفیت کی تمام منزلیں طئے کر چکا ہے۔ اور اس اقتدار طبقے کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف ہے۔جسکی طرف ہم بھی آنکھ سے دیکھنے کا مشورہ وہ دوسرے کو دیتا ہے۔''(بلراج کومل۔رسالہ گفتگو ۱۹۶۸ء سہ ماہی شمارہ)۔

بیسویں صدی کے نصف دوم گلشن کو جن مایہ ناز ہستیوں نے سینچا ان میں سردار جعفری کا نام کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔جس نے اپنی زندگی با مقصد بناتے ہوئے خود کو اور اپنے عہد کو سجانے اور سنوارنے کی اپنی نظموں میں کامیاب کوشش کی۔انھیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کی کوشش اور جدوجہد پر اٹل رہنے کے باوجود اپنی تخلیقی شخصیت کی تعمیر میں جہاں انھوں نے قومی اور بین الاقوامی عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھا وہیں اپنے کلاسیکی سرمایہ پر بھی کاربند ہے۔سردار جعفری نے اپنے طویل ادبی سفر کے دوران تخلیقی سرگرمیوں میں پر جوش شرکت کے ساتھ ہی ساتھ اس تحریک میں نمایاں حصہ بھی لیا۔جو ظلم اور ناانصافی کے خلاف اور انسانیت کی بقا سے متعلق تھی۔جن کا نام اپنے وقت کے ساتھ ساتھ درخشاں ہوتا جا رہا ہے۔

جاتے جاتے دے گئے ہم زنگی کو زنگ و نور
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

(بحوالہ گوشۂ علی سردار جعفری۔اردو دنیا)

یوں تو سردار جعفری نے اپنی شخصیت کے حوالے سے ایک مکمل انسان تھے۔ہم ان کے بچپن کے وقعات کا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انھیں انیسؔ کے مرثیوں کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔پانچ برس کی عمر میں منبر پر بیٹھ کر محرم کے دنوں میں سلام اور مرثیے پڑھا کرتے تھے کربلا کے قافلے میں انھیں حضرت امام حسینؑ کے بعد سب سے زیادہ عقیدت حضرت عباس اور حضرت زینب سے بھی تھی اور ان مرثیوں کی وجہ سے انھیں مزید ان کی عقیدت کو بڑھا وا ملا۔

ان کی زندگی میں نیا موڑ اس وقت آیا جب انھوں نے مہاتما گاندھی کی کتاب''تلاش حق''اور دوسری کتاب پلوٹارک''مشاہیر یونان وروما''تھا۔جس نے ان کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔سردار جعفری اپنی آپ بیتی میں اپنے بچپن کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے اور اپنے اسکول کے بارے میں بھی چند باتیں لکھتے ہیں۔وہ اپنے بچپن میں ایک تختی پر ہزاروں بار یا سیکڑوں بار ایک فارسی شعر کی مشق کیا کرتے تھے۔وہ اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں کہ:

قلم گویہ کہ من شاہ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

''ممکن ہے کسی کیلئے یہ دولت چاندی سونا ہو کیونکہ دنیا میں ضمیر فروشوں کی طرح قلم فروشوں کی کمی کبھی نہیں رہی ہے لیکن میرے لئے یہ علم و ہنر،خلوص وصداقت کی دولت ہے۔اور قلم کے احترام کے معنی اس دولت کا احترام ہے۔اور احترام کا جذبہ ہی بار بار میرے قلم کو روک رہا ہے''۔(بحوالہ آپ بیتی نمبر۔فن اور شخصیت)

یوں تو سردار جعفری نے بحیثیت شاعر ناقد،محقق اور ڈرامہ نگار صحافی اپنے آپ کو ادب کے حوالے سے متعارف کروایا لیکن ان کی شخصیت بحیثیت شاعر ہی بنتی ہے وہ ایک شاعرانہ ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے۔جن کا نام شعر وادب کی دنیا میں بے حد ادب واحترام سے لیا جاتا رہے گا کیونکہ شاعری ان کی جبلت تھی گو کہ وہ ایک بڑے شاعر تھے لیکن انکساری ان کی طبیعت کا خاصہ تھا کہتے تھے کہ:

خوش آگہی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

ان کی شاعری کو سمجھنے کیلئے ہمیں فرائیڈ کے نظریے کے مطابق تحلیل نفسی سے کام لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اپنا نظام، مذہب جس میں بہت ساری اندھی عقیدت در آئی تھی۔ ان اندھی عقیدتوں کے خلاف بغاوت پر اکساتا ہے۔ کبھی وہ اس علم کو بلند کرتے ہیں تو ساتھ ہی اپنے عہد کے سماجی حقیقت کو جو انگریزوں کے جال میں اس قدر رُبنا جا چکا تھا کہ اس کی اپنی انفرادیت زندگی کے تگ و دو کے لئے سسک رہی تھی۔ دوران طالب علمی ان کی انگریزوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ زمانہ کی ناہمواریوں اور اپنے عہد کی مجبوریوں کا حل انھوں نے اشتراکیت میں ڈھونڈا۔ جہاں تک ترقی پسند تحریک کے تحت سردار جعفری کی خدمت کا تعلق ہے اس ضمن میں انھوں نے اپنے تمام تر دل کی گہرائیوں سے ادا کی۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر فیض احمد فیض کے علاوہ کسی ترقی پسند شاعر کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو سردار جعفری کے حصے میں آئی۔ اگر چہ کہ سردار جعفری کی شاعری پر تہمت لگائی جاتی رہی۔ ممبئ میں ان کی کانفرسوں پر پابندی لگ جاتی تھی۔ لیڈر اور منسٹر انھیں ترچھی نظر سے دیکھتے۔ کئی بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر بند کئے گئے۔ ان پر ادبی بے راہ روی کے الزام تو تھے ہی ان پر سیاسی الزام بھی لگائے گئے۔ تاہم انھوں نے اس کی تردید کرنے کی بجائے عوام کو جوش دلانے والی شاعری کے حق میں اپنایا۔ یہ بات واضح کرتے ہوئے انھوں نے مجموعہ پتھر کی دیوار میں کہا تھا کہ:

۹

''چونکہ میں شاعری کو بنیادی طور پر گانے یا بلند آواز سے پڑھ کر سنانے کی چیز سمجھتا ہوں اور اس سے شعور کو بیدار کرنے اور جذبات کو ابھارنے کا کام لینا چاہتا ہوں، اس لئے میں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ وہ فقط کاغذ پر پڑھنے کی چیزیں بن کر نہ رہ جائیں۔'' جسکے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا

علی سردار جعفری کی کتابوں میں ''نئی دنیا کو سلام'' جو ایک تمثیلی نظم ہے۔ ''ایشیا جاگ اٹھا'' ایک طویل نظم ہے۔ ''امن کا ستارہ'' طویل نظم ہے۔ ''خون کی لکیر'' جو ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ''پتھر کی دیوار'' یہ بھی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ''ایک خواب اور'' یہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ ''لہو پکارتا ہے'' یہ بھی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ''پیرہن شرر'' ان کی نئی نظموں کا مجموعہ ہے۔

افسانوی نثر میں علی سردار جعفری کے تیرہ افسانے آتش قمیض، لالہ صحرائی، ہجوم، تنہائی، تین پاؤ گندھا ہوا آٹا، شمع تناول، باپ، پچھی، منزل، بارہ آنے، مسجد کے زیر سایے، آدم زاد، چہرو مانجھی، گلینا۔۔ اسکے علاوہ انکے ڈراموں میں دیوانے، گوتم کا مجسمہ، شیطان کے بچے، سپاہی کی موت، یہ کس کا خون ہے؟، عذرا، پیکار وغیرہ انکے قابل ذکر ڈرامے ہیں۔ علی سردار جعفری اپنے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف پر اپنے مفکرانہ انداز میں تعریف اور تنقید بھی کرتے تھے۔ اس ضمن میں اپنے دوست جاں نثار اختر کی شاعری پر کچھ اسطرح تبصرہ کرتے ہیں۔

''میں تم سے تمہاری دو اور نظموں کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مجھے بہت پسند ہے۔ ایک ''آخری ملاقات'' اور دوسری ''آخری لمحہ'' دونوں نظمیں موت اور زندگی کے ابدی موضوع پر ہے۔ اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' اور ''میرا سفر'' میں میں نے موت کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور موت اور زندگی کا کیا رشتہ ہے اسے ترقی پسند نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے تمہاری نظموں کا موضوع تو یہی ہے لیکن انداز بالکل الگ ہے۔''

علی سردار جعفری کے سلسلے میں سارے تحفظات کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بلا شبہ اردو کے مجاہد تھے اور انھوں نے اردو کے لئے اپنی ساری تگ و دو کو مخصوص رکھا۔ یہ صحیح ھیکہ وہ اشتراک کی نقطۂ نظر کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے رہے اور کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں کو مقدم سمجھتے رہے اس سے ان کے ذہن میں ایک سیاسی انقلاب کا نقشہ ضرور تھا لیکن جہاں تک زبان اور تہذیبی سرگرمیوں کا تعلق ہے علی سردار جعفری کبھی بھی نہ تو غیر روایتی نتائج اخذ کرتے ہیں اور نہ ہی مشرقی سیٹ اپ اختیار کرتے ہیں۔ انھیں اپنے کام پر بھروسہ تھا اپنی آواز پر بھروسہ تھا۔ انھیں اپنے لب و لہجہ کی اہمیت کا احساس تھا۔ اپنی فکری رسائیوں پر اعتماد تھا اسی لیے وہ کہیں بھی کشمکش بھرے لہجے میں

بات نہیں کرتے۔ وہ ٹوک باتیں کرتے اور انھیں یقین تھا کہ ان سے ضرورت سے انکار ہے نہ اردو والوں اور اردو کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تہذیبی، لسانی، ثقافتی اور امن پسند دنیا کو ان کے وجود کی اہمیت سے انکار ہے۔ اس لیے ان کا کام جاری رہیگا اور وہ اپنے خیال اپنے رویہ اور اپنے وجود کی اہمیت کے ساتھ بار بار آتے رہے گے۔

کتابیات

۱) ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر): ترتیب قمر ائیس۔ سید عاشور کاظمی

۲) اردو ادب کی مختصر تاریخ: ڈاکٹر انور سدید

۳) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: پروفیسر سلیم اختر

۴) اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ ڈاکٹر منظر اعظمی

۵) ترقی پسند تحریک کی نصف صدی۔ علی سردار جعفری: ۔ سلسلہ مطبوعات شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

رسائل

۱) فن اور شخصیت آپ بیتی نمبر ممبئی مارچ۔ ستمبر ۱۹۶۷ء: قدیر صابر حت معاون قدیر کلیم راہی

۲) سہ ماہی گفتگو ممبئی ۱۹۶۸ء: مرتبہ علی سردار جعفری' صفحہ نمبر ۱۹،۲۰

۳) ماہنامہ اردو دنیا دہلی، نومبر ۲۰۱۳، گوشۂ علی سردار جعفری

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

پروین شاکر کی غزلوں کے مختلف پہلو

زیبا پروین
ریسرچ اسکالر، قاضی نزرل یونیورسٹی، آسنسول (مغربی بنگال)
ٹی۔ڈی۔بی کالج، رانی گنج

بیسویں صدی میں جن شاعرات نے اپنی مستحکم پہچان بنائی ہے ان ہی جدید شاعرات کی فہرست میں ایک اہم نام پروین شاکر کا بھی ہے۔ بحیثیت شاعرہ جو شہرت ومقبولیت پروین کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور شاعرہ کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کی غزلیں بنیادی طور پر عشقیہ جزبات کا آئینہ دار ہیں باوجود اس کے ان کے یہاں آزادیٔ نسواں اور حقوق نسواں کے ساتھ ساتھ نسوانی جذبات واحساسات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ خواتین ادب کا شعری حصہ پروین شاکر کے ذکر کئے بغیر ادھورا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

"جدید شاعری کا منظر نامہ پروین شاکر کے دستخط کے بغیر نامکمل ہے"

(اردو غزل کی ماہ تمام پروین شاکر۔ ڈاکٹر روبینہ شبنم۔ ص 16)

پروین شاکر عوام وخواص دونوں کی پسندیدہ شاعرہ ہیں۔ کل ہند مشاعروں میں بھی ان کی شرکت ہوا کرتی تھی۔ ان کی پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "خوشبو" (1977) دوسرا" صد برگ" (1980) تیسرا" خود کلامی" (1985) چوتھا" انکار" (1990) پانچواں اور آخری شعری مجموعہ " کف آئینہ " (1995) میں منظر عام پر آیا۔ ان کا پہلا مجموعہ "خوشبو" کی کامیابی پر 1978ء میں انھیں آدم جی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

اپنی غزلوں میں انہوں نے رومانی تجربات کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ حقائق کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ دونوں پہلوان کے یہاں متوازی دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہونے والے واقعات کو بڑی خوبی اور سچائی کے ساتھ برتا ہے۔ درج ذیل اشعار میں پروین کے ذاتی کرب کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

ہم تو سمجھتے تھے کہ اک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگ جاں میں اتر جائے گا

تم نے پوچھا ہے چلو تم کو بتا دیتے ہیں
جو ہم پہ گزری ہے تم کو بھی سنا دیتے ہیں

پروین کی غزلوں میں ہندی شاعری کے اثرات بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ ہندی شاعری کے بارہ ماسہ کی طرح پروین کے یہاں صرف ایک مہینے یعنی برسات میں دل پر گزرنے والی کیفیات واحساسات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ دیکھیں:

دن ٹھہر جائے مگر رات کٹے
کوئی صورت ہو کہ برسات کٹے

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رت میں مہکتا دیکھوں

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے

ISBN: 978-93-344-4743-9

جاگ اٹھی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

پروین کی نظر میں عشق کا تصور بہت بلند ہے۔ان کی غزلوں میں عشق و محبت کا شدید جزبہ اور بے قراری کارفرما ہے۔انھوں نے عشق کا ایسا المیہ پیش کیا ہے جس میں جزباتی کیفیات کی سچی اور واضح تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔پروین کے یہ اشعار ان کے نظریہ عشق پر روشنی ڈالتا ہوا نظر آتا ہے۔

چلنے کا حوصلہ نہیں رکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا
عشق میں بھی مرنا اتنا آسان نہیں
ذات کو رد کرنا اتنا آسان نہیں

پروین کی غزلوں میں محبوب عشق و محبت میں جدائی کو اپنا نصیب سمجھتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس کا محبوب چاہے اس سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتا ہو ایک نہ ایک دن وہ اس کو ضرور رخصت کرے گا۔

اک نہ اک روز تو رخصت کرتا
مجھ سے کتنی ہی محبت کرتا
وقت رخصت آ گیا دل پھر بھی گھبرایا نہیں
اسکو ہم کیا کھوئیں گے جس کو کبھی پایا نہیں

پروین اپنے عہد کی شاعرات میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔انھوں نے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق غزلوں میں اپنے جزبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔اس صنف میں انہوں نے اپنے تیکھے اور طنزیہ انداز سے منفرد اور نمایاں کردار پیش کیا۔طنز ان کے کلام کی اہم خصوصیت ہے جس کی جھلک ان کی غزل میں کامیابی کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے جیسے:

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا
جیت لونگی تجھے دنیا سے میرا وعدہ ہے
ہر بار ہو میری ہار ضروری تو نہیں

اپنے اطراف کے ماحول پر جب ان کی نظر جاتی ہے تو کچھ مسائل ایسے ہیں جو ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔انہوں نے ملک کے سماجی اور سیاسی حالات کا مشاہدہ کرتے ہوئے ان پر کھل کر اظہار خیال بھی کیا ہے۔

اشعار دیکھیں:

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
میرے قبیلے کا ہر فرد قتل گاہ میں ہے
وہ کہ جن کے ہاتھ میں تقدیر فصل گل رہی
دینگے سوکھے ہوئے پتوں کا نذرانہ ہمیں

پروین نے سیاسی موضوعات میں سیاسی رہنماؤں کی گندی سیاست کو بے نقاب کیا ہے ہمارے عہد کے سیاسی رہنماؤں کے قول و فعل میں تضاد ہے۔عوام کے ساتھ وعدہ خلافی، جھوٹی تسلیاں اور فریب ہوتی ہیں:

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن

ISBN: 978-93-344-4743-9

کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی
بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

پروین کے یہاں مخصوص لب ولہجہ اور اپنی زمین سے وابستگی کا منظر صاف صاف نظر آتا ہے۔انہوں نے شاعری کو عروج تک پہنچانے کیلئے عام فہم لفظوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ان کے یہاں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی ہے یہی ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔الفاظ وتراکیب اوران کے برتنے کے انداز نے ان کی غزلوں کی کیفیت میں ایک الگ حسن وجمال پیدا کیا ہے:

بہت رویا وہ ہم کو یاد کرکے
ہماری زندگی برباد کر کے
چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ
میرے بستر کی ہر شکن کی طرح
حسن کو سمجھنے کو عمر چاہیے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

پروین کی غزلوں میں انتظار کی شدت کئی رنگوں اور کیفیتوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔محبت میں اگر فاصلے ہوں تو محبوب کا دیدار ہی دل کی راحت وسکون کے لئے کافی ہوتا ہے شاعرہ یہ جانتی ہے کہ وہ جس کا انتظار کررہی ہے وہ آنے والا نہیں لیکن وہ انتظار کی تکلیف کو بھی مسرت کا سامان بنالیتی ہے۔

ایک پل میں گزرگئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا
بارہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

پروین کے یہاں ہجر ووصال کی کیفیتیں اپنی معنویت کے ساتھ ساتھ نئی جہات بھی رکھتی ہیں۔ پروین کی غزلوں میں ہجرتوں کا عکس صاف نظر آتا ہے۔یہ رنگ ان کی شاعری کا سب سے نمایاں رنگ ہے۔ان کی غزلیں ان کی قلبی کیفیت کی آئینہ دار ہیں۔اس آئینے میں ان کے یہاں ہجر کے مختلف اور متضاد رنگ بھی مل جائیں گے۔ اشعار دیکھیں:

میں ہجر کے عزاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی
پورا دکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند

ان کے یہاں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی بلکہ یوں کہیں کہ ان کی آپ بیتی نے ہی جگ بیتی کی صورت اختیار کرلی ہے۔ان کی غزلوں میں زندگی کی بے ترتیبی کے بہت سے رنگ نظر آتے ہیں ان میں ہجر کا رنگ سب سے گہرا ہے۔ہجر کے طویل لمحوں نے ان کے شعری افق کو وصل سے زیادہ پرکشش بنادیا ہے۔محبوب کی بے رخی، بے مروتی، بے توجہی اور ازدواجی زندگی کی ناکامیابی نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ہم سفر کے چھوڑ جانے کا غم اتنا آسان نہ تھا جس کے باعث پروین سکون دل کے لئے بیقرار رہی جب محبوب غم فراق دے کر آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا ہے تو اس وقت اس کی محبوبہ کا کیا حال ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
یوں بچھڑنا بھی بہت آسان نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مڑ کر دوبارہ دیکھنا

المختصر پروین شاکر کی غزلیں ان کی فکر وشعور اور جزبات واحساسات کے مختلف جہتوں سے عبارت ہے۔ پروین نے محض عشق ومحبت ہی کی شاعری نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنی ذاتی اور ازدواجی زندگی کے حالات ومعاملات کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کو بھی اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔انہوں نے اپنے منفرد لب ولہجے اور نسائی جزبوں سے اردو غزل کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ان سب خوبیوں کی وجہ سے پروین شاکر ہمیشہ یاد کیے جانے کی مستحق ہیں۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

اردوشاعری پر ٹیکنالوجی کے اثرات

کوثر فاطمہ محمد نثاراحمد مومن

ریسرچ اسکالر مولانا آزاد ریسرچ سینٹر

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ٹیکنالوجی انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات پر تیز رفتاری کے ساتھ حاوی ہوگئی اور ٹیکنالوجی سے واقف انسان کو ترقی کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ ویسے تو کیا بچہ کیا بوڑھا ہر کوئی اس سے متاثر ہوا۔ یہ اثرات منفی و مثبت دونوں بھی طرح کے ہیں۔ سائنسی علوم پر عمل نے ٹیکنالوجی بنائی اور رب کا کلام اظہر من الشمس کی طرح واضح ہوتا چلا گیا۔ رب کائنات کا قول جو کہ سورہ الجاثیہ کی آیت 13 میں موجود ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

اور اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس ٹیکنالوجی کے دور میں پیدا کیا جہاں ہم ہر کام میں تیزی دیکھتے ہیں وہیں علم و ادب کے شعبے میں بھی تیز رفتار ترقی دیکھنے ملتی ہے اس سے بعید نہیں کہ جو زبان روزگار فراہم کرتی ہے وہ زندہ رہتی ہے اور ہم خوش نصیب ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی کا اردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ہے۔ اگر ہمارے فون میں یا کمپیوٹر پر اردو کی بورڈز کا سسٹم نہ ہوتا، یونی کوڈ کا سسٹم نہ ہوتا، ان پیج نہ ہوتا، دیگر سافٹ ویئر نہ ہوتے تو شاید ہم اردو علم و ادب کی ترقی وہ ترویج اور اشاعت میں پیچھے رہتے مگر اللہ کے فضل و کرم سے ایسا بالکل نہیں ہے اور یہ اردو زبان و ادب کے لیے بڑی خوش آئند بات ہے۔

تحقیق کے میدان کے لیے انسان کو مستقل مزاجی کے ساتھ دردر کی خاک چھانی پڑتی تھی لیکن اج ای لائبریریوں کی مدد سے ای میگزین ای بکس اور دیگر اردو ویب سائٹ کی وجہ سے تحقیق کا کام گھر بیٹھے ممکن ہوگیا ہے۔ نہ صرف ادیبوں، مصنفوں اور شعراء کا کلام بلکہ ان پر موجود کتابیں، ان کی لکھی کتابیں اور ان پر کیا گیا تحقیقی کام بھی ہم انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھ سکتے ہیں بطور حوالہ استعمال کرسکتے ہیں۔ وہ تمام مشاعرے جو بڑے پیمانے پر وقت طلب اور خرچ طلب ہوا کرتے تھے آن لائن منعقد کیے جانے لگے اردو کے قارئین دنیا کے چاروں کونوں سے اس سے جڑ سکتے ہیں۔ وہ تمام ذہین افراد جو تخلیقی دماغ رکھتے ہیں اپنے جدید تخلیق سے اردو دنیا کی خدمت کرسکتے ہیں۔ اردو نثر و شاعری پر بھی ٹیکنالوجی نے دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔

جو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر محیط ہیں۔ ذیل میں ان اثرات کی چند اہم جہتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ نئے اظہار کے ذرائع

جدید ٹیکنالوجی نے شاعری کو ایک نئی شکل دی ہے۔ سوشل میڈیا، بلاگز، اور آن لائن پلیٹ فارمز نے شاعری کی تخلیق اور اس کی تشہیر کے مواقع بڑھادیے ہیں۔ اب شاعر اپنی تخلیقات دنیا بھر کے قارئین تک آسانی سے پہنچا سکتے ہیں۔ جو پہلے ممکن نہ تھا۔ ہر آنے والے خیال کو شاعر شاعری کے پیرائے میں امیج بنا کر، ویڈیوگرافی کرکے، یا پھر انسٹاگرام پر ٹیلی گرام پر یا اپنے ڈی پی پر یا آن لائن وال پیپر پر لگا سکتا ہے۔

۲۔ فوری رسائی

ٹیکنالوجی نے شاعری کو کاغذ سے نکال کر ڈیجیٹل فارمیٹ میں بدل دیا ہے، جس سے قارئین کسی بھی وقت شاعری تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔ ای بکس اور شاعری کے آن لائن آرکائیوز نے ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی، خاص طور پر سوشل میڈیا اور آن لائن پلیٹ

 ISBN: 978-93-344-4743-9

فارمز، نے اردوشاعری کی رسائی کو عالمی سطح پر بڑھا دیا ہے۔اب شاعری نہ صرف کتابوں تک محدود ہے بلکہ یوٹیوب،فیس بک، انسٹا گرام،اورٹویٹر پر بھی دستیاب ہے، جہاں نئے اور پرانے شعرا کے کلام فوری طور پر قارئین تک پہنچتے ہیں۔اس سے شاعری سے شغف میں اضافہ ہوا ہے۔کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ مواد ڈیجیٹل کیا جا سکتا ہے۔

آج اگر کوئی بھی شخص گھر بیٹھے اپنے کمپیوٹر پر کلیات اقبال یا دیوان غالب دیکھنا چاہتا ہے، اپنی پسند کا کوئی شعر یا کسی شاعر یا ادیب کے حالات زندگی یا کسی موضوع پر مواد دیکھنا چاہتا ہے تو وہ یونی کوڈ سہولت کو گوگل سرچ میں استعمال کرے تو اسے اردو زبان وادب کا ایک نیا جہاں نظر آئے گا۔اردو وکی پیڈیا پر اردو کے شعراء اور اردو زبان وادب وزبان وادب کے دیگر موضوعات پر معلوماتی مضامین دستیاب ہوں گے۔اردو اور اردو زبان وادب کی دلچسپی کے بہت سے موضوعات دستیاب ہیں۔

☆☆☆

 ISBN: 978-93-344-4743-9

اردو نعتیہ شاعری اور امام احمد رضا خان

شیخ عبدالعظیم عبدالرفیق
(ریسرچ اسکالر، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد)

نعتیہ شاعری کے حوالے سے مولانا احمد رضا خان کی خدمات اور امتیازات کیا ہیں اس کا تحقیقی جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے نعت کے فن، تصور نعت اور آداب نعت کو سمجھا جائے نیز اردو کے حوالے سے نعت گوئی کے آغاز وارتقاء کا مختصراً مطالعہ بھی کیا جائے۔

نعت گوئی کا فن:

حضور اکرم ﷺ کی ذات والا صفات کی عظمت و رفعت کا بیان، آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کی تعریف، آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ کا ذکر، آپ کے شمائل کا تذکرہ، آپ کے معجزات و کمالات کا بیان ابتدائے آفرینش سے جاری و ساری ہے۔ نعت گوئی کی تاریخ کو کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعت گوئی کا سلسلہ ازل سے شروع ہوا ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ آپ ﷺ کی آمد سے قبل بھی سابقہ آسمانی صحیفوں اور کتب میں آپکی آمد کی بشارتیں موجود ہیں اور آپکے اوصاف حمیدہ درج ہیں۔ توریت، زبور، انجیل اور دیگر آسمانی کتب اور صحائف میں آپکے اوصاف و کمالات مذکورہ ہیں۔ خود رب قدیر نے قرآن مجید میں مختلف انداز میں آپ کی نعت بیان فرمائی ہے۔ خود اہل عرب جو اپنے کو اہل لسان کہتے تھے اور جنہیں اپنی زبان دانی پر اس قدر ناز تھا کہ ماسوائے عرب کو عجمی کہتے تھے انہوں نے بھی حضور ﷺ کی نعت میں بہت کچھ لکھا۔ عربی ادب میں اس کے بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ صحابہ کرام حضور ﷺ پر اپنی جان نثار کرتے اور نعت رسول ﷺ کو اپنا مقصد زندگی سمجھتے تھے۔ دربار رسول ﷺ کے سب سے مشہور و مقبول شاعر حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ج نعت پڑھتے تو انکا کلام سن کر سامعین کے قلب و جگر پر طاری ہونے والی کیفیت اور دارفتگی کا اظہار و بیان ناممکن ہے۔ آپ ﷺ کے اصحاب کی تربیت ہی کچھ ایسی تھی کہ انہوں نے آپ ﷺ کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر آپ کے حسن و جمال، تعریف و توصیف اور شمائل و خصائل میں طویل قصیدے اور ایسے اشعار بیان کئے کہ پڑھنے والا آج بھی انکی فصاحت و بلاغت اور حسن ادا کی داد دئے نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ اشعار دیکھیں۔

حضور ﷺ کی مدحت، تعریف، توصیف اور شمائل و خصائل کا نام نعت ہے۔ نعت نظم میں بھی ہو سکتی ہے اور نثر میں بھی۔ لیکن بطور اصطلاح شعر ہی کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور ایسی شاعری کو جس میں آپ ﷺ کی مدح و ستائش کی گئی ہو نعتیہ شاعری کہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب بھی نعت کا لفظ سامنے آتا ہے تو غیر ارادی طور پر قلب و ذہن آپ ﷺ کے حسن و جمال میں شیفتہ و فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ نعت رسول روز اول ہی سے کائنات انسانی کی اپنے آقا و مولیٰ ﷺ سے قلبی و روحانی وابستگی کا مظہر بنی ہوئی ہے۔ عالم اسلام کا کوئی خطہ، کوئی گوشہ، کوئی ملک اور کوئی زبان ایسی نہیں جس میں آپ ﷺ کی تعریف و توصیف نہ کی جاتی ہو۔ یہ واحد صنف سخن ہے و شاعر کے کلام کو دوام عطا کرتی ہے اور مطلع ہستی پر آفتاب کے ستاروں کی مانند ابھرتی ہے۔

نعت ایک اہم صنف ہے۔ نعت گوئی کا باقاعدہ آغاز تو حضرت ابو طالب نے کیا بعد میں اصحاب رسول نے بھی نعت گوئی کا سلسلہ شروع کیا جسکی غیر مسلم شعراء نے بھی آپ ﷺ کے فضائل و کمالات کا منظوم تذکرہ کر کے آپ فن کو اعتبار بخشا ہے۔

مولانا احمد رضا خان اور تصور نعت:

نعت گوئی ایک ایسا نازک فن ہے جسکی نزاکتوں کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی تعریف و توصیف میں ادب و احترام، الفاظ کا انتخاب، خیالات اور مضامین کی پاکیزگی اور منصب نبوت کا تقدس پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ نعت میں نہ تو اردو شاعری کی دیگر اصناف کے مانند بے جا مبالغہ اور غلو کی گنجائش ہے کہ عبدیت اور الوہیت کا فرق باقی نہ رہے اور نہ اتنی تفریط کہ شان رسالت مآب میں تنقیص کا پہلو شامل ہو جائے۔ اس سلسلے میں مولانا احمد رضا خان لکھتے ہیں۔

''حقیقتاً شریف لکھنا بہت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر شاعر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہے۔ البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے۔ جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے۔ غرض حمد میں یک جانب کوئی حد نہیں اور نعت میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے''۔

نعتیہ شاعری کے لیے ضروری ہے کہ حقائق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور اگر حقائق اور دلائل شاعرانہ ہوں تو ان کی تاویل نعت کے مناسب ہو ورنہ شاعرانہ حقائق سے بھی گریز کرنا چاہئے۔

نعتیہ شاعری میں نہ صرف شعر وسخن کی آزمائش ہوتی ہے بلکہ اس کسوٹی پر عقیدۂ توحید و رسالت اور عشق حقیقی کی پرکھ بھی بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ اسی لیے ارباب سخن نے نعتیہ شاعری کو دو دھاری تلوار سے تشبیہ دی ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی ترمیم و تنسیخ اور افراط و تفریط کا شائبہ ہو گیا تو سامان بخشش بننے کے بجائے طوق کفر وضلالت بھی بن سکتا ہے جیسا کہ ایک شاعر لکھتا ہے۔

نعت گوئی میں نہ صرف زبان دیکھی جاتی ہے اور نہ بیان پر نظر جاتی ہے، نہ فنی نکات تلاش کئے جاتے ہیں۔ اسکی روح صرف اور صرف اخلاص اور محبت رسول ﷺ ہے۔ نعت رسول ﷺ میں ''ازدل خیزد بر دل ریزد'' والا معاملہ ہونا چاہیے۔ اور پھر یہ دل سے نکلی ہوئی بات اگر بارگاہ رسول ﷺ میں مقبول ہو جائے تو اشعار اور صاحب اشعار دونوں کو معراج حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فارسی شاعری میں حافظ شیرازی، عطار نیشاپوری، جلال الدین رومی، شعدی شیرازی، عبدالرحمٰن جامی، سیدنا شیخ عبدالقادر، خواجہ معین الدین چشتی، بوعلی شاہ قلندر، نظام الدین اولیاء، امیر خسرو وغیرہ کی نعتیں اسکی شہادت دے رہی ہیں۔

اردو میں نعت گوئی کا آغاز:

دیگر زبانوں کی طرح اردو شاعری کو بھی نعت گوئی میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اردو شعراء نے اس صنف میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ''نعت گوئی، عشق رسول اور شوق مدینہ ہندوستانی شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے اور فارسی شاعری کے بعد سب سے بہتر اور سب سے موثر نعتیں اردو ہی میں ملتی ہیں۔''

اردو میں نعت گوئی فارسی کے توسط سے آئی ہے۔ اردو کی دیگر اصناف کی طرح نعت گوئی کا آغاز بھی دکن سے ہوا۔ دکن کی قدیم مثنویاں اس کی شاندار مثال ہے۔ ان مثنویوں میں جابجا حمد کے ساتھ عمدہ نعتیہ اشعار بھی خوب ملتے ہیں۔ نویں صدی ہجری لے لیکر گیارہویں صدی ہجری تک کی تمام دکنی مثنویوں میں نعت کا ایک شاندار ماضی ملتا ہے۔ اور یہ سلسلہ دور قدیم سے آج تک چلا آرہا ہے۔ دکن کے قدیم نعت نگاروں میں نظامی، خوب محمد چشتی، بحری، میراں جی، جانم، وجہی، نصرتی اور قلی قطب شاہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۷۰۰ء میں دلی اور پھر انکے دیوان کی شمالی ہند میں آمد اردو کے فال نیک ثابت ہوئی۔ اس وقت شمالی ہند میں فارسی شاعری کا رواج تھا اور فارسی میں شاعری کرنا باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دلی کے دیوان کی آمد نے یہاں کے ادبی حلقے میں ایک ہلچل مچادی اور کچھ دنوں میں یہاں کے فارسی شعراء بھی ریختہ میں اشعار کہنے لگے۔ دیوان دلی میں نظموں، غزلوں، گیتوں اور مثنویوں کے ساتھ نعتیہ کلام کی مثالیں بھی خوب ملتی ہیں۔ چنانچہ جہاں ایک طرف شعراء اردو غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے وہیں نعت گوئی بھی انکی توجہ کا مرکز رہی۔

شمالی ہند کے ابتدائی نعت گو شعراء میں غالب، مومن، ذوق، میر، درد، انشاء، انیس وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ کچھ آگے بڑھیں تو خواجہ الطاف حسین حالی اردو شاعری کے دور جدید کے اہم نعت گو شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جن سے اردو میں نعت گوئی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ حالی نعتیہ کلام مقدار میں بہت کم ہے مگر معیار میں بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ انکے علاوہ جن شعراء نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں مشہور و مقبول امیر مینائی، محسن کاکوروی، اکبرالہ آبادی، شبلی نعمانی، جگر مرادآبادی، علامہ اقبال، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، داغ دہلوی، اصغر گونڈی، فانی بدایونی، بیدل، عمر خیام، میر عبدالحی دہلوی، آتش، ناسخ، جرات، تاباں، ریاض خیرآبادی، شکیل بدایونی، اقبال سہیل، حفیظ جالندھری، دانش، وصل، عرش ملسیانی، کرشن پرشاد کول، نشتر، جلیل، حسن رضا بریلوی، ظفر، بادی، بیسمی مارہروی، شکیل بدایونی، کافی مرادآبادی، امجد منور، فیض احمد فیض، بیدم وارثی، ساحر لدھیانوی، حسرت موہانی، مولانا احمد رضا

ISBN: 978-93-344-4743-9

خاں بریلوی، قتیل شفائی، خمار بارہ بنکوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا احمد رضا خان نے جس طرح تمام بحور میں اشعار نظم فرمائے ہیں اسی طرح آپ کا یہ بھی کمال ہے کہ آپ نے قریب قریب شاعری کی تمام اقسام میں اشعار کہے ہیں اور فن شعر وادب کو اس انداز سے نکھارا ہے کہ رہتی دنیا تک فن اور اہل فن آپکے مرہون منت رہیں گے۔

مولانا احمد رضا خان کے زمانے تک اردو شاعری محبوب کی زلفوں کی اسیر تھی۔ محبوب کے لب و رخسار، قد و قامت اور زلف و ابرو کا ذکر شاعری کا لازمی حصہ تھے غرض اس دور میں عشق مجازی اتنا غالب آ چکا تھا کہ شعر و ادب کی اکثریت اسی دام فریب میں گرفتار تھی اور محبوب مجازی کے سراپا کا عاشقانہ بیان اور اسکی سوقیانہ تشریح ان کا طرہ امتیاز تھا۔ عشق مجازی ذہن و دل پر اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ عشق حقیقی میں کی جانے والی شاعری پرانی وضع قطع کی ذہنیتکی تخلیق اور خشک عنوانی پر مشتمل شاعری سمجھی جاتی تھی۔ مولانا احمد رضا خان کا اردو شاعری پر بے پناہ احسان ہے کہ اس غلط نظریہ کی تردید فرمائی اور اپنے حسن کلام، زور بیان اور حقیقت بیانی سے اردو شاعری کے چہرے کی زردی سرخی میں تبدیل ہوگئی اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ اردو شاعری کا حسن عشق مجازی اور دنیوی محبوب کے خد و خال کی تعریف میں نہیں بلکہ عشق خدا رسول اس کا اصلی جوہر اور حسن ہے۔ دیکھئے آپکے کلام میں ادب و تعظیم رسول ﷺ کس غایت درجہ کی ہے۔

نعت گوئی میں آپ کا مقام نہ صرف اس لیے بلند و بالا ہے کہ آپ نے عشق حقیقی میں غرق ہو کر قرآن و حدیث کے مختلف مضامین و موضوعات کو نعت کا عملی جامہ پہنایا ہے بلکہ آپ کی نعتیہ شاعری اس میدان میں ایک بہترین رہنما کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور آج تک شعراء آپ کی نعتوں سے عشق حقیقی کے جذبات کو بیان کرنے کے آداب اور ہنر سیکھتے ہیں۔ آپ کی شاعری حق و صداقت پر مبنی ہے۔ تصنع و مبالغہ آرائی، بیجا غلو، روایاتی تکلف، دروغ گوئی، کذب بیانی، جذبات کے سیلاب میں بہ جانا وغیرہ تمام طرح کے عیوب سے منزہ و پاک ہے۔ خالق کائنات نے آپکو موزونیت و معنویت کی وہ صلاحیتیں دی تھیں کہ عشق رسول ﷺ کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ فن و ادب کے اعتبار سے بھی آپ بے مثال تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپکی شاعری میں آمد آمد کی بہار ہے اور آورد کا اس میں نام ونشان تک نہیں۔ خود فرماتے ہیں۔

''جب سرور عالم کی یاد تڑپاتی ہے تو میں نعتیہ اشعار سے بے قرار دل کو تسکین دیتا ہوں، ورنہ شعر و سخن میرا مذاق طبع نہیں''

اس قول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے شاعری برائے شاعری نہیں کی بلکہ بطور عبادت اس صنف کو اپنایا۔ مدح رسول ﷺ آپکا مقصد اصلی تھا اور آپ کی شاعری نے لوگوں کے دلوں میں عشق رسول کی ایک نئی روح پھونکنے کا کام انجام دیا۔ اس کا ثبوت حسب ذیل واقعہ ہے۔

مولانا احمد رضا خان کے کلامکی عمدگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے نعت گوئی کے لیے قرآن و حدیث کو مشعل راہ بنایا ہے اور حضور ﷺ کے صفات و اعجاز، مناقب و مراتب اور بے مثل و بے مثال اوصاف کو قرآن و حدیث کی روشنی میں عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآن کریم سے آپ نے نعت گوئی سیکھی اور اس کو تمام تر عنائیوں سے پر کرنے کے لیے حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے واقف راہ عشق کو خضر راہ بنایا اور انکے نقش قدم کو اختیار کیا۔

کہ جو مرضی محمد ﷺ کی وہی مرضی خدا کی ہے۔

ہر شاعر اپنے کلام میں صنعات کے استعمال سے حسن پیدا کرتا ہے۔ گویا صنعتوں کا خوبصورت استعمال کلام کے حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے صنعات کو کلام کا زیور بھی کہا ہے۔ اردو ادب کے شہرۂ آفاق شعراء صنعات کے استعمال میں بھی کوشاں رہے اور حسب استطاعت ان کو اپنے کلام میں برتاؤ بھی۔ مولانا احمد رضا خان نے بھی اپنے کلام میں ان صنعات کا بھرپور استعمال کیا ہے اور اردو ادب میں ایک مثال قائم کر دی کہ نعتیہ شاعری میں بھی ان صنعات کا حسین انداز میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اپنے نعتیہ اشعار میں ان صنعات کو ایسے حسین پیرائے میں نظم فرمایا ہے کہ اہل ذوق کو مجبور ہو کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ حضرت رضا کا مقام فن و ادب کے اعتبار سے بھی تمام اردو شعراء میں سب سے بلند و بالا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا احمد رضا خاں ک نعتیہ شاعری اپنا ایک امتیازی مقام اور انفرادی شان رکھتی ہے۔ آپ کا نعتیہ کلام اردو ادب میں حرف آخر کی حیثیت کا حامل ہے۔ اردو ل شاعری کے وہ سارے اوصاف و محاسن جو اردو کے نامور شعراء کے کلام میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں وہ تمام اوصاف و کمالات آپکی نعتیہ شاعری میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ جن صنعات کا اشعار میں استعمال کرنا بڑے بڑے شعراء کے لیے مشکل کام تھا ان صنعات کا نعت جیسی محتاط اور عظیم صنف میں استعمال کرنے پر آپکو ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے

 ISBN: 978-93-344-4743-9

اپنی نعتیہ شاعری سے اردو کو تقویت اور زینت بخشی بلکہ نعتیہ شاعری کو ایک مستقل فن کی حیثیت دیتے ہوئے نعتیہ شاعری کی نسیم عشق سے اردو ادب کو روشناس کرایا۔ آپ کا پورا کلام عشق رسول کی مستی اور دردوسوز کی دولت سے مالا مال ہے۔ آپ کی شاعری اردوئے معلّٰی کا شاہکار ہے اور ہستی دنیا تک اردو ادب اور اہل ادب مولانا احمد رضا خاں کے مرہون منت رہیں گے۔

حواشی:

۱) مولانا احمد رضا خان، حدائق بخشش (نعتیہ دیوان)

۲) مولانا عبدالستار ہمدانی، ''فن شاعری اور حسان الہند''

۳) امانت رسول قادری، تجلیات امام احمد رضا، کراچی

۴) ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ''اردو کی نعتیہ شاعری''

۵) ڈاکٹر صبیح رحمانی، ''اردو نعت کی شعری روایت''

۶) ڈاکٹر محمد طہور خان پارس، ''نعت انسائیلو پیڈیا، جلد اول''

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

آزادی کے بعد اردو شاعری

سیدہ فوزیہ فاطمہ سید زین العابدین
ریسرچ اسکالر (پی۔ایچ۔ڈی) شعبۂ اردو
ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر یونیورسٹی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

اردو زبان کی وہ شاعری جو آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں منظر عام پر آئی ہے کچھ مخصوص اور قابل توجہ پہلوؤں کی حامل ہے۔ غزل اردو شاعری کی دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں حاوی انداز میں تخلیقی اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا۔ رشید احمد صدیقی اسے اردو شاعری کی آبرو سمجھتے تھے، اختر الایمان اپنی ہر گفتگو میں اپنی اس رائے کو دہراتے تھے کہ غالب غزل کا نقطۂ عروج تھے، غالب کے بعد کی غزلیہ شاعری محض مضامین اور اسالیب واظہار کے تکرار کی شاعری ہے۔ حال کے برسوں میں ستیہ پال آنند نے غزل دشمنی کا واشگاف اظہار غزل کے موضوعات کی اعداد شماری اور اس کی فاضل شیرینی کی بنا پر کیا ہے۔ غزل دشمنی کا وہ باب جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ تھا غالباً داستان پارینہ بن چکا ہے۔

پچھلے پچاس برسوں میں نظم بھی بہت سے مراحل سے گذری ہے۔ نظم جو ترقی پسند شعرا کے ساتھ منسوب تھی چند مستثنیات کو چھوڑ کر طے شدہ موضوع، اعلان، پروگرام یا مصنوعی اثبات کی شاعری تھی۔ اس کے خلاف ردعمل کے طور پر نظم کی جو شاعری وجود میں آئی وہ مقابلتاً متنوع مضامین اور مختلف طریق کار اور اظہار کی شاعری تھی۔ براہ راست مستقیم اظہار کے بجائے وہ غیر مستقیم طریق کار کو ترجیح دیتی تھی۔ تجربہ کاری، اس کے دریافت کے عمل کا حصہ تھی۔ دریافت اور تجربہ کاری کے جاری و ساری عمل کے دوران بہت سی متنازعہ فیہ صورتوں کا منبع بھی ثابت ہوئی۔ مثلاً لوگ نثری نظم، اور دیگر زبانوں کی اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کی جانب ترقی افزوں انداز میں مائل ہونے لگے۔

پچھلے پچاس برسوں میں اردو شعرا نے دیگر ہندوستانی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں کی شاعری کے اردو تراجم پیش کرنے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ اسی عرصے میں اردو شاعری کے نظم اور غزل دونوں کے دیگر ہندوستانی زبانوں اور یورپی زبانوں میں بھی اس کے تراجم شائع ہوئے۔

آزادی کے بعد کی اردو شاعری سے متعلق ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اس سیمینار کے مقاصد کے بارے میں کچھ اشارے سکریٹری ساہتیہ اکادمی کی تقریر میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ اس تفصیل سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ وہ غزل ہو یا نظم یا تجربہ کاری یا تراجم کا عمل اس کے پچھلے پچاس برسوں کی صورت حال کے تعلق سے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر اور آزادانہ اظہار خیال کے بنیادی مقصد سے اس سیمینار کا انعقاد کیا گیا ہے۔

میں نے غزل نظم، دیگر زبانوں کی اصناف سخن اور تراجم کے بارے میں اب تک جو کچھ مختصر عرض کیا ہے آپ کی اجازت سے مناسب حد تک اس کی تفصیل میں جانا چاہوں گا۔ ظاہر ہے سیمینار کے اجلاس میں ان پر بھرپور اور کھلی گفتگو ہوگی اور بہت سے ایسے پہلو اور گوشے سامنے آئیں گے جو ممکن ہے اب تک میری نظروں سے اوجھل رہے ہوں۔

غزل کے بارے میں یہ رائے کہ یہ نیم وحشی صنف سخن ہے، یا اپنے نقطۂ عروج کے بعد روبہ زوال ہے یا موضوعات کی محدود تعداد کے باعث گردن زدنی ہے، غزل کی بطور صنف سخن اور سرمایہ غزل کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتی۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ غزل آغاز سفر سے لے کر دورِ حاضر تک اردو شاعری کی پسندیدہ اور حاوی انداز کی صنف اظہار ہے۔ یہ اس لیے نہیں ہوا کہ غزل آسان صنف سخن ہے یا اردو شعرا دیگر اصناف سخن میں اظہار کی قدرت سے محروم ہیں بلکہ غزل کی شعرا، قارئین اور سامعین اردو اور صاحب نظر ناقدین کے یہاں قبولیت، مقبولیت اور قدر افزائی اس لیے جاری وساری ہے کیونکہ غزل ہمارے تہذیبی تشخص کے بہت منفرد پہلوؤں کی غماز ہے اور ماضی، حال مستقبل کا بیک وقت احاطہ کرتی ہے۔ اختر الایمان کی یہ رائے کہ غالب غزل کا نقطہ عروج تھے، سراسر بے معنی ہے کیونکہ اس سے پہلے میر اور اردو کے دیگر غزل کے بڑے شعراء اپنے اپنے دور میں نقطۂ عروج تھے۔ غزل کی حیاتیاتی قوت اور توانائی کا

ISBN: 978-93-344-4743-9

ثبوت یہ ہے کہ وہ تمام نقطہ ہائے عروج کے بعد بھی سرگرم سفر رہی اور تمام مخاصمانہ اعتراضات کے بعد ایک اور نقطہ عروج تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ غزل کا عصری منظر نامہ زوال یا تکرار کا منظر نامہ ہے یا ہماری عصری انسانی صورت حال کے اظہار کا منظر نامہ۔ اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ادب کو جس میں غزل بھی شامل ہے، تہذیبی اظہار کی تجسیم تسلیم کرتے ہیں تو اس کو نیم وحشی صنف سخن کہنا نہ تہذیبی بصیرت کا اظہار ہے نہ تنقیدی بدبصیرت کا محض غیر محتاط توجہ انگیزی کی کوشش ہے۔ وہ لوگ جو صنف غزل کے موضوعات کی اعداد شماری کرتے ہیں وہ یا تو غزل کے بنیادی صنفی کردار سے واقف نہیں یا پھر سنسنی خیزی سے مرکز توجہ بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ غزل بطور صنفِ سخن قطعی طور پر موضوعاتی صنف سخن نہیں۔ وہ فرد سے اجتماع تک کثیر الجہات۔۔۔ جہان امکانات، جہان معانی کی صنف سخن ہے۔ ہرگز موضوعات اور مضامین کی فہرست نہیں ہے۔

غزل میں تجربہ کاری کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر آپ لفظیات کا دائرہ وسیع کرتے ہیں تو یہ نہ تو تجربہ کاری ہے اور نہ ہی غزل کا چہرہ بدلنے کی کوشش بلکہ لفظیات کا دائرہ وسیع کرنا تخلیقی عمل کا قائم و دائم حصہ ہے۔ اردو کے تعلق سے صرف دو قسم کے تجربات ہوئے ہیں۔ آزاد غزل۔ مظہر امام جس کے موجد ہیں۔ نثری غزل۔ جسے لکھنے کا بشیر بدر نے تجربہ کیا۔ نثری غزل کا تجربہ بشیر بدر کی ذات سے آگے نہیں جاسکا۔ آزاد غزل کا تجربہ کہاں تک آگے بڑھ سکا ہے، اس متنازعہ فیہ سوال پر بہر حال غور کرنے کی ضرورت ہے اس سیمینار میں غزل کے بارے میں جو ماہرین اپنے پرچے پیش کریں گے اُمید ہے، وہ غزل سے متعلق جملہ پہلوؤں پر تفصیل سے اظہار خیال کریں گے۔

آزادی کے بعد کی اردو نظم کی تازہ ترین صورت حال کے تعلق سے ہمارے عہد کے بعض ناقدین نے بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ میں نے بھی ایک ادنی قاری کے طور پر کچھ موقعوں پر بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ بہر حال اطمینان یا بے اطمینانی سے قطع نظر نظم کے حوالے سے کچھ سوالات میرے ذہن میں اٹھتے رہے ہیں اور میں ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا رہا ہوں۔ ان سوالات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

ا۔ حصول معیار کے اعتبار سے ہم آزادی کے بعد کے برسوں کی نظم کو یکساں معیار کی نظم کہیں گے یا حال کے برسوں کے تعلق سے کسی حد تک روبہ زوال نظم؟

۲۔ کیا ترقی پسند تحریک سے وابستہ نظم کی طرح پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں دہائی کی نظم بھی مخصوص موضوعات کے اردگرد گھومتی ہے یا پھر متنوع اور مختلف النوع وسیع دائرہ کار کی نظم ہے؟

۳۔ کیا شاعری اپنی بنیادی نوعیت کے اعتبار سے مکمل ترسیل کی کفیل ہے۔ اگر ہے تو کیسے اور کس طرح اور اگر مکمل ترسیل یا خبروی ترسیل میں کامیاب ہے تو کس طرح؟

۴۔ تجربہ کاری ظاہر ہے تخلیقی دریافت کا حصہ ہے لیکن کیا یہ عمل نظم وضبط سے بے نیاز ہے۔ پابند نظم، آزاد نظم، نظم معرا۔ ان سب کا تخلیقی نظم وضبط اردو کے تعلق سے شناخت کے معیار اور اصول قائم کر چکا ہے۔ لیکن کیا نثری نظم کے تعلق سے یہ ممکن ہے؟ اردو زبان میں نثری نظم مصرعوں اور سطروں کی صورت میں کیوں لکھی جاتی ہے؟ کیا پیرا گراف کی صورت میں نثری نظم ڈرافٹ کرنا بہتر ہے یا مصرعوں اور سطروں کی صورت میں لکھنا۔ اس نظم کو ہم کیا کہیں گے جس میں کچھ مصرعے دانستہ طور پر یا غیر ارادی طور پر بحر ووزن اور رسمی آہنگ کے تقاضے پورا کرتے ہیں جبکہ دوسرے خالص نثری سطریں ہوتے ہیں۔ ان HYBRIE قسم کی تحریروں کی اشاعت کیا رسائل وجرائد کی مدیروں کی کشادہ دلی کا ثبوت ہے یا ان میں سے بعض کی لاعلمی اور بے توجہی کا۔۔؟

۵۔ کیا حمد، نعت، ہائیکو، دوہا، ثلاثی ماہیہ، کنڈلی میں طبع آزمائی کسی تخلیقی حصول کی حامل ہے یا محض لفظی کسرت اور تفضیع اوقات؟۔ یہ سوال غور طلب ہے۔

پچھلے پچاس برسوں میں اردو شعرا نے دیگر ہندوستانی زبانوں اور بعض غیر ملکی شاعروں سے بھی رابطہ قائم کیا ہے۔ یہ ثقافتی رابطہ بہت سے امکانات کا حامل ہے۔ اس رابطے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اردو زبان کے شعرا کو بہت سے انسانی تجربات اور طریق کار کے مختلف پہلوؤں اور جمالیاتی لطف وانبساط سے روشناس ہونے کا موقع ملا ہے۔ اردو شاعری کے جو تراجم ہندوستانی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں ان سے متعلقہ مسائل اور حصول معیار پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک اہم سوال میرے ذہن میں اکثر اٹھتا ہے۔ تبدیلیوں کی برق رفتار، ٹکنالوجی اور میڈیا کی یلغار کے درمیان کیا کوئی قوم، کوئی ثقافت، کوئی گروپ۔ یا ان سے متعلقہ افراد یا ادارے اپنا محدود مخصوص EXCLUSIVE تہذیبی، ثقافتی تشخص قائم رکھ سکتے ہیں؟ کیا کوئی زبان دیگر زبانوں کے لسانی اثرات اور ثقافتی دخل اندازی سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ دور حاضر میں جب ہم دنیا کو گلوبل ولیج کے طور پر دیکھنے لگے ہیں تو اردو زبان، اردو ادب اور اردو شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کی اس تناظر میں

کیا صورت ہوگی۔

پچھلے پچاس سال کی اردو شاعری اور اردو ادب کے تعلق سے کچھ اور مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔

کتابوں کی اشاعت اور فروخت میں کمی کو بعض اوقات ہم میڈیا کی یلغار سے منسوب کرتے ہیں۔ اردو زبان کی تعلیم کے خاطر خواہ وسائل کے فقدان یا ان کی کمی کو بھی بعض اوقات ہم اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس سوال پر بھی بہر حال غور کرنے کی ضرورت ہے کیا وہ تجربہ جو ہم اپنی شاعری اپنے ادب میں پیش کر رہے ہیں، سامعین یا قارئین کے ساتھ کسی جذباتی یا فکری رابطے کا کفیل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ کس انداز سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور اگر یہ رابطہ پیدا نہیں ہو سکا تو یہ ہماری ناکامی کا ثبوت ہے یا سامعین اور قارئین کی بے حسی کی علامت؟ وہ زبانیں جنہیں وسیع پیمانے پر سامعین اور قارئین کا فیض حاصل ہے یقیناً مضامین کے انتخاب سے لے کر اسالیب اظہار تک دو طرفہ ابلاغ و ترسیل سے ثمر آور ہوتی ہیں۔ جب زبانیں سکڑنے لگتی ہیں تو بعض اوقات جذباتی اور فکری انجماد اور عدم تحرک کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کے شاعر، ادیب، فنکار خود مرکزیت کا شکار ہونے کے خطرے کی حدود میں آ جاتے ہیں۔ اردو زبان کے تعلق سے اس مسئلے پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پچھلے پچاس برسوں میں اردو زبان کے رسم الخط کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے۔ اردو زبان کا رسم الخط بہر حال اس کی تہذیبی شناخت کی تجسیم ہے۔ اس کا تحفظ اس کا ثقافتی تسلسل ہے۔ اس کی قوت ہے۔ غالباً یہی وہ قوت ہے جو اہم اردو ادب اور اردو شاعری کو ہو بہو اپنی اصل شکل میں دیوناگری رسم الخط کے ذریعے سب سے پہلے ہندی میں اور پھر دیگر ہندوستانی زبانوں تک لے گئی ہے۔ بعض اصناف سُخن، غزل، رباعی صرف اُردو زبان تک محدود نہیں رہیں بلکہ دیگر ہندوستانی اور کچھ غیر ملکی زبانوں میں بھی قبولیت اور مقبولیت سے سرفراز ہو چکی ہیں۔ بہتر رویہ غالباً یہ ہوگا کہ اپنے رسم الخط کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں تک رسم الخط کی تبدیلی اور تراجم کے ذریعے پہنچنے کے امکانات کو مزید توجہ سے دریافت کرنے کی کوشش کریں۔

مشاعرہ اردو شاعری کا صدیوں پرانا ثقافتی ادارہ INSTITUTION ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں لیکن یہ مشاعرہ ہی ہے جو اردو شاعری (ترجیحاً غزل، قطعہ، رباعی) کو وسیع پیمانے پر سامعین تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ وہ لوگ جو مشاعرہ کی مخالفت کرتے ہیں یا اچھی غزل لکھ نہیں سکتے یا پیش کرنے کے فن سے ناواقف ہیں یا ایسی نظم لکھتے ہیں جو ترغیب معانی اور حسن پیش کش سے عاری ہے مشاعرے کے علاوہ اردو شاعری کے بھر پور تعارف کے لیے شاعروں کے ساتھ تفصیلی معلومات کی محفلوں کا انعقاد کرنے کی افادیت پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یورپی زبانوں میں شعرا سے تفصیلی ملاقات کی محفلوں کا تو رواج عام ہے لیکن اُردو میں ان کا چلن فی الحال کم ہے۔

آخر میں ایک اور اہم مسئلے کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔ اردو کی وہ شاعری جسے ہم نسائی حسیت کے اظہار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں وہ گھٹن خانگی مسائل اور مرد کے حاوی ظالمانہ کردار سے آگے کیوں نہیں جا سکی؟ یہ سوال غور طلب ہے۔

ظاہر ہے میں نے آزادی کے بعد کی اردو شاعری کے صرف چند پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، اور وہ بھی اپنے محدود انداز میں۔ سیمینار کے تین روز تک ہونے والے مختلف اجلاس میں مجھے پوری امید ہے ماہرین ادب مجھ سے کہیں بہتر اور وسیع عالمانہ انداز میں آزادی کے بعد کی اردو شاعری کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے اور سیمینار کے شرکا کو آزاد اظہار اور رابطوں کے بہت سے رسمی اور غیر رسمی مواقع فراہم ہوں گے۔ میں سب دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کا خلوص دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

☆☆☆

علیم صبا نویدی کی غزل گوئی

ڈاکٹر محمد رفیق محمد حنیف
اسسٹنٹ پروفیسر' انگوش راؤٹو پے کالج' جالنہ

علیم صبا نویدی (اصل نام: علیم الدین) 28 فروری 1942ء کو ریاستِ تمل ناڈو کے ضلع شمالی آرکاٹ کے قصبہ امور (والا جاہ پیٹ) میں پیدا ہوئے۔ والد سید غوث بادشاہ حسینی اور والدہ شرف النساء پیرانی بی تھیں۔ خاندان کے بزرگ شاہ محمد امین الدین چشتی قادری نے ان کے روشن مستقبل اور فن کارانہ صلاحیتوں کی پیشن گوئی کی تھی، جو بالآخر سچ ثابت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولانا راجی صدیقی کے زیرِ تربیت حاصل کی۔ مدرسہ اعظم چنئی سے ایس ایس ایل سی، نیو کالج چنئی سے پی یو سی، اور 1960ء میں جامعہ علی گڑھ سے ادیبِ کامل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے انگریزی میں بی اے کیا۔ تعلیم کے بعد پورٹ ٹرسٹ مدراس میں ملازمت اختیار کی اور طویل عرصے تک خدمت انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے۔

ادبی سفر کا آغاز 1958ء میں افسانہ ''ایک رات'' سے ہوا جو 1960ء میں ماہنامہ ''پاکیزہ'' میں شائع ہوا۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''روشنی کے بھنور'' 1967ء میں منظرِ عام پر آیا، اس کے بعد ''شگاف در شگاف''، ''اجلی مسکراہٹ'' اور ''سفر لا سفر'' نے ان کے ادبی مقام کو مستحکم کیا۔ علیم صبا نویدی نے اردو تحقیق، تنقید اور تاریخ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ''تاریخ ادبِ اردو ٹمل ناڈو'' ان کا عظیم کارنامہ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل 2600 صفحات کا ایک علمی خزانہ ہے۔ اس کے علاوہ ''ٹمل ناڈو میں اردو افسانہ'' جیسی اہم تصنیف بھی ان کی علمی بصیرت کی شاہد ہے۔ ان پر معاصر ادباء و نقادوں نے کئی کتابیں لکھیں، مثلاً ''عکس در عکس'' (یعقوب اسلم عمری)، ''علیم اور اردو ادب کے نئے زاویے'' (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) اور ''علیم صبا نویدی ہمہ جہت فنکار'' (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)۔

ان کی علمی و ادبی زندگی میں ان کی بیٹی ڈاکٹر جاویدہ حبیب نے بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ اپنے والد کے تمام تحقیقی و اشاعتی کاموں میں شریک رہیں اور کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین میں معاون رہیں۔ علامہ ناوک حمزہ پوری نے علیم صبا نویدی کو ''بابائے اردو ٹمل ناڈو'' کا خطاب دیا، جو آج ان کے نام کا حصہ بن چکا ہے۔ مختلف اردو اکیڈمیوں اور اداروں نے بھی ان کی خدمات کے اعتراف میں متعدد اعزازات عطا کیے۔ ان پر کئی تحقیقی مقالے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کام انجام دیے جا چکے ہیں۔ علیم صبا نویدی نہ صرف بلند پایہ ادیب تھے بلکہ ایک مخلص، منکسر المزاج اور انسان دوست شخصیت کے مالک بھی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اردو کے فروغ کے لیے وقف کر دی۔ ان کا وجود واقعی ٹمل ناڈو کی اردو تاریخ میں ''صبا کا جھونکا'' تھا، جو ادبی دنیا میں نئی تازگی، تحقیق اور شعور کی نوید بن کر آیا۔

علیم صبا نویدی کی غزل گوئی

علیم صبا نویدی اردو شاعری کے ایسے درخشاں ستارے ہیں جنہوں نے اپنی غزلوں کے ذریعے اردو ادب میں ایک انفرادیت پیدا کی۔ ان کی غزل گوئی اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں ایک نمایاں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی غزل گوئی کا سفر چار مجموعوں پر محیط ہے جو ان کی فنی ریاضت اور فکری بلوغت کے مظاہر ہیں۔

1.) طرحِ نو (1974ء) .2) فکرِ بر (1981ء) .3) نقش گیر (1982ء) .4) اثرِ خامہ (1991ء)

بعد ازاں ان چاروں مجموعوں کو یکجا کر کے "عرشِ غزل" کے نام سے کلیات کی صورت میں شائع کیا گیا، جس نے ان کی شعری زندگی کا جامع احاطہ کیا۔ یہ کلیات نہ صرف ان کے فنی ارتقاء کا پتہ دیتی ہے بلکہ اردو غزل کے روایتی سانچے میں ان کے جدید فکری میلانات کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

علیم صبا نویدی کا شعری مزاج

علیم صبا نویدی کی غزل گوئی روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے یہاں کلاسیکی رنگ کی سنجیدگی بھی ہے اور جدید شعور کی تازگی بھی۔ ان کی غزلیں محض عشقیہ واردات کا بیان نہیں بلکہ زندگی کے فلسفے، انسانی احساسات اور داخلی کشمکش کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ خود اپنے فن پر اعتماد کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

ISBN: 978-93-344-4743-9

خامہ نقش گیر میرا فن، شاہدِ باضمیر میرا فن
طرزِ لاریب، لاشریک نقوش، دورِ شاہی کا میر میرا فن

یہ اشعار ان کے فنی شعور اور خود اعتمادی کی علامت ہیں۔

داخلی وخارجی شعور

علیم صبا نویدی کی شاعری میں خارجی مشاہدے کے ساتھ داخلی عرفان کا گہرا امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ انسان کے اندر کے درد، کرب، خوشی اور کشمکش کو بڑی فنی مہارت سے غزل کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے کلام میں ذات کے عرفان اور زندگی کے اسرار کو ایک جمالیاتی پیرائے میں برتا گیا ہے۔ درد واحساس، خود شناسی اور کائنات سے ربط، ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان کے یہ اشعار ان کی داخلی آگہی کی بہترین مثال ہیں:

درد کی پہچان مشکل سے ہوئی
راز زخموں کی زبان بن کر کھلا
ہر سفر میں لا سفر میرا سفر
میرا ظاہر ڈوب کر اندر کھلا

ان اشعار میں ایک ایسے شاعر کا دل بولتا ہے جو اپنے باطن سے ہمکلام ہے اور جو زندگی کے ہر تجربے کو فن کے دائرے میں ڈھالنے کا ہنر رکھتا ہے۔

اسلوب اور فکری جہت:۔

علیم صبا نویدی کی غزلوں میں زبان کی روانی، معنی کی گہرائی اور لہجے کی نرمی ایک دلکش امتزاج پیدا کرتی ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعے احساسات کی باریکیوں کو یوں اجاگر کرتے ہیں کہ قاری براہِ راست ان کے جذباتی تجربات سے جڑ جاتا ہے۔ ان کا اسلوب نہ محض علامتی ہے، نہ کلی طور پر بیانیہ، بلکہ ایک معتدل توازن رکھتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر فتح پوری لکھتے ہیں:

"علیم صبا نویدی کی غزلوں پر غالب یا میر کا اثر نہیں، ان کا اپنا لہجہ، اپنا اسلوب اور اپنی فکر ہے۔"

یہی انفرادیت انہیں اپنے عہد کے دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

زندگی کے المیے اور غزل کی نرمی:۔

علیم صبا نویدی کے فن کا ایک پہلو داخلی دنیا کا ادراک ہے، تو دوسرا سماجی شعور اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کا بیان۔ ان کی ازدواجی زندگی کا المیہ ان کی شاعری میں گہرے اثرات چھوڑ گیا، جس نے ان کے لہجے کو درد اور نرمی سے آشنا کیا۔ ان کے اشعار میں درد، احساسِ محرومی اور تنہائی کا رنگ اسی تجربے کی دین ہے۔ مگر یہی دکھ ان کے فن کے لیے توانائی کا سرچشمہ بنا۔

کاظم نائطی کے الفاظ میں:

"علیم کی شاعری کو نیا لہجہ، نیا آہنگ اور نئی روح بخشنے میں ان کے ذاتی المیے کا بڑا ہاتھ ہے۔"

ان کے اشعار میں یہی تجربہ درج ذیل انداز میں جھلکتا ہے:

چادر کسی نے دی نہیں مجھ کو خلوص کی
برسات میں دکھوں کی نہایا ہوا تھا میں
سب پہ ظاہر ہوتی ہے یہ دنیا کیوں
سب میں رہ کر بھی میں اکیلا کیوں

یہ اشعار ان کے باطنی کرب اور انسان دوستی کی گواہی دیتے ہیں۔ انھوں نے غزل کو محض جذباتی اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اسے فکری تجربے اور تخلیقی انکشاف کا آئینہ قرار

دیا۔ وہ اپنی ذات کو کائنات کے وسیع تناظر میں پیش کرتے ہیں، اور یہی ان کی شاعری کی انفرادیت ہے۔

علامتوں کا استعمال — آئینہ بطور استعارہ:۔

علیم صبا نویدی کے اشعار میں تخیل کی لطافت، احساس کی نزاکت اور لفظوں کی نرمی نمایاں ہے۔ ان کی غزلیں انسان کے داخلی کرب کے ساتھ ساتھ کائناتی شعور کو بھی مجسم کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ''آئینہ'' ایک نمایاں علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ ان کے نزدیک آئینہ خودی، شناخت اور سچائی کی علامت ہے۔ ان کے اشعار میں یہ علامت مختلف پہلوؤں سے جلوہ گر ہے:

جب سے میں ہوگیا ہوں آئینہ
تب سے پتھر پکارتا ہے مجھے
عکس ہی کو آئینے کی تھی تلاش
آئینے پر جسم کا جوہر کھلا

ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا کہنا ہے:

''عرشِ غزل کی ہر غزل میں کہیں نہ کہیں آئینے کی کرن ضرور جھلملاتی ہے، گویا یہ ان کی تخلیقی پہچان بن چکا ہے۔''

انسان دوستی اور عصری شعور

علیم صبا نویدی کی شاعری انسان دوستی اور زندگی کے احترام سے معمور ہے۔ وہ جدید انسان کے دکھ، محرومی اور وجودی اضطراب کو فکری انداز میں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر افتخار حیات کے مطابق:

''علیم صبا نویدی کی شاعری کا مرکز جدید انسان ہے، جو اپنے وجود کی بازیافت کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔'' ان کے اشعار میں زندگی کے تمام رنگ اور تضادات ایک متوازن فکری شعور کے ساتھ نظر آتے ہیں:

میں قطرہ ہوں مری وسعت تو دیکھو
سمندر کا سمندر پی گیا ہوں!
میں نے سچائی کی سولی کو مقدر جانا
جب زمانہ تھا یہاں جھوٹی گواہی کی طرف

علیم صبا نویدی کی غزل گوئی اردو شاعری کے جدید رجحانات میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں ذات کی تلاش، انسان دوستی، دردِ دل، احساسِ جمال، طرزِ احساس، زبان کا بانکپن، فکری گہرائی اور روحانی رنگ یکجا ہیں۔ انہوں نے روایتی غزل کو جدید انسانی تجربے سے ہم آہنگ کر کے ایک نئی سمت عطا کی۔ ان کی غزلیں زندگی کی پیچیدگیوں اور انسان کے داخلی سفر کی داستان ہیں۔ ان کا فن ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ شاعر محض الفاظ کا معمار نہیں، بلکہ روح کے آئینے میں جھانکنے والا ابصیرت مند مسافر ہے۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

جدید اردو شاعری کے رجحانات

ڈاکٹر پٹیل شبینہ بیگم مجاہد
اسسٹنٹ پروفیسر، شرد چندر کالج، شہر ادھون

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کا سانحہ بھی ہوا اور اس کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کا خونیں سلسلہ بھی شروع ہوا جس نے سماج کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا انسان انسان کا دشمن بن گیا اقتدار کی بھوکی سیاست نے اخلاق اور مذہب کے تمام اصولوں کو طاق پر رکھ کر ظلم و تشدد کا بازار گرم کیا ان تمام حالات نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے اردو شاعری جواب تک ترقی پسندی کے ماتحت انسان کی عظمت کے گیت گا رہی تھی یکجہتی اور ہم آہنگی کا پیغام دے رہی تھی۔ دلدوز سانحے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ جس انقلاب کے خواب اس نے دیکھے اور دکھائے تھے۔ جس اجتماعیت کا راگ اس نے الاپا تھا وہ سب آزادی کے بطن سے اٹھنے والے طوفان کی گرد میں کھو چکی تھی اور انسان مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہو گیا۔ مغرب و مشرق میں دوسری جنگ عظیم کی تباہی کے اثرات بھی پڑے اور پوری دنیا میں انسان ایک روحانی بحران سے دوچار ہوا ملک میں ترقی پسندی کی تحریک بھی آزادی کے بعد کمزور پڑنے لگی۔ کیونکہ اس میں یکسانیت پیدا ہونے لگی۔

آزادی کے بعد انقلاب اور اجتماعی اور فلاح اور یکجہتی کے نعرے کھوکھلے لگنے لگے۔ لہٰذا ایسی قومی اور عالمی صورت حال میں شاعروں کو کسی نئے پیرایہ اظہار کی تلاش تھی وہ کسی تازہ ہوا کے جھونکے کے منتظر تھے۔ اسی دوران شاعری کے ایک گروہ نے حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کو بالعموم ایک دوسرے کی صد قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ داخلیت اور مادیت و روحانیت کی بناہ پر ان دونوں میں واضح اختلاف موجود ہے۔ ترقی پسندوں نے اجتماعیت پر زور دیا جبکہ حلقے والوں نے انسان کو اپنی شخصیت کی طرف متوجہ کیا ایک کا عمل بلا واسطہ خارجی اور ہنگامی تھا جبکہ دوسری کا بلا واسطہ داخلی اور آہستہ ہے۔ حلقہ ارباب ذوق ایک مدید سے ادبی خدمات کرتا چلا آ رہا ہے۔ ادیبوں کی یہ جماعت ہے جو ادب اور ثقافت کو پروان چڑھاتی رہی ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کو شعراء نے تازگی اور توانائی عطا کی اس تحریک کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے نئے لکھنے والوں کو شدت سے متاثر کیا اور اب جو تجربات لکھنے والے کر رہے اس کی تخلیقی اساس حلقہ ارباب ذوق کی تحریک پر ہی استوار ہوئی ہے۔ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک طوفانی تحریک تھی۔ اس نے اردگرد کو اپنی لپیٹ میں لے کر خارجی زندگی کا عمل تیز کر دیا اس تحریک نے جذباتی تحرک اور تخلیق کاری میں فاصلہ پیدا نہیں ہونے دیا چنانچہ اس تحریک کے متوازی ایک اور تحریک نظر آتی ہے۔ جس نے سماجی جمود کے بجائے ادب انجماد کو توڑنے کی کوشش کی۔ ترقی پسند تحریک کے ادب پر پابندیاں لگنا شروع ہو گیئں جس کی بنیادی وجوہات درج ذیل ہے۔

سیاست کا رجحان زیادہ ہو گیا، نعرہ بازی اور انقلابی رنگ زیادہ آ گیا تھا، ادبیت کا رنگ پھیکا پڑنا شروع ہو گیا، ترقی پسند ادب میں اکتسابی رنگ بڑھ گیا تھا، ترقی پسند ادب کے موضوعات محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

ان اسباب کے باعث ادب میں ایک نئے فکری زاویے کا آغاز ہوا جسے ہم حلقہ ارباب ذوق کے نام سے جانتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے مادی وسائل پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر حلقے ارباب ذوق نے مادیت سے گریز اختیار کر کے روحانیت اور داخلیت کو فروغ دیا۔ ان کا مقصد ایک ایسی مجلس کا قیام تھا جہاں ادیب اپنی افسانوی کہانیاں سنا کر اپنے احباب کی رائے حاصل کر سکیں۔ حلقہ ارباب ذوق کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت، نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم و تفریح، اردو لکھنے والوں کے حقوق کی ضمانت اردو ادب و صحافت کے ناسازگار ماحول کو صاف کرنا۔

حلقہ کی زندگی کا تنوع اور اس کے داخل حسن کو اہمیت دی اور کسی موضوع پر اظہار قدغن نہیں لگائی۔ حلقہ ارباب ذوق کے تجربات کا ایک سرا زندگی اور دوسرا فن سے ملا ہوا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کا اہم کارنامہ نئی تحریروں کا اجرا دبھی ہے۔ نئی تحریریں حلقے کی مجالس کی طرح آزادی اظہار کا فورم تھا۔ اس نے دوسری زبانوں کے اہم نظریاتی مضامین کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ یوں تو زمانے میں سے مسائل سر اٹھاتے ہیں اور ان میں کچھ شعر و ادب کا موضوع بھی قرار پاتے ہیں۔ یہ مسائل فرد کی اپنی ذات کے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور بعض بیرونی معاملات بھی ہو سکتے ہیں جن کا ادراک فن کو ذاتی شعور، تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں طبقے آزمائی پر آمادہ کرتا

 ISBN: 978-93-344-4743-9

ہے۔پھر وہ انھیں ادب کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کی تحریک کو ماہ وسال کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

خالص میکانکی اور زمانی نکتہ نظر سے میں وہ شاعری مراد لیتا ہوں جو انیس سو پچپن کے پہلے ادب کو میں نیا نہیں سمجھتا ہوں۔اس کا مطلب یہ نہیں کے بعد جو بھی کچھ لکھا گیا وہ سب نئی شاعری کی زمرے میں آتا ہے۔اور یہ بھی نہیں کہ انیس سو پچپن کے پہلے کے ادب میں جدیدیت کے عناصر نہیں ملتے۔داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم،خوف تنہائی،کیفیت،انتشار،اور ذہنی بے چینی کا اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی اور میکانیکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی،ذہنی کھوکھلے پن،روحانی،احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔یوں تو حالی اور محمد حسین آزاد کی جدید شاعری کا نقطہ آغاز خیال کیا جاتا ہے۔جس کے تحت،انھوں نے روایتی شاعری سے قدرے انحراف کر کے نئے زمانے کے تقاضوں کو موضوع سخن بنانے پر زور دیا اور غزل کے مقابلے میں نظم کے فارم کو بروئے کار لانے کا مشورہ دیا۔حالانکہ وہ ان شعبوں میں کوئی غیر معمولی تبدیلیاں پیدا نہیں کر پائے۔اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں۔

شاعری کے سلسلے میں جدید کی صفت بطور اصطلاح ہمارے ہاں اس وقت استعمال میں آئی جب آزاد اور حالی نے شعوری طور پر مقصدی،افادی اور اصلاح قسم کی نظمیں لکھنے اور اس رجحان کو فروغ دینے کی کوشش کی اس وقت سے لے کر اب سے کچھ دنوں پہلے تک جدید شاعری کے جتنے رجحانات سامنے آئے ہیں۔ان کے پیچھے زمانہ حاضر سے متعلق کسی نہ کسی مسلک یا نصب العین کا تصور کارفرما رہا ہے اوقات دوسرے رجحان کی ضد یا ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔

حالی اور محمد حسین آزاد کوششوں سے ایک نئی سمت اردو شاعری کے سفر کا آغاز ہوا مگر اس میں قدیم طرز شاعری سے انحراف کا پہلو نمایاں تھا اسی کے ساتھ غزل کے مقابل میں انھوں نے نظم کو ترجیح دی کیونکہ شاعری کا فارم نئے عہد کے اظہار اور نئے موضوعات کو بڑے پیمانے پر پیش کرنے کے لئے مناسب تھا۔مذکورہ دونوں فنکاروں کی جدت پسندی اس رجحان سے قدرے مختلف تھی جو آگے جا کر جدیدیت کے نام سے پہچانا گیا۔حالی اور آزاد کے متعلق شمیم حنفی لکھتے ہیں۔

حالی اور آزاد کی اصلاح پسندی ان کے تخلیقی مزاج سے زیادہ ان کے عہد کی ترجمانی ہے۔ان کے خیالات میں تضاد نیز ان کے انفرادی میلان طبع اور ان کے عہد کے تقاضوں میں کش مکش کا سبب یہی ہے کہ ان کی شخصیت ان کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں تھیں اور اس مزاج سے ان کا رشتہ تخلیقی یا فنی کم،شعوری زیادہ تھا۔جدید شاعروں نے زندگی کے ابھرتے ہوئے زاویوں کو محسوس کر کے نئی واردات مرتب کی اور اپنے مشاہدات اور تجربات کو لسانی پیرائے میں پیش کیا انھوں نے روایتی شاعری کے متعین وسائل کے بجائے اپنے ادبی وسائل کو استعمال کیا۔جدید شاعری کے علمبرداروں کے ذہن میں مخصوص لائحہ اور منصوبہ بندی ضرور تھی جس نے اس رجحان کی طرف چند اشارے شمس الرحمٰن فاروقی کے مذکورہ بالا بیان میں بھی ملتے ہے۔حالی اور محمد حسین آزاد کے بعد حسرت موہانی کی غزلوں میں جو نیا پن نظر آتا ہے۔اسی دور میں شاذ عظیم آبادی اور بعض دیگر شعراء کی غزلیں بھی ایک نئے انداز کا احساس دلاتی ہیں۔

جدید شاعری کے تحت رونما ہونے والا نیا پن داخلی اور خارجی تبدیلیوں سے عبارت ہے۔جدیدیت کا تصور ادب میں نئے پن کو اختیار کرنے اور روایتی موضوعات اور طرز اظہار کے برتنے سے زیادہ بدلتی ہوئی زندگی کو ادب میں پیش کرنے پر زور دیتا ہے۔انیسویں صدی اور اس سے پہلے سے وجود میں آنے والے سائنسی نظریات ایجادات اور علمی انکشافات نے انسانی سوچ کو عالمی پیمانے پر متاثر کیا جن کا اثر حیات انسانی پر پڑنا لازمی تھا۔جن ذہنی اور قلمی سہاروں نے صدیوں سے انسانی زندگی کی راہیں ساری ساری دنیا میں متعین کر رکھی تھی۔کائنات اور انسان سے متعلق سائنسی انکشافات نے عقائد اور نظریات کے وہ قلعے مسمار کر دئے جدیدیت اسی نئے عہد میں سانس میں لینے والے انسان کی محسوسات اور خیالات کا فنکارانہ اظہار ہے۔ذیل کے اشعار ان کی نمائندگی کرتے ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی:

”بوڑھی چیلیں بارہاں اٹھکیلیاں بھرتی رہیں

اپنا میر کارواں اکثر جواں مارا گیا۔“

وزیر آغا:

” سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

ISBN: 978-93-344-4743-9

شام ہوچکی تھی اور پرندہ سفر میں تھا ۔''

جنسی بے راہ روی، فحاشی، عریانی اور جنسی مسائل بھی جدید شاعری کا موضوع رہا ہے۔ ہر چند قدیم شاعری میں اس پہلو کو اشاروں اور کنایوں میں اور واضح طور پر بھی خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جدید شاعری کا اس طرف دیکھنے کا انداز الگ ہے۔ انسان کی اس جبلت کے نفسیاتی تعبیریں اور سائنسی نظریات کے فروغ کے ساتھ ہی زمانے نے کروٹ بدلی اسی لئے جدید شاعری میں اس سلسلے کا اظہار بھی بے قدرے بے باک ہے۔

بشیر بدر:

'' رات کا انتظار کون کرے

آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا۔''

نئے عہد کے مسائل اور نئے انسان کے احساسات انوکھا لب ولہجہ اور نیا انداز طلب کرتے تھے۔ ایک طرف جدید شاعری نے اس تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کی جدید نظموں میں ہماری زندگی کی جیتی جاگتی تصویر مل جاتی ہے اور عام انسان کا کرب جدید شاعری میں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ہمارے عہد کی عکاسی ہے۔ اور انسانی دور کی وہ تصویر جو اس سے پہلے ناپید تھی۔ جدید شاعری ان احساسات اور خیالات کا فنی اظہار ہے۔ جس نے نئے عہد کے مسائل سے سر اٹھایا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی وہ معاملات، حالات اور مسائل اسی طرح برقرار ہیں اور ان کی وہی گونج نئے انسان کے اندر موجود ہے۔ اس لئے جدید دور موجودہ زمانے میں بھی اپنی معنویت کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ ادیب اپنی زندگی میں خواہ کیسا ہی ہو مگر جب وہ فن کی بات کرتا ہے۔ تو سچائی اور حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جس ملک میں مختلف قسم کی تحریکیں چل رہی ہوا ایسا ممکن نہیں۔ انسانیت کی ناقدری، ناانصافی، رنگ اور نسل کا امتیاز جیسے مسائل جہاں موجود ہوں وہاں ادیب چپ کیسے رہ سکتا ہے۔ جب حب الوطنی، سماجی مسائل اور ترقی، جنگ اور امن، رنگ اور نسل یہ اپنے موضوعات ہیں۔ جن سے کسی نہ کسی سطح پر ہمارا تعلق ضرور رہتا ہے۔ انسانیت کے خلاف جب جب ظلم ہوگا۔ تو ادیب اپنی آواز ضرور بلند کریگا۔ دوسری عالمی جنگ سے نبرد آزما تھی تب ساحر لدھیانوی نے کہا:

'' ہم گھروں پر گریں کہ سرحدوں پر

روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے

کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے

زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں کے پیچھے ہٹیں

کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے

فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ

زندگی میتوں پہ روتی ہے۔،،

اردو شاعری کی تاریخ میں حالی اور شبلی دو ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ملک کی یکجہتی اور حب الوطنی کا اظہار سب سے پہلے کیا:

'' بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنوں

اٹھو اہل وطن کے دوستوں بنو

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر

نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ملک ہیں اتفاق سے آزاد

شہر ہیں اتفاق کھو بیٹھی

ISBN: 978-93-344-4743-9

اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی ۔‘‘

پنڈت برج نرائن چکبست کا نام اردو شاعری کی تاریخ میں کافی اہم ہے۔ان کی شاعری میں حب وطن اور قومی یکجہتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان کی شاعری کا زندگی سے ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔ جہد آزادی میں ان کی شاعری وقت کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھی ۔چکبست کی نظموں میں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر سیاسی واقعات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے۔ جوانوں کے جینے کے ڈھنگ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

’’ موجودہ ہے جن بازوؤں میں زور جوانی
طوفان سے انہیں کشتی قومی ہے بچانی
پر ہے مئے غفلت سے سروں میں یہ گرانی
آ رام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی
پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمت مردانہ نہیں ہے ۔‘‘

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن میں آزادی کے متوالوں کی ہمت کو بڑھانے کی کوشش نظر آتی ہے۔انگریزوں کے خلاف جوش ملیح آبادی کے جذبات کا طوفان آتش فشاں کی طرح پھٹا پڑتا ہے۔اس سے ان کے سینے کے اندر کے طوفان، جلن اور تپش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

’’ کیوں ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
بھوکو کی نظر میں بجلی ہے تو پوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے ،دم توڑ رہی ہے تدبیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں۔‘‘

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

جدید شاعری کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر واسیعہ بیگم شیخ احمد
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو
شیواجی کالج اودگیر

جدید شاعری پر غور کیا جائے تو یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اردو شاعری اصل میں نہ کوئی تحریک ہے نہ ہی کوئی دستورعمل۔ بلکہ یہ تحریک تو ایسی ذہن کی پیداوار ہے جو شاعرانہ طرز احساس پر منحصر ہے یہ جدیدیت کی ایک ایسی رو ہے جو کسی تقلید یا کسی اصول وضابطے کی قائل نہیں۔ جدید شاعری دراصل ایک آزادانہ احساس کا آزادانہ اظہار ہے جس کو جدید حسیت کہا جا سکتا ہے۔

جدید اردو شاعری کے آمد کے لیے ایک مکررسی فضاء پہلے ہی سے موجود تھی یعنی غلامی، سیاسی اور ذہنی افکار، مذہبی جھگڑے، سرمایہ دارانہ نظام وغیرہ غرض ان سب نے مل کر جدید اردو شاعری کی آغاز کا اعلان کیا کیوں کہ اس پر آشوب ماحول میں شاعرانہ ذہن نے بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ بنایا، بہت کچھ بگاڑا۔ یہ تمام مسائل شاعر کے ذہن و دل کو بری طرح سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا جس کی وجہہ سے جدید شعرانے اپنے جذبات واحساسات کا حقیقت مندانہ جائزہ لیتے ہوئے اس کو ایک جدید شعری پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور حقیقت کا یہ احساس جدید شاعری کو قدیم شاعری سے ممتاز کرتا ہے۔

جدید اردو شاعری کے آغاز میں صرف ادبی روایات کے ساتھ اس کے پیچھے وہ سارا علمی وادبی سرمایہ بھی موجود تھا جو مغربی ادب کی دین تھا یعنی انگریزی اور یوروپی ادب کے ذخیرے ہیں۔ مثلاً:

ایلیٹ کا تفکر، رومانی شاعروں کا سوز و گداز، حقیقت پسندی کے ساتھ نئے نئے تجربات وہیتوں کا وجود میں لانا غرض یہ تمام کی وجہہ سے جدید اردو شاعری نے اپنا دائرہ وسیع کیا اور یہ تمام رجحانات کو اپنی شاعری میں سمو دیا کیوں کہ یہ امر یقینی ہے کہ جب کوئی تحریک یا رجحان مغربی ادب میں شروع ہو کر ختم بھی ہو جاتی ہے تو اس کو دوبارہ یہاں پیدا کیا جاتا ہے تا کہ اردو ادب یا اردو شاعری نئے مسائل سے آشنا ہو سکے اس طرح ہوتے ہوئے وہ تمام رجحانات جو مغربی ادب میں موجود تھے یہاں جدید شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

جدید اردو شاعری دراصل بیسویں صدی عیسوی میں سائنس اور تکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور اس سے پیدا شدہ خوف وہراس نے جذبے کا نتیجہ تھی۔ چوں کہ مشینوں کی حکومت میں خود انسان بھی ایک مشین بن کر رہ گیا تھا جدید دور میں انسان سیاسی سماجی اخلاقی مذہبی اصولوں سے پوری طرح ٹوٹ سا گیا تھا۔ مثال کے طور پر میراجی کی نظم کا یہ بند:

شہروں کے فاصلے مٹے
نئی تعلیم آئی
تعلیم اور تجارت کی آسانیوں نے نئے مقامات کی سیر کرائی اور
گھریلو زندگی کا نقشہ مٹنے لگا
گھر سے دور ہو کر تنہائی کا احساس نشوونما پانے لگا
نہ راستوں کا یقین نہ منزلوں کا پتہ
فلک فلک ہے سیاہی۔ زمیں زمیں گہرا
نہ رنگ رنگ مناظر۔ نہ موسموں کی خبر

خلا میں گونج رہا ہے ہواؤں کا نوحہ
نہ آرزو۔نہ تمنا۔نہ کوئی خواہش دل
نہ انتظار کسی کا نہ اعتبار اپنا
نکل گیا ہے کبھی کچھ سیاہوں کا بھنور
کہ کھا گیا ہے سبھی کو شراب روحوں کا

چوں کہ زندگی ہمیشہ ایک سطح پہ قائم و برقرار نہیں رہتی سماج کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے جس کی وجہہ سے شعر وادب اور علم وفن میں بھی برابر تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہے لیکن عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ اسے قبول کرنے سے گھبراتے ہیں کچھ تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور کچھ فن کار ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر پرسکون فضا یا ان حالات کا بغور مطالعہ کر کے اسے (قاری کے) دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک قسم کا نیا پن موجود ہوتا ہے۔

جدید شاعری میں موجودہ عہد کی عکاسی نظر آتی ہے۔کیوں کہ جدید دور میں فکر کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔حرکت مسلسل سے موجودہ زندگی کی قدریں بن رہی ہیں اور اپنی قدریں ادب پر بھی اثر انداز ہوتی ہے صنعتی سماج کی ترقی سے انتشار، بے اعتمادی اور ہیجان کی فضاء پیدا ہوتی ہے جس کی وجہہ سے قلبی سکون مقصود ہوتا جاتا ہے مثال کے طور پر عزیز قلبی کے یہ مصرعے:

ع ریت میں پیاس کے دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں
ع میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں ہی میں دریا ہوگا

غرض یہ کہ جدید اردو شاعری دراصل جدت پسندی نے فکری رجحانات، نئے دور کے نئے تقاضوں اور مراجعت پسندی پر مبنی ہے اس دور کی شاعری اس ذہن کی پیداوار ہے جو ترقی یافتہ علوم وفنون سے اپنا رشتہ استوار رکھتا ہے اور جدید شاعر اپنے ذات کے حوالے سے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ابتداء سے لے کر موجودہ عہد تک اردو شاعری ارتقاء پذیر ہوتی رہی اس کے ارتقاء میں مختلف رجحانات، ہیئت وغیرہ نے اہم رول ادا کیا۔اردو شاعری کے فروغ میں حالی نے جس اصلاحی شاعری کا بیڑا اٹھایا وہ اقبال کے یہاں پہنچنے تک اپنی عظمت دکھاتی ہے اور ترقی پسند شاعری کو اس اصلاحی ومقصدی شاعری کی توسیع سمجھا جاتا ہے جو ہمیں ایک سماجی وانقلابی سطح تک لے جاتی ہے۔چوں کہ اقبال ہمارے دور کے بہت بڑے شاعر ہیں۔

مگر موجودہ دور میں اقبال کے رنگ میں بھی شاعری نہیں ہو رہی ہے نہ ہوسکتی ہے کیوں کہ یہ دور الگ ہے اور وہ دور الگ تھا۔ترقی پسند شاعری نے اردو شاعری کے فروغ میں اہم رول ادا کیا لیکن اب اس قسم کی شاعری سے لوگ اوب گئے ہیں کیوں کہ اس دور کا براہ راست بیان خطیبانہ لب ولہجہ وغیرہ اس دور کے لیے صحیح نہیں تھا۔ ترقی پسند شاعری کے تحت فیض، مخدوم اور سردار جعفری کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان دونوں کا نیا لب ولہجہ قاری کو اپنی جانب کھینچتا ہے مثال: فیض کی نظم ''دریچہ''

گڑی ہیں کسی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصیل خداوند کی امنگ لیے
کسی پہ قتل مہتاب ناک کرتے تھے
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ باد صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگان مہر وجمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں

ISBN: 978-93-344-4743-9

اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے

شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

ترقی پسند دور کے فکر وفن نے بیسویں صدی عیسوی کی اردو شاعری کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا لیکن اب فکر وفن کے نئے تقاضے منظر عام پر آ چکے تھے جس کی وجہ سے ترقی پسند شاعری سے بے اطمینانی محسوس کرنے لگے کیوں کہ یہ لوگ جدید شاعری کے اظہار کے لیے کو نیا لب ولہجہ چاہتے تھے کچھ شعراء نے داخلی اور باطنی کیفیت پر زور دیا تو کچھ نے خارجی مسائل پر اپنی توجہ صرف کی۔ جدید شعراء کا یہاں موجودہ عہد کا کرب علامتی اظہار کے ساتھ ساتھ ایک تبصرہ کیا۔

اسی کی آرزوں کی لحد میں پھینک آیا ہوں

میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے

کبھی چاہا تھا اک خاشاک ِعالم پھونک ڈالے گا

یہ کذب واختر رہے۔ جھوٹ ہے، دیکھ میں زندہ ہوں

چوں کہ مجید امجد، منیب الرحمٰن خلیل الرحمٰن، منیر نیازی، وزیر آغا، بلراج کومل کا شعور، ترقی پسند دور کے عروج کے زمانے میں پروان چڑھا مگر دھیرے دھیرے ان کے احساس نے انھیں جدید اردو شاعری کی طرف کھینچ لایا۔ ان لوگوں کا اظہار اور اسلوب جدید اردو شاعری کے لیے بہت موزوں رہا۔ مجید امجد کی نظم ملاحظہ کیجئے:

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم

قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھڑم سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار

کٹتے ہیکل جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ وبار

سہمی دھوپ کے زردکفن میں لاشوں کے انبار

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ مہکتی ڈال

مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، آئے آدم کی آل

جدید اردو شاعری میں نئے لب ولہجہ کا شاعر منیب الرحمٰن کی نظم ''برگد کا پیڑ'' کی مثال:-

آنکھیں میچے سوچ میں گم

دھوتی رما کے کوئی سادھو جیسے بیٹھا ہو

جدید اردو شاعری کے ابتدائی نقوش میراں جی، ن۔م۔راشد، اختر الایمان وغیرہ کے یہاں نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں داخلیت کا ایک خاص انداز ملتا ہے۔ ن۔م۔راشد کے یہاں ایک قسم کی لذت ملتی ہے تو میران جی کے یہاں جنسی بے راہ راوی پر بہت زور دیا گیا جس کی وجہ سے ان کو جدید اردو شاعری کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ن۔م۔راشد کی نظم ''خودکشی''

آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں

ایک عشوہ ساز، دہرزہ کار محبوبہ کے پاس

اس کے تحت خواب کے نیچے مگر

آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو

تازہ درخشاں ہو

ISBN: 978-93-344-4743-9

بوئے مئے میں بوئے خوں الجھی ہوئی

اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا''

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں

وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور، اضطراب سا

جیسے تم پوچھتے رہتے ہو، کب کا مر چکا ظالم

اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا

1960ء کے بعد جدید اردو شاعری کو کافی فروغ حاصل ہوا جدید وشاعری کا قاری مطالعہ سے بھاگتا نہیں بلکہ اسے پڑھ کر محفوظ ہوتا ہے۔ چوں کہ اس دور میں جدید شاعروں کے کئی ایک مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جس میں گیان مرگ کی نظمیں ''سبز اندر سبز، رشتہ گونگے سفر کا، آتش سیال، نیم خواب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مجموعوں میں زندگی کی رمق موجود ہے جس کے شعری اظہار پیکروں علامتوں کی مشکل میں کیا گیا ہے۔ جدید شاعری کے تعلق سے محمد حسن لکھتے ہیں۔

''جدید اردو شاعری غم جاناں سے غم دوراں کی طرف ایک طویل سفر ہے، غم دوراں کا یہ احساس بڑا ہی متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ یہاں زلف و عارض کے سائے بھی خشک اور سرد ہوتے نظر آتے ہیں اور ان میں زندگی کی محرومی اور تشنگی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ حسن اور رومان کے نخلستان سکون نہیں دیتے پناہ البتہ دیتے ہیں یہ لمحہ لمحہ غنیمت ہے مگر کرب اور درد سے بھر پور ہیں۔''

العرض جدید اردو شاعری ایک نیا احساس اور ایک نئی لئے لے کر پیدا ہوئی، داخلی جذبات واحساسات کے ساتھ تلخی، داخلی الجھن، خود سپردگی اور بغاوت کے جذبے جاگے جدید اردو شاعری میں حقیقت ایک بے رحم دیوتا کی طرح سامنے آئی۔ اس دور کا شاعر خود کو ایک ایسے دور میں محسوس کرنے لگا جو اس نے پہلی بار دیکھا ہو یعنی کہ وہ اپنی شاعری میں علم وآگہی سے غفلت کے چراغ بجھا رہے تھے اور ناامید لوگوں سے امید کی روشنی جلا رہے تھے جو یقین کے سہارے آہستہ آہستہ اجالے کی سمت رواں دواں ہے۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

دورِ جدید کی نئی آواز

ڈاکٹر ثریا بیگم محمود خان
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
شیواجی کالج ہنگولی

ہر علاقے کا ادب اپنے ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔ جیسے حالات ہوتے ہیں ویسا ہی ادب تخلیق کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لکھنؤ کا ماحول پرامن و پرسکون بھری زندگی والا ماحول ہے۔ یہاں کے لوگ عیش وعشرت اور رنگ رلیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی ماحول میں اردوشاعری کو ترقی ملی جس کی وجہ سے لکھنؤ کی پوری معاشرت کا اثر اردوشاعری پر ہوا۔ لکھنؤ کے عیش پرست ماحول نے اردوشاعری میں خارجیت کو جنم دیا۔ لکھنؤ میں شاعری کی ظاہری خوبصورتی پر زیادہ زور دیا گیا۔ یعنی لکھنؤ والوں نے اردوشاعری کو ظاہری طور پر خوبصورت بنایا۔ اردوشاعری میں جو جذبات ہوتے تھے اس پر ان کی کوئی توجہ نہ رہی۔ بلکہ سراپا نگاری اور معاملہ بندی سے اردوشاعری کو رنگین بنایا گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اصلاح زبان کے عمل نے زبان کو فصیح بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن جب شعوری طور پر کسی بھی معاملے میں شدت اختیار کی جاتی ہے تو نہ صرف فطری حسن متاثر ہو جاتا ہے بلکہ اثر آفرینی اور بے ساختگی بھی باقی نہیں رہتی۔ یہی معاملہ اصلاح زبان کی تحریک کے سلسلے میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ لکھنؤ کے جن شعرا نے اس ضمن میں اعتدال و توازن سے کام لیا، ان کا کلام بامعنی معیاری اور پُرتاثیر بن گیا۔ آج ہم ایک ایسے شاعر کا تذکرہ یہاں کر رہے ہیں جو نئے دور کی آواز ہے۔

دلشاد علی کی پیدائش ۷ ارنومبر ۱۹۸۶ء اتر پردیش کے ضلع لکھیم پور کھیری کے ایک قصبہ سندرول میں ہوئی۔ ان کے والد مہدی حسن اسکول میں ایک کلرک کے عہد پر فائز تھے۔ لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے انھوں نے اس نوکری کو چھوڑ دیا اور کاشت کاری کرنے لگے۔ ان کی والدہ مومینہ بھی ایک گھریلو خاتون ہیں۔ یہ کل آٹھ بھائی بہنیں ہیں جن میں پانچ بہنیں اور تین بھائی ہیں بھائی بہنوں میں دلشاد علی گھر میں سب سے بڑے بیٹے ہیں۔

عام طور پر آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز دینی ادب سے کیا۔ اور عربی کی پڑھائی انھوں نے مولوی مبین کے پاس کی۔ شاعر دلشاد علی نے اپنی تعلیم کا آغاز ۱۹۹۲ء میں ایک اسکول پُرومدھک ودھیالیہ سندرول سے کیا اور کے۔ اے۔ یو۔ کے انٹر کالج سے دسویں کا امتحان ۲۰۰۳ء میں مکمل کیا۔ اور اسی کالج سے انٹرمیڈیٹ بھی کامیاب کیا۔ بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی میں بھی اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ اور اسی درمیان میں انھیں نے شاعری کا شوق ہوا۔ سب سے پہلے آپ نے نعت لکھی اور اس نعت کو آپ نے منظر سیتاپوری کو دکھائی۔

اس کے ساتھ ہی دوستوں کے ساتھ شعروشاعری کا بھی شوق ہوا اور ہر شام دوستوں کے ساتھ کیسی نہ کیسی چوپال، کہیں نہ کہیں چوراہے پر جمع ہوتے اور گھنٹوں تک شعروشاعری کرتے رہتے۔ ان کے ساتھی تجمل خان اور ریاض احمد کو بھی شعروشاعری کا شوق پیدا ہوا۔ دوستی گہری ہونے کی وجہ سے سب مل کر دوسرے شہر بھی مشاعرے سننے کے لیے جاتے رہتے اور ساتھ ہی ادب کے بڑے بڑے شعراء سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں اور اس طرح ان کا شوق بڑھنے لگا۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز ۲۰۰۰ء کے بعد سے کیا۔ اور اپنی پہلی غزل لکھی جو کچھ یوں ہے۔

دل کی دنیا تباہ مت کرنا
کچھ بھی ہو یہ گناہ مت کرنا
یہ زمانہ بہت ستمگر ہے
ظلم سہہ کر بھی آہ مت کرنا
جس سے ایمان میں کمی آئے

ISBN: 978-93-344-4743-9

ایسی دولت کی چاہ مت کرنا
دل کا دامن بڑا مقدس ہے
صاف رکھنا سیاہ مت کرنا

اسی دوران لکھیم پور کھیری میں ۲۰۰۹ء میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر راحت اندوری نے کی تھی۔اور اس مشاعرے میں راحت اندوری کے ساتھ شامل شعراء میں انور جلالپوری، رفیق شادانی دہلوی وغیرہ تھے۔اور اس مشاعرے میں دلشاد علی شاعر کو موقعہ دیا گیا۔تب آپ نے آل انڈیا مشاعرے میں یہ اشعار پڑھے جس کو سامعین نے بہت زیادہ پسند کیا وہ اشعار یہ ہے۔

تو بنا محبت کے زندگی نہیں گزار سکتا
بگڑ جائے تو مقدر نہیں سنوار سکتا
تو دنیا میں چاہے جتنا دولت مند ہو جائے
کبھی اپنی ماں کا قرض نہیں اتار سکتا

نہ مجھے خوشی عزیز ہے
نہ یہ زندگی عزیز ہے
خدا کے بعد بس مجھے
تیری دوستی عزیز ہے

جو اس وقت کے سب سے زیادہ مشہور ''ہندوستان ٹائم'' میگزین میں شائع ہوئی۔

ان کے شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دہلی والوں کی طرح ''آہ'' کی شاعری نہیں کرتے بلکہ وہ لکھنؤ والوں کی طرح ''واہ'' کی شاعری کرتے ہیں۔ کیونکہ لکھنؤ کا ماحول خوشگوار، پر امن اور خوش حال ہے اس لیے ان کی شاعری میں واہ کی کیفیت نظر آتی ہے۔انھوں نے ہر موضوع پر شاعری کی ہے۔ان کا یہ شعر دیکھے جو ۲۰۰۳ء لکھا گیا ہے جو کچھ اس طرح سے ہے۔

خدا نے اب تک ایک دنیا بنائی ہے
دنیا لگی ہے کئی خدا بنانے میں

پھر انھیں منظر سیتاپوری کا ساتھ ملا جنہوں نے مجھے نعتیہ کلام پڑھنے کا مشورہ دیا تو میں نے پہلی نعت ان کے زیر نگرانی میں لکھی منظر سیتاپوری صاحب رشتے میں ان کے ماموں جان بھی ہے۔اور پاس ہی کے ضلع سیتاپور میں رہتے ہیں اور وہ اس طرح سے وہ انکی شاعری کے استاد بنے۔ان کی یہ نعت

اے باد صبا تو مجھے لے کے چل
چل مجھے لے کے چل نبی کی گلی
راس آتی نہیں اب مجھے زندگی
چین آتا نہیں اب مجھے کوئی پل
پھر سے بنجر زمین لہلہانے لگی
پھول کی ہر کلی مسکرانے لگی
جس جانب سے گزرے ہمارے نبی
اے باد صبا تو مجھے لے کے چل

ISBN: 978-93-344-4743-9

چاند لگتا ہے میرے نبی کا قدم
پھولوں میں ہے نبی کے پسینے قدم
ان کے دم سے مہکتی ہے ہر ایک کلی
اے باد صبا تو مجھے لے کے چل
جب وہ آئے سبھی شادماں ہو گئے
ہر مسلمان پر مہرباں ہو گئی
ساری دنیا سنبھالے ہوئے ہیں نبی
اے باد صبا تو مجھے لے کے چل
جس نے کلمہ پڑھا وہ مسلماں ہوا
پھر رسول خدا کا کرشمہ ہوا
چین دل کو ملا اور آرام بھی
اے باد صبا تو مجھے لے کے چل

اور پھر دلشاد علی بیتاب کو منظر سیتاپوری کے ساتھ میں کئی سارے پروگراموں میں شرکت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یو پی کے ہر علاقہ میں ان کے ساتھ پروگراموں میں شرکت کرنے کا موقع ملا جس میں کئی سارے انعاموں سے انھیں نوازا گیا۔ ان کے ہم عصر شاعروں میں سلیم بستی سب سے عزیز ہے۔ سلیم بستی صاحب سے دلشاد علی بیتاب آج بھی رابطے میں ہیں۔ اور ساتھ ہی ان کی ملاقات ایک عظیم شاعر ڈاکٹر جگناتھ سے ہوئی۔ جو پیلی بھیت کے رہنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی انھوں نے پونہ، ناسک، اورنگ آباد، کانپور، پیلی بھیت وغیرہ الگ الگ جگہوں کے مشاعروں میں شرکت کی۔

چائے پینے کا اتنا شوق ہے کہ نئی نئی جگہوں پر گھوم گھوم کے چائے پیتے۔ چائے پینے کے شوق نے ان سے 200 کلومیٹر دور تک کا سفر طے کروایا۔ اور پھر چائے پر بھی کئی اشعار لکھے ہیں۔ جو لوگوں میں بے حد مشہور و مقبول ہوئے۔ چائے پر ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اس لیے بھی ہم شریفوں میں گنے نہیں جاتے
آپ کافی کے شوقین ہو ہم چائے کے عادی ہیں

☆

ہم نہیں جانتے سکون کیا ہے آرام کیا ہے
ہم تو بس چائے پیتے ہیں اور مست رہتے ہیں

☆

دوستی توڑ دیں گے ہم اگر تم نے
ہمارے ہاتھ سے چائے چھین لی تو

☆

زندگی جب بھی مجھ سے پریشاں ہوتی ہے
میں جا کے کسی نکڑ پہ چائے پیتا ہوں

☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

مجھے وہ شخص بہت عزیز ہے
جو محبت سے چائے پلاتا ہے

☆

میری دوستی کی بس یہی نشانی ہے
چائے پیتے ہیں اور سب کو پلاتے ہیں

☆

سچ بتانا جو تم نے مجھے پلائی
چائے ہے یہ آب حیات ہے بیتابؔ

☆

دوستوں کے ساتھ گڑک کے پیتے ہیں
چائے تو بیتابؔ سوڑک کے پیتے ہیں

جدید دور کے شاعر ہے ان کے کلام میں ایک انوکھا انداز بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔دلشاد علی بیتاب نے زندگی کے ہر پہلو کو غزل میں پیش کیا ہے۔زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں کو بھی وہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے زندگی کے مسائل کو اپنی گہری سوچ کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیا۔یہی وجہ ہے کہ ہم انہیں جدید دور کا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ان کی غزلوں میں ہمیں زندگی کی گہرائی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ان کی ایک غزل یہاں قلمبند کئی گئی ہیں۔

لوگ دیکھ کر ہمیں حیران ہو گئے
کیا وجہ تھی کہ پریشان ہو گئے
جب سے اٹھایا ہے اسلام کا پرچم
تر و تازہ سبھی کے ایمان ہو گئے
کرتے پھرتے ہیں جو لوگ ظلم و ستم
کس منہ سے کہوں کہ وہ انسان ہو گئے
ہم نے سیکھ لیا ہے اب محنت کرنا
مشکلوں بھرے راستے میرے آسان ہو گئے
نہ تعلق تھا اس سے نہ کوئی رشتہ
پھر بھی اس کے مجھ پر احسان ہو گئے
قبر بھی انہی کی حفاظت کرتی ہے
جو محترم حافظ قرآن ہو گئے
کیسا آیا ہے یہ نام بدلنے کا چلن
ہم بیتابؔ تھے اور پھر دلشادؔ ہو گئے

ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا رنگ وطرز نظر آتا ہے۔ان کے کلام میں پاکیزگی، خیالات کی پختگی اور اظہار بیان کی متانت دیکھنے کو ملتی ہے۔

زندگی درد بن گئی جن کی

ISBN: 978-93-344-4743-9

وہ بہت خوش نصیب ہیں اس زمانے میں
تیری نظروں میں وہ پاگل ضرور ہے مگر
ایک بھی عیب نہیں ہے اس دیوانے میں
جو ہمیشہ نیکیوں پر چلتا رہا
کسی نے کسر نہ چھوڑی اس کو ستانے میں
جو شخص سے محبت میں چوٹ کھایا ہو
اسے آرام نہیں آتا دواخانے میں
خدا نے اب تک ایک دنیا بنائی ہے
دنیا لگی ہے کئی خدا بنانے میں

یہی وہ تہذیبی عناصر ہیں جو لکھنوی معاشرت کا لازمی حصہ بھی ہیں اور مخصوص ماحول کا نتیجہ بھی۔ ان کی مثالیں کبھی لکھنوی فنکاروں کے یہاں اپنے طور پر نظر آتی ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر لکھنوی فنکار نے ان قدروں اور عناصر کو بقدر ظرف اپنے فن میں ڈھالا ہے۔ یہی عناصر لکھنوی شاعری کی جان ہیں اور انھیں سے اسے پہچانا بھی جاتا ہے۔ ان کی یہ غزل دیکھئے جو ۲۰۲۳ء میں ایک میگزین ''ترجیحات'' اور ہفتہ واری ہندی اخبار میں شائع ہوئی۔ جو آپ کی نظر ہے۔

دل دکھانے سے کوئی فائدہ ہے کیا؟
عشق والوں کا یہ فلسفہ ہے کیا؟
اتنی بھیڑ یہاں کیوں جمع ہے
ہوا یہاں پر کوئی حادثہ ہے کیا؟
ہم سے کیوں تم بے جھجھک نہیں ملتے
ہمارے درمیان کوئی فاصلہ ہے کیا؟
قبر میں دفن ہوئے اور جنت پہنچے
ادھر سے بھی کوئی راستہ ہے کیا؟
زندگی سے نفرت ہے تو محبت کیوں نہیں کرتے
اس بارے میں اتنا کوئی سوچتا ہے کیا؟
سر جھکاؤں اسے اور سجدے کروں
وہ اس دنیا کا نیا خدا ہے کیا؟
یہ مجھے راستے میں پڑا مل گیا ہے
یہ ٹوٹا ہوا دل آپ کا ہے کیا؟
یہاں تو موجود ہے ہر قسم کے ستارے
تمہارا گھر کوئی کہکشاں ہے کیا؟
نصیحت خود کو کیوں نہیں کرتے بیتابؔ
خود سے بہتر کوئی سوچتا ہے کیا؟

انھیں اپنی غزلوں میں نہ صرف خوب داد حاصل ہوئی بلکہ دوسرے شعراء نے بھی اس رنگ کو قبول کر کے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ہر موضوع پر شاعری کی ہے۔یہ شعر ایک ایسے موقع پر لکھا گیا ہے جب وہ اپنے عزیز کو سلام بھیجتے ہیں لیکن ان کو ان کے سلام کا جواب نہیں ملتا تب ان کے لبوں پر یہ الفاظ ابھر کر آئے۔جو غور طلب ہے۔

اُجڑے گلشن میں گلاب تک نہیں آتے
میری محفل میں رُباب تک نہیں آتے
وہ اور ہیں جنکے سلام کی قدر ہے
میرے تو سلام کے جواب تک نہیں آتے

☆

جب بھی آئے کسی کی یاد چائے پی لینا
جب ستائے کسی کی یاد چائے پی لینا
خوش ہو کہ محبت میں چائے پی لینا
جب تم ہونا اداس تو چائے پی لینا

حال ہی میں لکھی گئی ان کی ایک غزل جوانھوں نے پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال جاوید شیخ ابراہیم کو حکومت مہاراشٹر محکمہ اقلیتی ترقیات مہاراشٹر اسٹیٹ ساہتیہ اکیڈمی ممبئی کی جانب سے ۷ اکتوبر ۲۰۲۵ء کو مثالی ٹیچر کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔اس موقع پر انھوں نے یہ غزل ان کی نظر کی۔

بچوں پہ کتنے مہربان ہے جاوید سر
شیواجی کالج کی شان ہے جاوید سر
طالب علم سوکھے درختوں کے لیے
سائے آسمان ہے جاوید سر
وہ صدی گزر گئی علامہ اقبال کی
اس صدی کے اقبال ہے جاوید سر
یہ تو ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں
تم کہتے ہو پریشان ہے جاوید سر
اب میں اس سے بڑھ کر کیا مثال دوں
شہر ہنگولی کی جان ہے جاوید سر
گزرے دور میں ولی آئے تو کیا بیتابؔ
اس دور کے بہترین انسان کے جاوید سر

دلشاد علی بیتاب اردو ادب کے ایک ممتاز شاعر ہیں اور وہ اپنے عہد کی ایک بے مثال آواز بھی ہے۔ان کی شاعری زیادہ تر سوشل میڈیا پر دکھائی دیتی ہے۔دلشاد علی مہدی کی شاعری کے مطابق یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک خاموش مزاج اور سنجیدہ قسم کی شاعری کرتے ہیں۔اور اپنی شاعری میں جا بجا سماج میں ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ ان کے شاعری کا سفر آنے والے دور میں کافی بلند و بالا ہوگا۔

☆☆☆

اردو شاعری میں جدید سماجی تصورات: تجزیاتی وفکری مطالعہ

ڈاکٹر سید سہیل احمد ہاشمی
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ اردو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی
چھترپتی سمبھاجی نگر (اورنگ آباد)

اس دورِ بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
جسموں کو برف، خون کو پانی کوئی لکھو
کوئی کہو کہ ہاتھ قلم کس طرح ہوئے
کیوں رک گئی قلم کی روانی کوئی لکھو

احمد فراز

ملخص

یہ مقالہ اردو شاعری کے فکری ارتقا میں سماجی تصورات کے تناظر کا جامع جائزہ پیش کرتا ہے۔ تحقیق کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے بعد سے اردو شاعری نے محض جمالیاتی اظہار کے دائرے سے نکل کر ایک فعال سماجی قوت کی حیثیت اختیار کی۔ مقالے میں الطاف حسین حالی سے لے کر عصری شعرا تک کے سفر میں نمایاں ہونے والے بنیادی سماجی موضوعات' طبقاتی شعور، انفرادی شناخت، صنفی مساوات، اور سیاسی مزاحمت کا نظاماتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ شعرا کے انتخابی نمونوں کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو شاعری کس طرح سماجی تبدیلی کے بیانیے میں ایک مرکزی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ خصوصی طور پر ترقی پسند تحریک، جدیدیت، نسائی شاعری اور مزاحمتی ادب کے تحت ہونے والی فکری تبدیلیوں کو تاریخی تناظر میں پرکھا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو شاعری، سماجی شعور، ترقی پسند تحریک، نسائی شاعری، مزاحمتی ادب، عصری تناظر، معاشرتی تبدیلی، ادبی تحریکیں۔

تمہید

ادب اور سماج کا باہمی رشتہ ایک متحرک اور دوطرفہ عمل ہے جو تہذیبی ارتقا کی بنیادی تشکیل کرتا ہے۔ اردو شاعری کا ارتقا برصغیر کی سماجی تاریخ کے مختلف ادوار کی زندہ عکاسی کرتا ہے، جہاں ہر دور کی شاعری نے نہ صرف اپنے عہد کے جذبات و احساسات کو بیان کیا بلکہ ان میں تبدیلی کے بیانیے بھی تشکیل دیے۔ جہاں کلاسیکی دور کی شاعری میں تصوف، محبت اور فردی کیفیات کو مرکزی اہمیت حاصل تھی، وہیں انیسویں صدی کے نصف آخر سے اردو شاعری میں ایک واضح سماجی بیداری کا رجحان نظر آنے لگا۔ یہ تبدیلی محض موضوعاتی نہیں بلکہ فکری اور نظریاتی سطح پر واقع ہوئی، جس نے شاعری کے مقاصد، اسلوب اور اثرات کو از سرِ نو تشکیل دیا۔

"جدید سماجی تصورات" سے مراد وہ نظریات اور خیالات ہیں جو فرد کو ایک سماجی، سیاسی اور معاشی وجود کے طور پر دیکھتے ہیں، نہ کہ محض رومانی یا صوفیانہ عاشق کے طور پر۔ یہ تصورات فرد اور معاشرے کے تعلق کو نئے سرے سے تعبیر کرتے ہیں، جہاں انسان کی قدر و قیمت اس کی سماجی افادیت، سیاسی بصیرت اور معاشی حیثیت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس مقالے کا بنیادی مقصد اردو شاعری میں ان تصورات کے ارتقا، ان کے فکری ماخذ، اور ان کے سماجی اثرات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنا ہے۔

اس تحقیق کا دائرہ کار انیسویں صدی کے آخر سے لے کر اکیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک پھیلا ہوا ہے۔ مقالے میں نمائندہ شعرا کے انتخابی نمونوں کی مدد سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح اردو شاعری نے مختلف ادوار میں سماجی تبدیلی کے بیانیوں کو تشکیل دیا، انہیں مقبول بنایا اور بعض اوقات ان کی تنقید بھی کی۔ یہ مطالعہ صرف تاریخی تسلسل ہی نہیں پیش کرتا بلکہ اس میں نظریاتی مباحث کو بھی شامل کیا گیا ہے جو اردو شاعری کے سماجی کردار کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

 ISBN: 978-93-344-4743-9

طریقہ کار

یہ تحقیق نظریاتی اور تجزیاتی نوعیت کی ہے، جس کا مقصد اردو شاعری میں سماجی شعور کے ارتقا کو سمجھنا اور اس کی مختلف جہتوں کو واضح کرنا ہے۔ تحقیق میں بنیادی طور پر شعرا کے شعری مجموعوں، ان کے تنقیدی مضامین، اور موجودہ تنقیدی ادب کا سہارا لیا گیا ہے۔ طریقہ کار کے طور پر تاریخی ترتیب، موضوعاتی تجزیہ، اور متن کی تشریح کے طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے۔

شعرا کا انتخاب نمائندگی کے اصول پر کیا گیا ہے تاکہ ہر اہم فکری دور کا احاطہ ہو سکے۔ اس انتخاب میں ان شعرا کو ترجیح دی گئی ہے جنہوں نے نہ صرف فنکارانہ اعتبار سے بلکہ فکری اور نظریاتی سطح پر بھی اردو شاعری میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ تحقیق میں ابتدائی جدیدیت کے دور سے لے کر معاصر دور تک کے شعرا شامل کیے گئے ہیں، تاکہ سماجی شعور کے تسلسل اور تغیرات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

تحقیق کے لیے استعمال ہونے والے بنیادی ماخذ میں شعرا کے اصل شعری مجموعے، ان کے خطوط، انٹرویوز، اور خودنوشت مواد شامل ہیں۔ ثانوی ماخذ میں جدید تنقیدی کتابیں، تحقیقی مقالات، اور ادبی تاریخ نگاری کے نمونے شامل ہیں۔ تمام حوالہ جات کو معیاری طریقے سے پیش کیا گیا ہے تاکہ تحقیق کی سند قائم رہے۔

مولانا الطاف حسین حالی: سماجی شعور کی بنیاد

انیسویں صدی کا وہ دور جب برصغیر سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے ایک نازک موڑ پر کھڑا تھا، اردو شاعری میں بھی تبدیلیوں کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب برصغیر کا پرانا سماجی اور سیاسی ڈھانچہ درہم برہم ہوا، تو ادب میں بھی نئی فکری تلاش شروع ہوئی۔ اس دور میں الطاف حسین حالی (1837-1914) نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت عطا کی۔ انہوں نے "ادب برائے زندگی" کے نظریے کو عملی شکل دی، جو اس وقت کے ادبی منظرنامے میں ایک انقلابی قدم تھا۔

حالی نے اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" (1893ء) میں واضح کیا کہ شاعری کا مقصد "قوم کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت" ہے۔ ان کا یہ نظریہ اردو شاعری میں سماجی شعور کی پہلی منظم شکل تھی۔ حالی کا ماننا تھا کہ شاعری کو محض تفریح یا ذاتی اظہار کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا مقصد قوم کی اصلاح اور تعمیر ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ بعد میں آنے والی کئی ادبی تحریکوں کے لیے بنیاد کا کام کرتا رہا۔

حالی کی شاعری میں سماجی شعور کا اظہار مختلف سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ معاشی ناانصافی کو موضوع بناتے ہیں تو دوسری طرف سماجی برائیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تعلیم نسواں، سماجی اصلاح، اور قومی بیداری جیسے موضوعات بھی نمایاں ہیں۔ یہ سب مل کر حالی کو اردو شاعری میں جدید سماجی شعور کا بانی بناتے ہیں۔

علامہ اقبال: انفرادی شناخت اور سماجی تبدیلی

علامہ اقبال (1877-1938) نے اردو شاعری کو فلسفیانہ گہرائی اور انقلابی جہت عطا کی۔ اقبال کا مرکزی تصور "خودی" محض انفرادی تربیت کا نام نہیں، بلکہ ایک فعال سماجی وجود کی تعمیر کا نظریہ ہے۔ ان کی شاعری میں فرد اور سماج کا باہمی رشتہ ایک متحرک عمل کے طور پر سامنے آتا ہے، جہاں فرد کی ذاتی تربیت سماجی تبدیلی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

اقبال کی شاعری کا سماجی پہلو متعدد سطحوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام اور استعماری قوتوں کی واضح مخالفت کی۔ ان کی نظم "فرمانِ خدا" میں سماجی انقلاب کا واضح تصور پیش کیا گیا ہے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ

ISBN: 978-93-344-4743-9

جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اقبال کا یہاں "سلطانیِ جمہور" کا تصور جمہوریت اور سماجی انصاف کی واضح حمایت ہے۔ وہ پرانے سماجی ڈھانچوں کو مٹانے کی بات کرتے ہیں تا کہ ایک نیا، منصفانہ سماج وجود میں آ سکے۔ اقبال کی شاعری میں مذہبی فکر اور سماجی انقلابی فکر کا امتزاج اردو شاعری کو ایک نئی فکری بلندی پر لے گیا۔

اقبال کی سماجی فکر میں فرد کی مرکزی اہمیت ہے۔ ان کا "خودی" کا تصور دراصل ایک ایسے فرد کی تعمیر کا نظریہ ہے جو سماجی تبدیلی کا عامل بن سکے۔ یہ فرد محض اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اپنے معاشرے کی تعمیر اور ترقی میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں فرد کی ذاتی تربیت اور سماجی خدمت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

اقبال کی شاعری میں مغربی تہذیب کی تنقید بھی ایک اہم سماجی موضوع ہے۔ وہ مادی تہذیب کے خلاف ہیں جو انسان کو صرف مادی ضروریات تک محدود کر دیتی ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقی ترقی وہی ہے جو انسان کی روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھائے۔ یہ فکر بعد میں آنے والے کئی شعرا اور مفکرین کو متاثر کرتی رہی۔

ترقی پسند تحریک: طبقاتی شعور کی تشکیل

ترقی پسند تحریک (1936ء) اردو ادب میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اس تحریک نے مارکسی فکر کے زیر اثر ادب کو براہ راست سماجی عمل سے جوڑ دیا۔ ترقی پسند تحریک کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ادب کو سماجی تبدیلی کا آلہ کار بننا چاہیے۔ اس تحریک کے شعرا نے طبقاتی استحصال، معاشی ناانصافی اور سماجی جبر کے خلاف آواز بلند کی۔

فیض احمد فیض (1911-1984) نے اس تحریک کے سب سے نمایاں شاعر کی حیثیت سے سماجی حقیقت نگاری کو رومانویت سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی شاعری میں ذاتی محبت اور سماجی احتجاج کا انوکھا امتزاج ملتا ہے۔ فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" میں ذاتی محبت اور سماجی حقیقت کے درمیان کشمکش کو انتہائی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے:

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

فیض کے اس شعر میں سماج کی برائیوں اور محبوب کے حسن کے درمیان تضاد کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا حسن اپنی جگہ لیکن سماج میں پھیلی بیماریوں، غربت اور استحصال کو نظر انداز کرنا اب ممکن نہیں رہا۔ یہ نظم ترقی پسند شاعری کی ایک بہترین مثال ہے جو فنکارانہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کو بھی برقرار رکھتی ہے۔

ساحر لدھیانوی (1921-1980) نے اسی فکری رجحان کو آگے بڑھاتے ہوئے رومانی علامتوں کو سماجی حقیقتوں سے ٹکرا دیا۔ ان کی مشہور نظم "تاج محل" میں وہ تاج محل کی تعمیر کو غریبوں کے استحصال سے جوڑتے ہیں:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ساحر کے یہاں محبت کا رومانی تصور ایک سماجی حقیقت بن جاتا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ تاج محل جیسی محبت کی عظیم علامت درحقیقت غریبوں کی محبت کا مذاق اڑانے کا نتیجہ ہے۔ یہ نقطہ نظر ترقی پسند تحریک کی اس فکری رجحان کی عکاسی کرتا ہے جو ہر شے کو طبقاتی تناظر میں دیکھتا ہے۔

ترقی پسند شاعری نے محنت کش طبقے، کسانوں اور مظلوموں کی آواز بن کر اردو شاعری کے سماجی کردار کو مضبوط کیا۔ اس تحریک کے شعرا نے نہ صرف سماجی مسائل

کواجاگر کیا بلکہ ان کے حل کے لیے ایک نظریاتی بنیاد بھی فراہم کی۔ان کی شاعری میں امید اور انقلاب کا عنصر بھی شامل ہے، جو مظلوموں کو تبدیلی کی ترغیب دیتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس نے اردو شاعری کو ایک وسیع عوامی بنیاد فراہم کی۔اس سے پہلے شاعری زیادہ تر خواص تک محدود تھی لیکن ترقی پسند شعرا نے شاعری کو عوامی مسائل سے جوڑ کر اسے ہر طبقے تک پہنچایا۔یہی وجہ ہے کہ فیض، ساحر اور دیگر ترقی پسند شعرا کی شاعری آج بھی مقبول ہے اور سماجی تبدیلی کے لیے کام کرنے والوں کے لیے تحریک کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

جدیدیت: انفرادی وجود اور سماجی بیگانگی

پنجابیوں کی جدیدیت کی تحریک نے ترقی پسندی کے اجتماعی بیانیے کے مقابلے میں انفرادی وجود، نفسیاتی پیچیدگی اور عصری بیگانگی کو موضوع بنایا۔ یہ تحریک بیسویں صدی کے وسط میں ابھری اور اس نے اردو شاعری کی ہیئت اور موضوع دونوں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔جدیدیت کی تحریک کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ جدید زندگی نے انسان کو جس قسم کے نفسیاتی اور وجودی مسائل سے دوچار کیا ہے، شاعری کو ان مسائل کا اظہار کرنا چاہیے۔

ن م راشد (1910-1975) نے اردو نظم کی ہیئت اور موضوع دونوں میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ان کی نظم "حسنِ کوزہ گر" میں تخلیقی فنکار کی ناکامی کو جدید انسان کے روحانی بحران کی علامت بنایا گیا ہے:

تیرے لب، تیرے رخسار، تیری آنکھیں
وہی خواب ہیں جن کی خاطر
میں نے برسوں تیاگ کی منزلیں کاٹیں
لیکن اب دیکھتا ہوں
میرے کوزوں میں وہ رنگِ رعنائی و تابش نہیں ہے

راشد کے اس شعر میں " کوزہ گر" دراصل جدید انسان کی علامت ہے جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کھو چکا ہے۔جدید زندگی کی پیچیدگیوں اور مادی ترقی نے انسان کو اندر سے خالی کر دیا ہے۔یہی جدیدیت کا مرکزی موضوع ہے۔راشد اور دوسرے جدید شعرا کی شاعری میں شہری زندگی کی بیگانگی، رشتوں کی ٹوٹن، اور وجودی تنہائی جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔

جدیدیت نے شاعری کو سماجی مسائل کے براہ راست اظہار سے ہٹ کر ان مسائل کے نفسیاتی اور وجودی اثرات کی طرف موڑ دیا۔ یہ خود ایک سماجی ردعمل تھا جو جدید شہری زندگی کے پیچیدہ تجربات کو ادبی اظہار دے رہا تھا۔جدید شعرا کا ماننا تھا کہ ترقی پسند شاعری سماجی مسائل کا محض سطحی اظہار ہے جبکہ حقیقی مسئلہ انسان کے اندرونی بحران کا ہے۔

جدیدیت کی تحریک نے اردو شاعری کی ہیئت میں بھی اہم تبدیلیاں کیں۔راشد، میراجی اور دیگر جدید شعرا نے روایتی غزل اور نظم کی ہیئت کو توڑ کر نئی شعری شکلیں ایجاد کیں۔ان کی شاعری میں علامت، استعارہ اور تجرید کا استعمال بڑھ گیا، جو جدید زندگی کی پیچیدگیوں کے اظہار کے لیے ضروری تھا۔

جدیدیت کی شاعری کا سماجی پہلو یہ ہے کہ یہ جدید انسان کی نفسیاتی کیفیتوں کو سامنے لاتی ہے۔جدید شہری زندگی نے انسان کو جس طرح تنہا، بے بس اور بے معنی بنا دیا ہے، جدید شعرا نے اسی کا اظہار کیا ہے۔ یہ شاعری ایک طرح سے جدید تہذیب کی تنقید بھی ہے جو انسان کو صرف مادی ترقی کی دوڑ میں شامل کر کے اس کی روحانی اور جذباتی ضرورتوں کو نظرانداز کرتی ہے۔

نسائی شاعری: صنفی شناخت کا اظہار

اردو شاعری میں نسائی شعور کی تحریک سترہویں عشرے کے بعد نمایاں ہوئی، اگرچہ اس کے آثار اس سے پہلے بھی کچھ شاعرات کی شاعری میں ملتے ہیں۔کشور ناہید (1940-)، فہمیدہ ریاض (1946-2018)، اور پروین شاکر (1952-1994) جیسی شاعرات نے پدرسری نظام، سماجی امتیاز اور صنفی تشدد کے خلاف ایک نئی ادبی زبان تشکیل دی۔ان کی شاعری نے نہ صرف عورت کے مسائل کو اجاگر کیا بلکہ عورت کی ایک نئی شناخت بھی تشکیل دی۔

 ISBN: 978-93-344-4743-9

کشور ناہید کی نظم "ہم گناہ گار عورتیں" نے سماجی ڈھانچے کی منافقت پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہ نظم اس دوہرے معیار کو بے نقاب کرتی ہے جس کے تحت عورتوں کو سچ بولنے پر سزا ملتی ہے جبکہ جھوٹ بولنے والے مردوں کو معاف کر دیا جاتا ہے:

یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
جہاں مصلحتوں کے نام پر جھوٹ بولنے والوں کو سزا دی جاتی ہے
وہاں ہم سچ بولنے کی پاداش میں کوڑے کھاتی ہیں

کشور ناہید کی شاعری میں عورت کی آواز بہت واضح اور بے باک ہے۔ وہ صرف شکار نہیں بنتی بلکہ اپنے حقوق کے لیے آواز بھی اٹھاتی ہے۔ ان کی شاعری میں عورت محض مظلوم نہیں بلکہ ایک طاقتور وجود ہے جو اپنے حقوق کے لیے لڑ سکتی ہے۔ یہ نقطہ نظر نسائی شاعری کو پہلے سے موجود روایتی عورتوں کی شاعری سے الگ کرتا ہے۔

پروین شاکر نے اپنی شاعری میں عورت کے ذاتی تجربات کو سماجی تناظر میں پیش کیا۔ ان کی غزل میں عورت کی نفسیاتی کیفیات، اس کی خواہشات، اور اس کے خوابوں کا اظہار ملتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ عورت کو محض ایک صنف کے طور پر نہیں بلکہ ایک مکمل انسان کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عورت کی سیاسی اور سماجی شناخت نمایاں ہے۔ انہوں نے نہ صرف صنفی امتیاز بلکہ سیاسی جبر، مذہبی انتہا پسندی اور سماجی ناانصافی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ عورت کے مسائل کو ایک وسیع تر سماجی اور سیاسی تناظر میں دیکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کی آزادی محض صنفی مساوات تک محدود نہیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی انقلاب کا حصہ ہے۔

نسائی شاعری نے عورت کے جسم، ذہن اور وجود پر اس کے حقِ ملکیت کے اعلان کے ذریعے اردو شاعری کے سماجی دائرے کو وسیع کیا۔ اس شاعری نے نہ صرف عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا بلکہ عورت کی ایک نئی تصویر بھی پیش کی جو روایتی تصویر سے بالکل مختلف ہے۔ یہ شاعری عورت کو محض محبوبہ، ماں یا بیوی کے روایتی کرداروں سے نکال کر ایک سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے والے وجود کے طور پر پیش کرتی ہے۔

مزاحمتی شاعری: سیاسی شعور کی عکاسی

سیاسی جبر اور آمریت کے خلاف مزاحمت اردو شاعری کا ایک مستقل موضوع رہا ہے۔ حبیب جالب (1928-1993) نے اپنی شاعری کو عوامی احتجاج کا آلہ کار بنایا۔ ان کی شاعری نے نہ صرف سیاسی آمریت بلکہ سماجی ناانصافی، معاشی استحصال اور مذہبی انتہا پسندی کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ جالب کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ براہ راست اور سادہ زبان میں سماجی اور سیاسی مسائل کو بیان کرتی ہے۔

جالب کی نظم "دستور" نے آمرانہ قوانین کے خلاف عوامی ردعمل کا اظہار کیا۔ یہ نظم اس وقت لکھی گئی جب پاکستان میں مارشل لاء لگا ہوا تھا اور آمرانہ قوانین عوام کے حقوق سلب کر رہے تھے:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

جالب کے ان اشعار میں وہ قانون کے اس تصور کی نفی کی گئی ہے جو صرف چند لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہو۔ جالب کے نزدیک حقیقی دستور وہی ہے جو عوام کے حقوق کا تحفظ کرے، نہ کہ صرف حکمرانوں کی خوشیوں کا۔ یہ نظم نہ صرف ایک خاص سیاسی دور کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ہر اس نظام کے خلاف ایک عالمگیر مزاحمت بن گئی ہے جو عوام کے بجائے چند لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرے۔

جالب کی شاعری نے اردو غزل اور نظم کو براہ راست سیاسی عمل سے جوڑ دیا۔ ان کی شاعری کا مزاحمتی رویہ صرف سیاسی نہیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی انصاف کے تصور سے متعلق تھا۔ جالب نے نہ صرف سیاسی آمریت بلکہ سماجی ناانصافی، مذہبی انتہا پسندی اور معاشی استحصال کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ ان کی شاعری کی مقبولیت کا

رازیہی تھا کہ وہ عوام کے جذبات اور خواہشات کی ترجمانی کرتی تھی۔

جالب کے علاوہ احمد فراز (1931-2008) نے بھی سیاسی مزاحمتی شاعری میں اہم کردار ادا کیا۔فراز کی شاعری میں سیاسی جبر کے خلاف احتجاج بھی ہے اور امید کا پیغام بھی۔ان کی شاعری نے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں سیاسی طور پر سرگرم لوگوں کو متاثر کیا۔

مزاحمتی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرتی ہے۔ یہ شاعری نہ صرف سیاسی تقریبوں میں پڑھی جاتی ہے بلکہ عوامی احتجاجوں کا بھی حصہ بنتی ہے۔اس طرح شاعری محض ادبی اظہار نہیں رہتی بلکہ ایک سیاسی عمل بن جاتی ہے۔

عصری شاعری: نئے سماجی چیلنجز

اکیسویں صدی کی اردو شاعری نے نئے سماجی چیلنجز کو اپنا موضوع بنایا ہے۔عباس تابش (1955-)،احمد فراز (1931-2008)،اور نئے نسل کے شعرا نے عالمگیریت، ماحولیاتی بحران، صارفیت، اور ڈیجیٹل دور کے سماجی اثرات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔عصری شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ یہ نہ صرف مقامی مسائل بلکہ عالمی مسائل کو بھی اپنے دائرے میں لاتی ہے۔

احمد فراز کی نظم " کٹھن ہے راہ گزر تھوڑی دور ساتھ چلو" میں موجودہ دور کی پیچیدگیوں کا اظہار ملتا ہے۔فراز نے اس نظم میں جدید زندگی کے دباؤ، سماجی رشتوں کی کمزوری، اور فرد کی تنہائی کو موضوع بنایا ہے:

کٹھن ہے راہ گزر تھوڑی دور ساتھ چلو
بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دور ساتھ چلو
تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ چلو

فراز کے ان اشعار میں جدید دور کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا اظہار ہے۔شاعر چاہتا ہے کہ یہ مشکل دور گزر جائے اور کوئی آسان راہ نکل آئے۔ یہ محض ذاتی آرزو نہیں بلکہ ایک سماجی خواہش ہے جو ہر اس شخص کی نمائندگی کرتی ہے جو جدید زندگی کے دباؤ میں گھرا ہوا ہے۔

عباس تابش کی شاعری میں شہری زندگی کی پیچیدگیاں، رشتوں کی ٹوٹن، اور وجودی تنہائی جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔تابش نے اپنی شاعری میں جدید شہر کے انسان کی نفسیاتی کیفیتوں کو بہت گہرائی سے پیش کیا ہے۔ان کی شاعری میں شہر محض جگہوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو انسان کو اندر سے تبدیل کر دیتی ہے۔

عصری شاعری کا ایک اہم موضوع ماحولیاتی بحران بھی ہے۔ نئے نسل کے شعرا نے صنعتی ترقی کے ماحول پر پڑنے والے منفی اثرات، جنگلات کی کٹائی، اور موسمیاتی تبدیلیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔یہ شاعری ایک طرح سے انسانی تہذیب کے مستقبل کے بارے میں فکرمندی کا اظہار ہے۔

عصری شاعری میں ڈیجیٹل دور کے سماجی اثرات بھی موضوع بن رہے ہیں۔سوشل میڈیا، ورچوئل رشتے، اور ڈیجیٹل تنہائی جیسے موضوعات نئے نسل کے شعرا کی شاعری میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ شاعری اس نئے دور کی عکاسی کرتی ہے جہاں ٹیکنالوجی نے نہ صرف ہماری زندگی کے طریقوں کو بدلا ہے بلکہ ہمارے جذبات اور رشتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔

عصری شاعری کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ثقافتی شناخت کے بحران سے بھی دوچار ہے۔ عالمگیریت کے دور میں جب ثقافتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں، تو شعرا اپنی مقامی شناخت کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کشمکش عصری شاعری کا اہم موضوع ہے۔

مقالے کے آخر میں میں صرف یہ کہ سکتا ہوں کے اردو شاعری میں سماجی شعور کا سفر ایک طویل اور پیچیدہ عمل رہا ہے جو مختلف ادوار میں مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔اس سفر کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں الطاف حسین حالی سے ہوا جنہوں نے پہلی بار اردو شاعری کو سماجی مسائل سے جوڑا۔حالی نے "ادب برائے زندگی" کا نظریہ پیش کیا جو بعد میں آنے والی تمام ادبی تحریکوں کے لیے بنیاد کا کام کرتا رہا۔

علامہ اقبال نے اس سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے شاعری کو فلسفیانہ گہرائی اور انقلابی جہت عطا کی۔اقبال کی شاعری میں فرد کی ذاتی تربیت اور سماجی تبدیلی کا

ISBN: 978-93-344-4743-9

گہرا تعلق ہے۔انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام اور استعماری قوتوں کے خلاف آواز بلند کی اور ایک نئے سماج کے خواب کو شاعری کا حصہ بنایا۔

ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کو براہ راست سماجی عمل سے جوڑ دیا۔اس تحریک کے شعرا نے طبقاتی استحصال، معاشی ناانصافی اور سماجی جبر کے خلاف آواز بلند کی۔فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی جیسے شعرا نے سماجی حقیقت نگاری کو رومانویت سے ہم آہنگ کر کے اردو شاعری کو ایک وسیع عوامی بنیاد فراہم کی۔

جدیدیت کی تحریک نے ترقی پسندی کے اجتماعی بیانیے کے مقابلے میں انفرادی وجود، نفسیاتی پیچیدگی اور عصری بیگانگی کو موضوع بنایا۔ن م راشد اور دیگر جدید شعرا نے جدید زندگی کے پیچیدہ تجربات کو ادبی اظہار دیا اور اردو شاعری کی ہیئت میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔

نسائی شاعری نے عورت کی ایک نئی شناخت تشکیل دی۔کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر جیسی شاعرات نے پدرسری نظام، سماجی امتیاز اور صنفی تشدد کے خلاف آواز بلند کی اور عورت کو محض صنف کے بجائے ایک مکمل انسان کے طور پر پیش کیا۔

مزاحمتی شاعری نے سیاسی جبر اور آمریت کے خلاف عوامی آواز بننے کا فریضہ سرانجام دیا۔حبیب جالب اور احمد فراز جیسے شعرا نے اپنی شاعری کو عوامی احتجاج کا آلہ کار بنایا اور سماجی انصاف کے لیے جدوجہد کو شاعری کا حصہ بنایا۔

عصری شاعری نئے عالمی چیلنجز جیسے عالمگیریت، ماحولیاتی بحران، صارفیت اور ڈیجیٹل دور کے سماجی اثرات سے نمٹ رہی ہے۔ یہ شاعری نہ صرف مقامی مسائل بلکہ عالمی مسائل کو بھی اپنے دائرے میں لاتی ہے اور ثقافتی شناخت کے بحران سے بھی دوچار ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں سماجی شعور کا ارتقا ایک مسلسل اور متحرک عمل رہا ہے۔ ہر دور کے شعرا نے اپنے عہد کے سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور ان کے حل کے لیے فکری بنیادیں فراہم کیں۔ یہ شاعری نہ صرف سماج کی عکاسی کرتی ہے بلکہ سماجی تبدیلی کا آلہ کار بھی بنتی ہے۔اردو شاعری کا یہ سماجی سفر جاری ہے اور آنے والے وقت میں نئے سماجی چیلنجز اس سفر کو نئی سمتوں کی طرف لے جائیں گے۔

حوالہ جات (Bibliography)

اولین ماخذ (Primary Sources):

مسدسِ حالی۔الطاف حسین حالی۔مطبع مفید عام۔(1886ء) دہلی

مقدمہ شعر و شاعری۔الطاف حسین حالی۔مجلس ترقی ادب۔(1893ء) لاہور

نقشِ فریادی۔فیض احمد فیض۔آزاد کتاب گھر۔(1941ء)۔دہلی

بالِ جبریل۔محمد اقبال۔شیخ غلام علی اینڈ سنز۔(1936ء)۔لاہور

عشق آباد۔عباس تابش۔الحمد پبلیکیشنز۔(2010ء) لاہور

دستور۔حبیب جالب۔مکتبہ عالیہ۔(1962ء) لاہور

تلخیاں۔ساحر لدھیانوی۔اسٹار پبلیکیشنز۔(1945ء)۔دہلی

ماورا۔ن م راشد۔سنگ میل پبلیکیشنز۔(1940ء)۔ لاہور

بدن دریدہ۔فہمیدہ ریاض۔سنگ میل پبلیکیشنز۔(1990ء)۔لاہور

خوشبو۔پروین شاکر۔سنگ میل پبلیکیشنز۔(1976ء)۔۔لاہور

نایافت۔ احمد فراز۔مقتدرہ قومی زبان۔(2006ء)۔اسلام آباد

لبِ گویا۔کشور ناہید۔سنگ میل پبلیکیشنز۔(1987ء)۔لاہور

ثانوی ماخذ (Secondary Sources):

ترقی پسند ادبی تحریک، علی سردار جعفری۔فضلی سنز۔(1988ء)۔کراچی

اردو شاعری میں سماجی شعور۔افتخار حسین۔(2012ء)۔:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
جدید اردو شاعری، شمیم حنفی۔مکتبہ جامعہ۔(1985ء)۔۔دہلی
نسائی شاعری:ایک مطالعہ۔ظہور احمد راہی۔(2010ء)۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔
جدیدیت اور اردو شاعری۔سید تقی عابدی رضوی۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔(2009ء)۔کراچی
اردو شاعری کا ارتقا۔بشیر سیّد عبداللہ۔عروج پبلیکیشنز۔(2005ء)۔لاہور
اردو میں مزاحمتی ادب۔عابدی سیدہ جعفری۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔(2018ء)۔کراچی
ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری۔وارث علوی۔بزمِ اردو۔(1978ء)۔۔ممبئی
ادبی تنقید اور اسلوب۔گوپی چند نارنگ۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔(1989ء)۔دہلی
عصری اردو شاعری:رجحانات اور مسائل، وحید خورشید۔پیپرس پبلیکیشنز۔(2015ء)۔لاہور

☆☆☆

علی سردار جعفری کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات

ڈاکٹر رضوانہ رہبر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، چھترپتی سمبھاجی نگر

اردو ادب کی ترقی پسند تحریک نے بیسویں صدی میں جس فکری اور سماجی بیداری کو جنم دیا، علی سردار جعفری اس کے نہایت توانا اور فعال نمائندہ شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کو محض جمالیاتی تسکین کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے سماج کی تبدیلی، انسان کی آزادی اور انصاف کے قیام کا وسیلہ بنایا۔ جعفری کی شاعری میں ترقی پسند فکر نہ صرف نظریاتی سطح پر موجود ہے بلکہ فنی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں علی سردار جعفری کے ترقی پسند رجحانات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کا بنیادی وصف ترقی پسند فکر ہے۔ وہ ادب کو سماجی تبدیلی کا مؤثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز 1936ء میں ہوا جس کا مقصد ادب کو سماجی حقیقتوں سے جوڑنا تھا۔ اس تحریک نے ادب میں طبقاتی شعور، سماجی انصاف، سامراج دشمنی اور انسان دوستی کو مرکزی حیثیت دی۔ علی سردار جعفری اس تحریک کے نظریاتی کارکن بھی تھے اور تخلیقی نمائندہ بھی۔ ان کی شاعری اس بات کا ثبوت ہے کہ ترقی پسند ادب محض نعرہ نہیں بلکہ ایک مکمل فکری نظام ہے۔

جعفری کی فکری تربیت میں مارکسی فلسفہ، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد، عالمی سیاسی حالات اور ذاتی مشاہدات کا گہرا اثر شامل ہے۔ انہوں نے سماج کو قریب سے دیکھا اور اس کے تضادات کو شاعری میں سمویا۔ ان کی فکر میں انقلاب کا تصور محض سیاسی تبدیلی تک محدود نہیں بلکہ سماجی، معاشی اور اخلاقی تبدیلی کا ہمہ گیر تصور ہے۔ علی سردار جعفری کی ترقی پسند شاعری میں طبقاتی شعور نہایت نمایاں ہے۔ وہ سماج کو محض افراد کے مجموعے کے طور پر نہیں بلکہ طبقاتی کشمکش کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام انسانی قدروں کو پامال کرتا ہے اور محنت کش طبقے کو مسلسل استحصال کا نشانہ بناتا ہے۔

شعری اقتباس:

یہ سچ ہے کہ محلوں میں چراغاں ہی چراغاں ہے
مگر جھونپڑوں میں اب تک روشنی کا قحط طاری ہے

تجزیہ: اس شعر میں "محل" اور "جھونپڑی" دو واضح طبقاتی علامتیں ہیں۔ شاعر سرمایہ دار اور محنت کش طبقے کے درمیان خلیج کو نمایاں کرتا ہے۔ روشنی یہاں خوشحالی اور سہولت کی علامت ہے جو صرف بالادست طبقے تک محدود ہے۔ یہی طبقاتی تضاد ترقی پسند شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔

جعفری کی شاعری میں انقلابی شعور محض جذباتی ابال نہیں بلکہ ایک منظم فکری موقف ہے۔ وہ ظلم کو تاریخ کا حادثہ نہیں بلکہ انسانی ساختہ نظام کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف مزاحمت کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

شعری اقتباس:

ابھی تو یہ زمیں سسکی ہے، انگڑائی نہیں لی ہے
ابھی انصاف کے سورج نے انگڑائی نہیں لی ہے

تجزیہ: یہاں "زمین" مظلوم عوام کی علامت ہے اور "انصاف کا سورج" انقلاب اور سماجی تبدیلی کی امید۔ شاعر کا یقین ہے کہ جدوجہد ابھی مکمل نہیں ہوئی اور مستقبل میں ایک بڑی تبدیلی ناگزیر ہے۔ یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے انقلابی نظریے کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ علی سردار جعفری کی ترقی پسند شاعری قومی سرحدوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ ایک عالمی انسانی شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ سامراج کو محض سیاسی تسلط نہیں بلکہ تہذیبی اور معاشی استحصال کی علامت سمجھتے ہیں۔

شعری اقتباس:

 ISBN: 978-93-344-4743-9

ہر ایک خطۂ ارضی پہ ہے انسان کا دعویٰ
یہ جنگ، یہ نفرت، یہ سرحدیں مجھے دے دو

تجزیہ: ان اشعار میں شاعر انسان کی عالمگیریت پر زور دیتا ہے۔ سرحدیں اور جنگیں سامراجی مفادات کی پیداوار ہیں جو انسان کو انسان سے جدا کرتی ہیں۔ جعفری یہاں عالمی امن اور انسانی وحدت کا پیغام دیتے ہیں، جو ترقی پسند فکر کا اہم جزو ہے۔ علی سردار جعفری کی ترقی پسند فکر کی اساس انسان دوستی ہے۔ وہ اشتراکیت کو محض سیاسی نظریہ نہیں بلکہ انسانی مساوات اور اجتماعی فلاح کا ضامن سمجھتے ہیں۔

شعری اقتباس:

مجھے انسان کے ہاتھوں پہ یقین ہے اب بھی
یہی ہاتھ کبھی تاج بھی، تخت بھی بدلیں گے

تجزیہ: یہ شعر شاعر کے انسانی ارادے اور اجتماعی طاقت پر اعتماد کا اظہار ہے۔ "ہاتھ" محنت کش طبقے کی علامت ہے جو تاریخ کا دھارا بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی اشتراکی تصور ترقی پسند ادب کی روح ہے۔

علی سردار جعفری کے یہاں رومان انقلاب سے الگ نہیں بلکہ اس کا فکری تسلسل ہے۔ محبت، امید اور خواب ان کی شاعری میں انقلابی قوت بن کر سامنے آتے ہیں۔

شعری اقتباس:

اگر محبت نہ ہوتی تو یہ دنیا نہ بدلتی
یہی جذبہ ہے جو تلوار کو موم بناتا ہے

تجزیہ: اس شعر میں محبت کو تبدیلی کی اصل قوت قرار دیا گیا ہے۔ جعفری کے نزدیک انقلاب محض نفرت سے نہیں بلکہ انسان دوستی اور محبت سے جنم لیتا ہے۔ یہ پہلو ان کی شاعری کو یک رخی نعروں سے محفوظ رکھتا ہے۔

علی سردار جعفری نے ترقی پسند فکر کو محض براہِ راست بیان نہیں کیا بلکہ علامت، استعارہ اور تمثیل کے ذریعے پیش کیا۔ ان کا اسلوب خطیبانہ ہونے کے باوجود فنی حسن سے خالی نہیں۔ نظم اور غزل دونوں اصناف میں انہوں نے ترقی پسند شاعری کو وقار عطا کیا۔

آزادی کے بعد علی سردار جعفری کی شاعری میں مایوسی کے بجائے ایک گہرا تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ سیاسی آزادی کے باوجود سماجی اور معاشی غلامی برقرار ہے۔ ان کی ترقی پسند فکر آزادی کے بعد کے تضادات کو بے نقاب کرتی ہے۔

شعری اقتباس:

وہ آزادی کہ جس کا خواب دیکھا تھا فقیروں نے
وہ آئی بھی تو دامن میں فقط زنجیر لے آئی

تجزیہ: یہ شعر آزادی کے بعد کے ہندوستانی سماج پر ایک گہرا طنز ہے۔ "زنجیر" اس بات کی علامت ہے کہ استحصال کی صورتیں بدل گئیں مگر ختم نہ ہوئیں۔ جعفری یہاں ترقی پسند فکر کے تحت آزادی کے نامکمل ایجنڈے کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک میں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی جیسے شعرا شامل ہیں، مگر علی سردار جعفری کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے یہاں انقلابی شعور کے ساتھ تہذیبی وقار اور کلاسیکی شعری روایت بھی ملتی ہے۔

شعری اقتباس (جعفری):

میں اس چراغ کو طوفان سے بچاؤں گا
جو روشنی کا پیامبر ہے تیرگی کے لیے

ISBN: 978-93-344-4743-9

تقابلی تجزیہ:

فیض کے یہاں انقلابی فکر زیادہ ترنرم اور علامتی انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے، جب کہ جعفری کا لہجہ نسبتاً براہِ راست اور خطیبانہ ہے۔مخدوم کے مقابلے میں جعفری کی شاعری میں تہذیبی شعور زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔اس طرح جعفری ترقی پسند تحریک میں ایک منفرد شناخت قائم کرتے ہیں۔

تنقیدی آرا علی سردار جعفری کی شاعری پر ناقدین نے مختلف زاویوں سے اظہارِ خیال کیا ہے۔بعض ناقدین نے ان پر نظریاتی شدت کا الزام لگایا، تاہم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ جعفری نے نظریے اور فن کے درمیان توازن قائم رکھا۔

شعری اقتباس:

میں حرفِ سچ کو چھپاؤں یہ مجھ سے ہو نہ سکا
یہ میرا فن بھی ہے، میرا ضمیر بھی ہے یہی

تنقیدی تجزیہ:

یہ شعر خود جعفری کے ادبی رویے کی وضاحت کرتا ہے۔ان کے نزدیک سچ کا اظہار شاعر کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔احتشام حسین اور آلِ احمد سرور جیسے ناقدین نے اس وصف کو جعفری کی شاعری کی اصل قوت قرار دیا ہے۔یہی وصف انہیں محض نظریاتی شاعر کے خانے میں محدود نہیں ہونے دیتا۔

علی سردار جعفری اردو ادب کے ممتاز ترقی پسند شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں سماجی شعور، انقلابی فکر اور انسان دوستی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ذیل میں علی سردار جعفری کے اہم شعری رجحانات تحقیقی و تنقیدی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔علی سردار جعفری کے ترقی پسند رجحانات اردو ادب کی ایک درخشاں روایت کی نمائندگی کرتے ہیں۔انہوں نے شاعری کو سماجی تبدیلی کا ذریعہ بنایا اور ادب کو انسان کے قریب کیا۔ان کی شاعری آج بھی ظلم کے خلاف آواز اور انسان کے حق میں دلیل بن کر زندہ ہے۔

حوالہ جات

اوّل: بنیادی متون

جعفری، علی سردار۔کلیاتِ جعفری۔نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) مختلف ایڈیشنز۔(اشعار کے حوالہ جات متعلقہ نظم/غزل اور صفحہ نمبر کے ساتھ)

جعفری، علی سردار۔نئی دنیا کو سلام۔نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، ہندوستان۔

جعفری، علی سردار۔لہو پکارے گا۔بمبئی: مکتبہ جامعہ، سنِ اشاعت مختلف۔

دوم: تنقیدی و تحقیقی کتب

حسین، احتشام۔اردو ادب اور ترقی پسند تحریک۔نئی دہلی: مکتبہ جامعہ۔

حسن، محمد۔ترقی پسند ادب کی روایت۔علی گڑھ: تعلیمی کتب خانہ۔

سرور، آلِ احمد۔تنقیدی مضامین۔لکھنؤ: نشاۃ ثانیہ۔

مجید، سلیم احمد۔اردو شاعری کی سماجی جہات۔کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

سوم: مقالات و جرائد

ترقی پسند ادب نمبر، ادبیات (خصوصی شمارہ)۔نئی دہلی۔

☆☆☆

ISBN: 978-93-344-4743-9

Changing trends in Urdu poetry After Independence

Edited By

Professor. Kirtimalini Vithalrao Jawale

Dr. Shaikh Asgar Akbar